یادوں کے چراغ

جلد دوم

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

جمع وترتیب وحواشی

سید سحبان ثاقب ندوی

ناشر

مکتبۃ الشباب العلمیۃ، ندوہ روڈ، لکھنؤ

جملہ حقوق محفوظ

باراول

سنہ ۱۴۴۰ھ   سنہ ۲۰۱۹ء

نام کتاب: .... یادوں کے چراغ

صفحات: ۴۱۶

تعداد اشاعت: ۱۱۰۰

قیمت: .... SHABAB Educational Rs. 350/-

ناشر

مکتبۃ الشباب العلمیۃ، ندوہ روڈ، لکھنؤ

فہرست

عرض ناشر	۹
عالم اسلام کی مقتدر شخصیات	۱۱
شیخ احمد محمد جمال (عمری مکی)	۱۲
شیخ احمد عبدالعزیز آل مبارک	۱۶
شیخ احمد حسن باقوری مصری	۱۸
پروفیسر اسماعیل راجی فاروقی	۲۰
علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی	۲۳
ڈاکٹر حمید اللہ فرانس	۲۵
شیخ حسن بن عبداللہ آل الشیخ	۲۷
شیخ حسن الہضیبی	۳۰
مولانا سید محمد یوسف بنوری	۳۲
شیخ صالح حصین رحمۃ اللہ علیہ	۳۴
استاذ صالح العشماوی	۳۶
معالی الشیخ محمد صالح القزاز	۳۹
شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری	۴۱
شیخ عبدالبدیع السید صقر	۴۴
استاذ عبدالعزیز الرفاعی	۴۷
کلید بردار کعبہ شیخ عبدالعزیز شیبیؒ	۴۹

شیخ عبدالقادر نورولی	۵۳
قاری عبدالماجد ذاکرؒ	۵۵
ڈاکٹر عبدالمنعم النمر مصری	۵۶
استاذ علی حسن فدعق	۵۹
شیخ علی طنطاوی	۶۱
محدث حرم شیخ علوی بن عباس المالکی	۶۳
اسلامی مفکر وشاعر عمر بہاء الدین الامیری	۶۶
شیخ عمر تلمسانی	۶۸
حضرت مولانا حکیم محمد اختر رحمۃ اللہ علیہ	۷۰
ڈاکٹر محمد عبدہ یمانیؒ	۷۳
شیخ محمد علی دولۃ رحمۃ اللہ علیہ	۷۴
امام حرم علامہ محمد بن عبداللہ السبیّل رحمہ اللہ	۷۸
استاذ محمد المبارک	۷۳
شیخ محمد محمود الصواف عراقی	۸۵
شیخ محمد ولی نورولی مرحوم	۸۸
شیخ نادر عبدالعزیز النوری	۹۴
شیخ ناصر الدین الالبانی	۹۶
پروفیسر نجم الدین اربکانؒ	۹۹
ہندوستان کے مشاہیر علماء ودانشوران	۱۰۳
حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ	۱۰۴
حضرت مولانا اشرف علی باقوی	۱۰۸
مولانا اطہر حسین مظاہری	۱۱۰

افتخار فریدی	۱۱۲
صوفی اقبال صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۱۱۴
حضرت قاری امیر حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۱۱۷
صوفی انعام اللہ لکھنوی	۱۲۱
مولانا تقی امینی	۱۲۳
مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی محدث	۱۲۵
مولانا ریاض الرحمٰن رشادی مرحوم	۱۲۹
مولانا محمد زبیر الحسن کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ	۱۳۱
مولانا مفتی سعید احمد اجراڑوی	۱۳۶
مولانا سعید احمد اکبرآبادی	۱۳۸
سید حامد آئی اے ایس	۱۴۰
مولانا سید شوکت علی نظیری رحمۃ اللہ علیہ	۱۴۲
مولانا شاہ سید صبغت اللہ بختیاری رحمۃ اللہ علیہ	۱۴۵
حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ	۱۴۸
حضرت مولانا سید نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ	۱۵۱
مولانا سید نفیس اکبر حسینی ہنسوی	۱۵۷
حکیم صیانت اللہ صدیقیؒ	۱۵۹
مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی مرحوم	۱۶۱
قاضی عبدالحمید اندوری	۱۶۴
صوفی عبدالرحمٰن محمد عمر ممبئیؒ	۱۶۶
ایڈوکیٹ عبدالرحیم قریشی حیدرآبادی مرحوم	۱۷۲
حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ	۱۷۵
حضرت مولانا شاہ مفتی عبدالقیوم رائے پوری	۱۸۰

مولانا مفتی عبداللہ پھولپوری	۱۸۴
مولانا عبداللہ کاپودروی	۱۸۷
مولانا عبدالماجد دریابادیؒ	۱۹۱
عشرت علی صدیقی مرحوم	۱۹۵
مولانا عمار احمد الہ آبادی	۱۹۹
الحاج غلام محمد بھائی پٹنی مرحوم	۲۰۲
ماسٹر کلیم اللہ خان الہ آبادی	۲۰۷
مولانا محمد سالم قاسمیؒ	۲۱۰
حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد رحمۃ اللہ علیہ	۲۱۶
سیدالملت حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ	۲۲۰
حضرت مولانا شاہ قاری محمد مبین الہ آبادی	۲۲۴
مولانا قاری محمد قاسم انصاری بھوپالیؒ	۲۲۶
حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ	۲۲۹
مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی	۲۳۷
مولانا محمد عاشق الٰہی (برنی) بلندشہری	۲۴۰
شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری	۲۴۳
مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی	۲۵۶
مولانا مخدوم حسین صاحب	۲۶۰
مولانا معراج الحق قاسمی	۲۶۲
ڈاکٹر ملپا علی مرحوم	۲۶۴
مولانا نسیم احمد فریدی	۲۶۶
وکیل احمد وکیل انصاری جون پوری	۲۶۹

ندوۃ العلماء اساتذہ، احباب، رفقاء، اراکین انتظامیہ	۲۷۴
مولوی اسحاق پٹیل ندوی مرحوم	۲۷۵
ڈاکٹر اسماعیل مدراسی ندوی	۲۷۷
مولوی امین الدین شجاع الدین	۲۷۸
مولوی برجیس احمد ندوی دربھنگوی	۲۸۱
مولانا خواجہ بہاء الدین اکرمی ندوی	۲۸۲
مولانا سلمان خان ندویؒ	۲۸۴
شاہ سید تسلی حسن مرحوم رحمۃ اللہ علیہ	۲۸۶
ڈاکٹر سید ابراہیم ندوی کی وفات	۲۸۸
مولوی سید سعید حسن ندوی بستوی	۲۹۰
علامہ سید سلیمان ندویؒ	۲۹۶
مکتوب سلیمانی	۳۱۲
جواب اشرف	۳۱۳
حضرت تھانوی سے پہلی ملاقات	۳۱۵
مولانا شاہ سید شرف عالم ندوی بھاگلپوری	۳۲۰
حضرت مولانا سید مظفر حسین شاہ ندوی کشمیری	۳۲۲
قاری سید ودود الحی ندوی	۳۲۳
مولانا شاہ شبیر عطا سلونی ندوی	۳۲۵
مولانا ضیاء الحسن اعظمی ندوی	۳۲۸
مولانا طیب عثمانی ندوی مرحوم	۳۳۰
مولوی عبد الباری ندوی	۳۳۳
مولانا عبد الرشید اعظمی ندوی	۳۳۷

مولوی عبدالسمیع جعفری ندوی رحمہ اللہ	۳۳۹
مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ	۳۴۲
مولانا محمد ابراہیم ندویؒ	۳۴۶
حضرت مولانا محمد اویس نگرامی ندوی رحمۃ اللہ علیہ	۳۴۸
مولوی محمد غزالی ندوی	۳۵۲
ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی مرحوم	۳۵۵
مولانا محمد لقمان خاں ندوی ازہری	۳۵۹
شیخ مستنصر اللہ لکھنوی	۳۶۱
جناب نصار رفیع صاحب مرحوم	۳۶۳
مولوی وجیہ الدین ندوی مرحوم	۳۶۵
خانوادہ علم اللٰہی	۳۶۶
استاذ سید احمد الحسنی	۳۶۷
مولوی سید احمد علی حسنی ندوی ٹونکی	۳۷۰
سید ابراہیم حسنی مرحوم	۳۷۴
پھوپی صاحبہ سیدہ بتول حسنی	۳۷۷
عزیزی سید حسن حسنی	۳۸۴
اہلیہ مرحومہ محمد میاں مرحوم	۳۸۶
مولانا سید طلحہ حسنی ٹونکی	۳۸۸
حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی	۳۵۲
عزیزی مولوی عبداللہ حسنی ندوی	۴۰۱
مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ	۴۰۷
برادر عزیز سید مصباح النبی حسنیؒ	۴۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

الحمد لله وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد!

پیش نظر کتاب ''یادوں کے چراغ'' استاد مخدوم و معظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کی ان شخصیات کے متعلق تأثرات و مضامین کا مجموعہ ہے جن سے ان کا کسی ناحیہ سے تعلق رہا تھا اور ان کی وفات پر عربی یا اردو میں مضمون لکھا تھا۔ عربی مضامین ''البعث الاسلامی'' اور ''الرائد'' میں چھپے تھے جن میں سے بعض کا ترجمہ اس کتاب میں شامل ہے۔ اردو مضامین ''تعمیر حیات'' اور ''ماہنامہ رضوان'' لکھنؤ سے لئے گئے، اور کچھ وہ مضامین بھی ہیں جو الگ سے اس کتاب کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ مضامین تفصیلی نہیں ہیں لیکن معلوماتی اور شخصیت کی خصوصیات و کمالات کا آئینہ دار ہیں۔ اس کا پہلا حصہ عزیز گرامی مولوی مستقیم محتشم ندوی بھٹکلی کی فکر و کوشش سے سامنے آیا تھا اور دوسرے حصہ کی ترتیب کا شرف انہی کے رفیق درس عزیز گرامی مولوی سید سحبان ثاقب ندوی کے نصیب میں تھا۔ مؤخر الذکر کو صاحبِ مضامین کی رفاقت سفر و حضر و معاونت علمی کی سعادت بھی حاصل ہے اور ان دونوں نے رفیق گرامی مولانا سید محمود حسنی ندوی کی زیر نگرانی اس کی تکمیل کی، کتاب کی ترتیب سے لے کر زیور طبع سے آراستہ ہونے تک ہر ہر مرحلہ میں ان کا تعاون رہا ہے۔ اور اشاعت کا مرحلہ برادرم مولوی محمد ریان ندوی کی فکر و کاوش سے

آسان ہوا اور برادر مکرم حامد صاحب نے تزئین وسٹنگ میں حصہ لیا۔ مولوی سید سحبان ثاقب ندوی نے توضیحی حواشی کا جو کام کیا وہ بہت ہی لائق قدر ہے۔ اس طرح شخصیات پر تأثرات کی کتابوں میں وقیع صورت میں یہ کام سامنے ہے۔ یقیناً اس کے بعد ناظرین باتمکین اس کے تیسرے حصہ کے منتظر ومشاق رہیں گے، اور ہماری کوشش بھی ہوگی کہ انہیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے اور ان کا شوق جلدی پورا ہو۔ پہلے حصہ میں پروفیسر وصی احمد صدیقی لکھنؤ (خواہر زادہ شہرۂ آفاق ادیب رشید احمد صدیقی مرحوم) کا مقدمہ تھا۔ اس لئے پیش نظر حصہ میں کسی نئے مقدمہ وتقریظ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اور مقدمہ نگار خود اس حصہ کی زینت ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سبھی حضرات کی بال بال مغفرت فرمائے جن کا حال قارئین ملاحظہ فرمائیں گے اور ان سبھی کو بہترین جزاء عطا فرمائے جن کا اس کتاب کی ترتیب و اشاعت میں حصہ رہا۔ خاص طور پر صاحب مضامین مرشد گرامی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم جنہوں نے اس کی اشاعت کا حق بطور شفقت عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان کے مراتب بلند فرمائے اور ان کے افادہ کو چاردانگ عالم میں عام کرے۔ اور شرفِ قبولیت سے نوازے۔ واللہ ولی التوفیق۔

سید ہاشم نظام الدین ندوی

جمعہ ۱۹/ ذی الحجہ ۱۴۳۹ھ

مکتبۃ الشباب العلمیۃ، ندوہ روڈ، لکھنؤ

عالم اسلام کی مقتدر شخصیات

شیخ احمد محمد جمال (عمری مکی)

۱۳۴۳ھ ۱۹۲۵ء تا ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۳ء

مکہ معظّمہ کی مؤقر علمی وادبی شخصیت شیخ احمد محمد جمال عرفہ کے دن ۹/ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ ۳۰/مئی ۱۹۹۳ء کو وفات پاگئے، وہ روزے سے تھے اور قارہ کے سفر پر تھے جہاں سے ان کی نعش خادم الحرمین الشریفین کی خصوصی ہدایت پر ان کے وطن مکہ معظّمہ لائی گئی اور عیدالاضحیٰ کی نماز کے بعد ان کی نماز جنازہ حرم مکی میں بڑی نمناک آنکھوں سے ادا کی گئی، ان کی عمر ستر سال تھی، ان کی وفات پر مملکت میں شاہی خاندان کے افراد اور ارکان حکومت سے لے کر خواص وعوام سبھی نے جس دکھ کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی ایک غیر معمولی شخصیت سامنے آئی ہے وہ مکہ مکرمہ ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان مکہ معظّمہ کا علم وفضل کا معروف عمری خاندان رہا ہے، جس کا انتساب سیدنا عمر بن الخطابؓ سے ہے، ان کے اجداد میں شیخ محمد جمال اور ان کے درمیان سات واسطے ہیں، احمد بن محمد بن صالح بن عبدالقادر بن صالح بن عبدالرحمٰن بن عثمان بن عارف بن محمد جمال، یہ پورا خاندانی سلسلہ اصحاب درس وافادہ رہا ہے، شیخ احمد محمد جمال کے پردادا شیخ عبدالرحمٰن (متوفی ۱۲۴۹ھ) شریف مکہ کے زمانہ میں جدہ کے قاضی تھے، اوران کے دادا شیخ عارف محمد جمال (متوفی ۱۱۶۳ھ) مسجد حرام مکہ مکرمہ میں قرآن وحدیث اور تفسیر وفقہ کا درس دیتے تھے، البتہ ان کے والد شیخ محمد بن صالح مکہ کے ایک بڑے اور معروف تاجر تھے اور ان کا مسکن

شارع مسعی پر بیت اللہ شریف کے سامنے تھا، وہیں یہ اور ان کے دوسرے بھائی رہتے تھے، مکہ مکرمہ کے مدرسہ عزیزیہ ابتدائیہ میں تعلیم حاصل کی پھر المعہد العلمی السعودی سے ۱۳۵۹ھ میں فراغت پائی، اس کے بعد علماء حرم مکی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا جن میں خصوصیت سے علامہ سید علوی مالکی، سید احمد عربی، شیخ عبدالرحمٰن صبّاغ، استاذ عبدالکریم جہیمان اور شیخ ابراہیم فطانی کے نام قابل ذکر ہیں۔

تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد انھیں کام کرنے کے اہم مواقع ملے، انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز رئاسۃ القضاۃ مکہ مکرمہ سے ۱۳۵۹ھ میں کیا، پھر وہ محکمہ شرعیہ مکہ مکرمہ کے کتابت عدل کے شعبہ سے وابستہ ہوگئے، پھر وزارت داخلیہ میں قسم الثقافۃ والتعلیم کے مساعد الرئیس کے طور پر کام کیا، یہ اس وقت کی بات ہے جب وزارت المعارف کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا، پھر ان کی حیثیت مملکت میں اور بلند خیال کی جانے لگی، اور ۱۳۷۵ھ (۱۹۵۴ء) میں ان کو مجلس شوریٰ کی رکنیت حاصل ہوگئی، اس کے ساتھ وہ تعلیم کے شعبہ سے بھی جڑے رہے، اور اسلامی ثقافت کے موضوع کو اختیار کرکے مملکت کی دو یونیورسٹیوں جامعۃ الملک عبدالعزیز جدہ اور جامعۃ ام القریٰ مکہ مکرمہ کی خدمت کرتے رہے، دوسری طرف صحافت کے ذریعہ بھی ملک اور قوم کی انہوں نے خدمت کی اور اپنے بڑے بھائی استاذ صالح محمد جمال کے ساتھ اخبارات میں بحیثیت مدیر کے کام کیا، اس سے مملکت میں ان کی اچھی پہچان بن گئی۔

فکر اسلامی اور دعوت اسلامی کے میدان میں بھی ان کی خدمات ومساعی متنوع حیثیت سے سامنے آئیں، اخبارات وجرائد کے ذریعہ اور خطابات وتوجیہات کے ذریعہ اور اسفار کے ذریعہ جس میں کئی اہم سفر رابطۂ عالم اسلامی کے وفد کی شکل میں ہوئے اور بعض میں وہ وفد کے سربراہ رہے، اور بعض میں بحیثیت رکن کے وہ وفد کے ساتھ دوسرے ملک گئے اور اس میں انہوں نے مسلمانوں کے مسائل کے تعلق سے جس حق گوئی اور جرأت اور فہم وبصیرت کا ثبوت پیش کیا اس سے بھی متاثر ہوئے۔

رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے انہوں نے ایک اہم دعوتی دورہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سربراہی میں ایک وفد کے ساتھ کیا، جس میں وہ افغانستان، ایران، عراق، لبنان، شام وغیرہ گئے تھے، جس کے ایک حصہ میں حضرت مولانا کے مرافق شخصی کے طور پر مولانا عبداللہ عباس ندوی مرحوم اور دوسرے حصہ میں مجھے ساتھ رہنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، حضرت مولانا رحمۃ اللہ نے اپنے سفرنامہ میں جو "من نهر كابل الى نهر يرموك" (دریائے کابل سے دریائے یرموک تک) کے نام سے شائع ہوا ہے، شیخ احمد محمد جمال کی بعض خصوصیات اور ان کے بعض خطابات کی طرف اشارہ کیا ہے، اور خاص طور پر ان کی کتاب "مكانك تحدى" کی تعریف کی ہے، جو عورتوں سے متعلق ان کی لاجواب تصنیف ہے، اور مولانا نے لکھا ہے کہ وہ اس موضوع کے ممتاز ماہرین میں سے ہیں، اسی طرح قرآن مجید پر ان کی نظر کی بھی تعریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ استاد احمد محمد جمال قرآنی آیات کے استحضار و اقتباس میں امتیاز رکھتے ہیں، اور بہت سی احادیث کے متون ان کو زبانی یاد ہیں، اسی طرح ان کے مجاہدانہ حوصلہ و جذبہ کی طرف بھی مولانا نے اشارہ کیا ہے، چونکہ مجھے بھی عراق، لبنان، شام میں ساتھ رہنے کو ملا اس لیے میں بھی ان کی خصوصیات سے متاثر ہوا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو بڑی محبت اور گہرا تعلق تھا جو ان کے حجاز کے شروع کے سفروں سے قائم ہو گیا تھا، جس میں فکر و مذاق میں وحدت کو بڑا دخل تھا، جو قرآن مجید، تاریخ اسلامی، فکر و ثقافت اور ادب کے مشترک موضوعات ہیں، اور اس کے لیے دعوت و اصلاح اور تعلیم و تربیت کا میدان اختیار کیا، عالمی رابطہ ادب اسلامی (۱) کے

(۱) یہ ایک خالص اسلامی ذہن رکھنے والی تحریکی طرز کی تنظیم ہے، جس میں مختلف ممالک کے اسلامی ذہن رکھنے والے ادباء و اہل قلم جڑے ہوئے ہیں، ریاض میں اس کا ہیڈ کوارٹر ہے، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی دینی فکر و تڑپ کی وجہ سے اس کا قیام ۱۹۸۴ء میں عمل میں آیا تھا اور انہی کی توجہ دہانی سے دنیا بھر کے دردمند دل رکھنے والے حضرات نے اباحیت پسند ادب کے فروغ کو دیکھتے ہوئے صحیح اسلامی ادب کو ترقی دینے اور نیا نصاب تعلیم ترویج دینے پر تیار ہوئے، اس کی پہلی کانفرنس شہر لکھنو میں ۱۹۸۶ء میں منعقد ہوئی، اور مولانا علی میاں ندوی اس کے اولین صدر منتخب ہوئے، تا حال یہ تحریک اپنی مجالس مذاکرہ منعقد کر کے دینی ادب کو فروغ دے رہی ہے۔

ایک سیمینار کی مناسبت سے جو حمد و مناجات پر رائے بریلی میں رکھا گیا تھا شرکت کے لیے سفر بھی کیا اور حضرت مولانا کے گاؤں بھی تشریف لائے اور پھر واپس جا کر وزارة الحج کے ترجمان مجلّہ میں پہلے الحج کے نام سے نکلتا تھا اور پھر "التضامن الاسلامی "کے نام سے نکلنے لگا تھا اپنے اداریہ اس سفر اور سیمینار کے تعلق سے اچھے جذبات و تاثرات سپرد قلم کئے تھے اور وہ اظہار تعلق کیا تھا جوان دونوں شخصیتوں کے درمیان قائم تھا، ان کو ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں سے خاص تعلق تھا اور اپنے اس تعلق کو انہوں نے اپنے ایک مقالہ میں ظاہر بھی کیا اور متعدد وجوہات سے ہندوستانی مسلمانوں کو زیادہ توجہ کا مستحق سمجھتے تھے۔

اچانک ان کی وفات کی خبر معلوم ہونے پر ہم سب کو صدمہ ہوا، اور حضرت مولانا کو اپنے قدیم اور خاص تعلق کی بنا پر بڑا افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے، آمین۔

انہوں نے اپنے پیچھے تصنیفات کا ایک اچھا ذخیرہ چھوڑا ہے جس میں تفسیر سے متعلق کتابیں، اصلاحی ادب، عورتوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق مختلف کتابیں اور دیوان شعری اہمیت کے حامل ہیں۔

پسماندگان میں صالح اولاد جن میں چھ صاحبزادگان اور چار صاحبزادیاں ہیں اور کئی بھائی ہیں، دو سال قبل ان کو اپنے عزیز و مشفق بھائی شیخ صالح کے ایک حادثہ میں وفات پا جانے کے صدمہ سے گزرنا پڑا تھا جن سے انھیں مزاج و مذاق میں بڑی مناسبت اور ان کا تعلیم و تربیت کے مرحلہ سے لے کر برابر ساتھ بھی رہا تھا، وہ اور ایک دوسرے بڑے ادیب و مفکر اور دانشور استاذ عبدالعزیز الرفاعی اور شیخ احمد محمد جمال تعلیمی رفاقت اور میدان عمل میں اشتراک اور فکری اتحاد کی وجہ سے دوست بھی تھے۔ میری ان کے ان بھائی سے ملاقات رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بھی مغفرت فرمائے۔ یہ دونوں بھائی جنت المعلاة میں ام المومنین حضرت خدیجة الکبری رضی اللہ عنہا کے پاس آسودۂ خاک ہیں۔

اللّٰهم انزل عليهم شآبيب رحمتك، وارض عنهم.

شیخ احمد عبدالعزیز آل مبارک

۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء تا ۱۴۰۹ھ ۱۹۸۸ء

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی استاد حدیث جامعۃ العین ابوظبی نے ٹیلی فون سے یہ افسوسناک اطلاع دی کہ علامہ شیخ احمد عبدالعزیز آل مبارک رئیس القضاء الشرعی ابوظبی دنیا میں نہ رہے، شب جمعہ کو یہ حادثہ وفات ۱۴/اکتوبر ۱۹۸۸ء مطابق ۲۷/ربیع الاول ۱۴۰۹ھ کو پیش آیا اور عالم اسلام میں خاص طور پر بڑے علماء کی صف میں ایک بڑا خلا پیدا کر گیا، وہ اپنی دینی خصوصیات کے ساتھ دینی واسلامی امور ومعاملات میں ایک وجیہ اور پُر وقار شخصیت رکھتے تھے، ایک طرف وہ لوگوں میں مرجع کی حیثیت رکھتے تھے، دوسری طرف ارباب حکومت واقتدار پر بھی اثر ورسوخ رکھتے تھے اور متحدہ عرب امارات کے دینی معاملات میں چیف جسٹس کے منصب پر فائز تھے، اصلاح ودعوت، افتاء وقضا اور دین کے دوسرے میدانوں میں ان کے نہ رہنے سے جو خلا ہوا اس کا پُر ہونا آسان نہیں ہے اور یہ ایسا عظیم ملی ودینی خسارہ ہے جسے برابر محسوس کیا جائے گا۔

شیخ مرحوم کو ہمارے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے اور ندوۃ العلماء سے بڑا تعلق خاطر تھا، اور ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء کو ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے موقع پر شرکت فرما کر ندوہ کو بڑی عزت بخشی تھی اور اس موقع پر کتب خانہ ندوۃ العلماء کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد بھی رکھا تھا اور اپنے خطابات ومقالات سے انہوں نے اور ان کے

ساتھ آئے ہوئے وفد نے اس بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس کو خطاب کیا تھا جس کی گونج اب تک رہی اور ان کا تعلق ندوۃ العلماء سے مسلسل بڑھتا ہی گیا، اور اس کی فکر و دعوت سے ان کو پوری ہم آہنگی محسوس ہوئی۔

شیخ مرحوم نے اپنے پیچھے بڑا علمی ذخیرہ کتابوں اور شاگردوں کی صورت میں چھوڑا ہے اور بڑے دینی حسنات چھوڑے جس کا ان کو ثواب پہنچتا رہے گا۔

شیخ احمد حسن باقوری مصری

۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء تا ۱۴۰۵ھ ۱۹۸۵ء

معروف وممتاز ازہری عالم وسابق وزیراوقاف مصر شیخ احمد حسن باقوری نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا، پہلے انہوں نے اخوان المسلمون (۱) کے زعیم وقائد کے طور پر پھر جب جمال عبدالناصر کا عہد حکومت آیا تو اس میں وزیر کی حیثیت سے زندگی گزاری، ان کی شہرت دعوتی، دینی، ملی خدمات اور زور خطابت کے ذریعہ ہوئی اور اخوان المسلمون کے بڑے لیڈروں میں ان کا شمار ہونے لگا تھا، لوگوں میں ان کی محبوبیت ومقبولیت کا روز افزوں اضافہ ہی ہو رہا تھا مگر وہ اس وقت آزمائش میں پڑ گئے جب جمال عبدالناصر نے اپنے عہد حکومت میں اخوان کی تائید حاصل کرنی چاہی اور اخوان نے ان کے ساتھ شروع میں تعاون بھی کیا لیکن جب اخوانیوں نے دیکھا کہ جمال عبدالناصر کی پالیسی اسلامی مفادات کے لئے

(۱) اخوان المسلمون اسلامی ذہن رکھنے والی ایک اسلامی تنظیم ہے، شیخ حسن البناء نے مصر میں ۱۹۲۸ء میں اس کی بنیاد رکھی، اور بہت جلد ہی اس کی صاف وشفاف تعلیمات سے مصری معاشرہ میں اصلاحی تحریک پیدا ہوئی، بکثرت لوگ ان سے جڑتے چلے گئے، انہوں نے وقت سے پہلے سیاست میں حصہ لیا، جس کی وجہ سے حکومت کی نظروں میں یہ لوگ آگئے اور ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے، صحابہ کے بعد دین کے سلسلہ میں سب سے زیادہ جن لوگوں کو ستایا گیا وہ یہی لوگ تھے، قید وبند کی صعوبتیں ان کے مقدر ہوئی، اور پھر ایک موقع ایسا آیا کہ ان کی شب وروز جد وجہد اور کئی دہائیوں کی ایذا رسانی جھیلنے کے بعد وہ لوگ حکومت تک پہونچے، لیکن دشمنان اسلام نے خوفناک سازشوں کے بعد پھر ایک بار ان کو حکومت سے بے دخل کر دیا اور ان کے خون کی ندیاں بہادی گئیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا حامی وناصر ہو۔

مخلصانہ نہیں ہے اوراخوان کے لئے وہ مخلص نہیں رہے ہیں تواخوان نے ان سے دامن بچانا شروع کردیا، لیکن اخوانی رہنما شیخ باقوری نے اپنا حکومت سے تعلق کمزور نہ ہونے دیا، اس میں ان کے لئے جو بھی مصلحت ہولیکن ان کے سلسلہ میں ان کے اس رویہ سے اخوانی حلقوں میں غلط فہمی پھیلی اوران کی مقبولیت میں بڑا فرق ظاہر ہوا، لیکن ہم شیخ باقوری کے لئے مغفرت کی دعا کریں گے، اوراللہ سے امید رکھتے ہیں کہ دین کے لئے انہوں نے جوخدمت انجام دی ہے اس کوشرف قبولیت حاصل ہواوراسلام میں وہ جن حالات سے دوچار ہوئے اس میں ان کے ساتھ عفوکا معاملہ ہو۔

شیخ باقوری نے ازہر میں تعلیم حاصل کی اورامتیازی حیثیت کے ساتھ وہ اپنے معاصرین میں سامنے آئے، انہوں نے دین اورملک کے مفاداوردعوت وفکراسلامی کے لئے لوگوں کا جوذہن بنایا اوراخوان کے ساتھ جوقربانیاں دیں چنانچہ وہ اس کے بڑے قائدین میں شمار کئے جانے لگے، وہ ان کا عہدزریں شمار کیا جائے گا۔ افسوس کہ وزارت میں آنے کے بعد وہ مستقل وزارت میں بھی نہ رہ سکے اورانہیں کچھ مدت کے بعد حکومت نے ان کے منصب سے سبکدوش بھی کردیا، جب یہ دیکھا کہ ان سے ہمیں جوفائدہ پہنچنا چاہئے نہیں پہونچ رہاہے توان کومنصب سے الگ کردیا، اس کے بعد اگرچہ وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہوگئے اورعزلت نشینی اختیارکرلی مگراس کے باوجود وہ اپنا کھویا ہوا وزن اورمقام حاصل نہ کرسکے، اگروہ عہدہ قبول نہ کرتے توان کی دینی حیثیت اورلوگوں میں محبوبیت ومقبولیت اسی طرح باقی رہتی جومنصب قبول کرنے سے پہلے تھی، یہ ظاہراًان کی اجتہادی غلطی تھی اس کی وجہ سے ان سے جوملک وملت کوجونفع پہنچ سکتا نہ پہنچ سکا۔

انہیں متعددایوارڈ وانعامات حاصل ہوئے، ان کی کتابوں میں اثر القران الكريم فی اللغة العربية، تحت راية القرآن، قطوف من أدب النبوة، خواطر وأحاديث، صفوة السيرة المحمدية، وغیرہ ہے۔

پروفیسر اسماعیل راجی فاروقی

۱۳۴۰ھ ۱۹۲۱ء تا ۱۴۰۶ھ ۱۹۸۶ء

مشرق وسطیٰ کے مسلم دانشوروں میں پروفیسر اسماعیل راجی فاروقی ممتاز صاحب فکر شمار کی جانے والی شخصیت تھے، وہ فلسطین کے رہنے والے تھے، اور گذشتہ صدی کے آخر میں فکری و تعلیمی کاموں کو انجام دیتے ہوئے قاتلانہ حملہ میں شہید ہوئے، انہوں نے علم و تعلیم کے عصری اداروں میں شہرت کے ساتھ زندگی گذاری، آخر میں وہ فلاڈلفیا یونیورسٹی امریکہ میں مشرقی شعبہ کے سربراہ تھے، ان کی جو فکری کوشش ان کی تصنیفات کے توسط سے سامنے آئیں، وہ مسلمانوں کے جدید ذہن رکھنے والوں کے لیے قابل قدردانی واستفادہ ہے، اور عصری تعلیم کے غیر مسلم حلقوں میں بھی اس کی اہمیت محسوس کی گئی، شاید اسی کا یہ ردعمل ہوا، کہ پروفیسر صاحب کو رات میں ان کے گھر کے اندر جاکر ان کی اہلیہ کے ساتھ مار دیا گیا(۱)۔

(۱) ان کی ولادت یافا فلسطین میں ۱۹۲۱ء میں وہاں کے ایک قابل قدر اور شریف خاندان میں ہوئی، انہوں نے سان جوزیف اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کرکے بیروت کی امریکن یونیورسٹی سے گریجویشن پاس کیا، فلسطین کی جہاد آزادی میں بنفس نفیس شریک ہوئے، اسرائیل کے قیام کے بعد امریکہ ہجرت کر گئے، اور ۱۹۵۱ء میں انڈیانا یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد قاہرہ جاکر اسلامی علوم میں جامعہ ازہر سے ابن تیمیہ کے علوم پر مہارت حاصل کرکے مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات ڈھونڈے، ناصر کی عرب قومیت کے خلاف ان کا نظریہ خالص اسلامی تھا۔ ان کی اہم کتابوں میں "الملل اليهودية المعاصرة، الاطلس التاريخي لديانات العالم، أديان آسيا الكبرىٰ، الأخلاق المسيحية، الاسلام ومشكلة اسرائيل، التوحيد وآثاره في الفكر والحياة، أطلس الحضارة الاسلامية"۔ انہوں نے ۱۹۸۱ء میں "المعهد العالمي للفكر الاسلامی" کے نام سے واشنگٹن میں ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا۔

مسلمانوں کے علم وفکر کے میدان میں یہ ایک بڑا قابل افسوس واقعہ رہا، پروفیسر صاحب کی فکری کوششوں کی اہمیت موجودہ عہد میں محسوس کی جاتی رہی ہے، گذشتہ کئی صدیوں میں مسلمانوں نے علمی بحث وتحقیق کے میدان میں جو بے توجہی اختیار کی، اس کو دیکھتے ہوئے یورپ کی قوتوں نے اس میدان میں ترقی حاصل کی، اور انہوں نے مسلمانوں کو اپنا حریف سمجھ کر اس میدان میں پیچھے کر دیا، خاص طور پر مشرقی ممالک میں یورپ کی طاقتوں کو جو اقتدار حاصل ہوا، اس کے ذریعہ ان کی اس حریفانہ کوشش کو تقویت ملی۔

حالانکہ یورپ اپنے سابقہ عہد میں مسلمانوں کی علمی برتری سے استفادہ کر کے اس میدان میں آگے بڑھا تھا، اور مسلمانوں نے اس کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا تھا، یورپ میں علمی ترقی کے ساتھ جو سیاسی وفوجی برتری ملی اس نے مذہب کی اہمیت کو ختم کر کے خالص مادی نقطہ نظر کو زندگی اور اس کی ترقیات پر حاوی کر لیا اسی کے ساتھ اپنا سب سے بڑا حریف اسلام کو سمجھا، اور اس کے اثرات کو بدلنے کے لیے تعلیم وترقی کا ذریعہ بھی اختیار کیا، اور بتدریج اس نے مسلمانوں کی نسلوں کو اپنے ذہن کا بنالیا، اس صورت میں مسلمان دانشوروں نے یورپ کی برتری کی امتیازی خصوصیات کو ان میں رہ کر دیکھا اور سمجھا تھا اسی سطح

=ان کے قتل کا واقعہ ۲۷ مئی ۱۹۸۶ء مطابق ۱۸ رمضان ۱۴۰۶ھ صبح کے وقت پیش آیا، ان کی اہلیہ ان کے لیے ناشتہ تیار کرنے کی غرض سے کچن میں چلی گئی، وہیں قریب کے دروازے سے ایک آدمی داخل ہوا، اور پے درپے وار کر کے ان کو ختم کر دیا، ان کی چیخ سن کر ان کی بیٹی انمار فاروقی کچن میں گئی اس پر بھی قاتل نے کئی وار کئے، لیکن اتفاق سے وہ بچ گئی، ماں بیٹی کی چیخیں سن کر پروفیسر صاحب جیسے ہی نیچے اترے تو قاتل نے ان پر کئی وار کر کے ان کی زندگی کا چراغ بھی گل کر دیا، کئی عینی شاہدین کے مطابق قاتل بہت سے تھے جوان کے گھر کے آس پاس گھات لگائے ہوئے تھے قتل کر کے وہ سب ایک گاڑی سے فرار ہو گئے، مقامی عدالت نے اس کارروائی کی تحقیق ایف بی آئی کے حوالہ کرنے کی بات کی، لیکن کچھ دنوں کے بعد مقامی پولیس کے حوالہ کر کے ایف بی آئی نے بھی ہاتھ جھاڑ لیے، لوگوں کی رائے کے مطابق اور خود ایف بی آئی چیف کے مطابق انہوں نے اس واقعہ کے بعد عرب امریکن کو خبر دار کیا کہ وہ لوگ یہودی دہشت گرد تنظیموں کے نشانہ پر ہیں، جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو فلسطینیوں کی حمایت میں کتاب لکھنا مہنگا پڑ گیا۔

اور معیار سے اس کا مداوا کرنے کا طریقہ اختیار کیا، ان میں پروفیسر اسماعیل راجی کا کام بھی بڑا وقیع کام ہے، انہوں نے اپنی علمی شخصیت کو یورپ کے مرکزی سطح کے اداروں میں معروف اور لائق اعتراف بنایا، اور حکمت کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی جو امتیازی خصوصیات ہیں ان کو سامنے لانے کا سلسلہ قائم کیا، جس کی افادیت بہت سے حلقوں میں محسوس کی گئی بالآخر ان کے کام کی اہمیت کو اسلام مخالف عناصر نے محسوس کرتے ہوئے ان کو میدان سے ہٹا دیا۔

ان کی شخصیت کو ہمارے عصری اہل علم وفکر کے سامنے لانے کے لیے اظہار قدر دانی کرنے کے خیال سے فکر اسلامی کے لیے کوشاں ڈاکٹر منظور عالم صاحب اپنے ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کے ذریعہ سامنے لا رہے ہیں، ان کے کام وفکر سے ملت کو آگاہ کرنا وقت کا ایک اہم تقاضہ اور ان کے لیے اظہار قدر دانی کرنا بہت مناسب اقدام ہے۔

مجھے پروفیسر اسماعیل راجی فاروقی صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ملنے کا اتفاق بھی ہوا، اور اپنے بزرگ ماموں مولانا ابوالحسن علی ندوی سے ان کی ملاقاتوں میں موجود بھی رہا ہوں، میں نے ان کی شخصیت کو بہت معتدل اور اسلامی الفکر پایا، اسی لیے مجھے ان پر اس سیمینار کے انعقاد سے خوشی ہوئی اور اسی مناسبت سے یہ پیغام تحریر کر رہا ہوں۔

علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی

۱۳۱۱ھ ۱۸۹۳ء تا ۱۴۰۷ھ ۱۹۸۷ء

علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی اپنے عہد کے عربیت میں مرجعیت کی حامل شخصیت تھے، ان کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اس وقت کے ناظم مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اور معتمد تعلیم مولانا سید سلیمان ندوی نے بلایا، اور یہ اللہ کی طرف سے ایک غیبی انتظام تھا چنانچہ ان کے دامن تربیت وتعلیم سے جو شخصیتیں ابھریں ان میں خاص طور پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی قابل ذکر ہیں جن کی عربیت کو اہل عرب نے نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اپنا استاد مانا، وہ ۱۳۱۱ھ میں فرخ سجلماسہ میں پیدا ہوئے، ۱۳؍سال کی عمر میں حافظ قرآن ہوگئے، اور مقامی علماء سے تجوید کا علم حاصل کیا، پھر نحو وغیرہ میں درک پیدا کیا اور جامعۃ القرویین میں داخلہ لے کر وہاں کے علماء سے استفادہ کیا، ۱۳۴۰ھ میں مصر آئے اور ازہر کے قسم عالی کے دروس میں شرکت کی، اور یہاں کے دوران قیام علامہ رشید رضا مصری سے علمی روابط قائم کئے، پھر ہندوستان آکر علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوزی سے حدیث میں استفادہ کیا، اور لکھنؤ میں عربی زبان وادب کی تدریس کے ذریعہ فضلاء تیار کئے، اور اسی زمانہ میں الضیاء کی بھی سرپرستی کی جوان کے شاگرد مولانا مسعود عالم ندوی ندوۃ العلماء سے نکال رہے تھے۔

۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں المانیا میں Ph.D. کی سند حاصل کی۔

بغداد کے ان کے زمانہ قیام میں ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ان سے

استفادہ کے لئے مولانا سعید الرحمٰن صاحب گئے اور کچھ عرصہ ان کی خدمت میں گزارا، ۱۹۵۹ء میں وہ جامعہ محمد الخامس رباط مراکش میں استاد ہوگئے اور جب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا قیام عمل میں آیا تو اس کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔

شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی آخر میں اپنے وطن مراکش میں ہی مقیم ہوگئے تھے اور وہیں الدار البیضاء میں ۲۵ رشوال ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۲ رجون ۱۹۸۷ء کو وفات پائی، کئی کتابیں اپنے پیچھے چھوڑیں جن میں "دیوان الشعر، الفتاویٰ الهلالیه، الاسلام والمذاهب الاشتراکیة" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً وغفرله مغفرةً تامةً.

ڈاکٹر حمید اللہ فرانس

۱۳۲۷ھ ۱۹۰۸ء تا ۱۴۲۳ھ ۲۰۰۲ء

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدر آباد کے رہنے والے، اور جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے ممتاز فضلاء میں تھے، انہوں نے اسلامیات اور حکمت وفلسفہ میں اپنے عہد کی ممتاز شخصیات علامہ سید مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبد الباری ندوی سے استفادہ کیا تھا، جو وہاں پروفیسر تھے، اور حیدر آباد میں سکونت پذیر تھے، پھر وہ یورپ چلے گئے، اور اپنے کو علم وتحقیق کے لیے وقف کر دیا، چنانچہ ان کے ذریعہ بڑے علمی انکشافات سامنے آئے، اور حضرت ابو ھریرہؓ کے شاگرد حضرت ہمام ابن منبہ کے صحیفے (۱) کی تدوین کا کام ان کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے، اس کے علاوہ خاموش دعوت وتبلیغ دین کا عمل بھی جاری رکھا، اور بہت سے لوگ ان کے ذریعہ آغوش اسلام میں آئے، قرآن مجید کا فرنچ زبان میں ترجمہ بھی کیا، جو بہت مقبول ہوا۔(۲)

---

(۱) صحیفہ ہمام ابن منبہ کا اصل نام الصحیفة الصحیحة ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد ہمام نے یہ صحیفہ لکھ کر اپنے استاد کو پیش کیا تھا گویا یہ ۵۸ھ میں لکھا گیا تھا اس کا ایک قلمی نسخہ برلن کی کسی لائبریری سے ڈاکٹر حمید اللہ نے ڈھونڈ نکالا، اسی طرح دمشق کی ایک لائبریری سے ایک اور نسخہ مل گیا پھر ان دونوں نسخوں کا تقابل کر کے ۱۹۵۵ء میں حیدر آباد دکن سے شائع کیا، اس صحیفہ میں کل ۱۳۸ احادیث ہیں۔

(۲) آپ نے ۱۹۳۸ء میں جرمنی کی بون یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اور وہیں اردو وعربی کے استاد مقرر ہوئے، ۱۹۴۶ء میں اقوام متحدہ میں ریاست حیدر آباد کے نمائندہ مقرر ہوئے، اور جب ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد پر بھارتی پولیس کی جارحیت اور فوجی ایکشن کے بعد پیرس ہی میں رہ کر جلاوطنی کی زندگی اختیار کی، وہ سقوط حیدر آباد کو بہت بڑا قومی سانحہ قرار دیتے تھے، چنانچہ انھوں نے ریاست حیدر آباد کے تحفظ اور عالمی برادری میں اس کی نمائندگی کی غرض سے "حیدر آباد لیبریشن سوسائٹی" کی بنیاد رکھی۔

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۶۴ء میں اس وقت ہوئی، جب میں اسلامک سینٹر جنیوا(۱) کی سالانہ میٹنگ میں شرکت کے لیے خال معظم مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ گیا تھا، ان سے ملاقات سے پہلے ان کا جونقشہ ذہن میں قائم تھا، وہ ان کو دیکھنے سے مختلف تھا، خیال تھا کہ یورپ میں رہنے والے شخص کے صفات ضرور پائے جاتے ہوں گے، لیکن ان کو دیکھا تو ہندوستانی اور دیندار مسلمان چہرے کے ساتھ دبلے پتلے اور معمولی جسم اور متواضع شخصیت کے حامل، طالب علمانہ ادا رکھنے والے متوازن، اور عالمانہ فکر وفہم کے مالک، اس کے علاوہ ان کے زہداور دینداری کے حالات تو پہلے سے معلوم تھے، انہوں نے علم وتحقیق میں عالمی شہرت اور مقام حاصل کرنے کے باوجود اپنا طرز حیات اور سادگی و قناعت میں فرق نہیں آنے دیا، اورایک اچھی عمر پا کر جو دین وعلم کی خدمت میں پوری طرح صرف کی، داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کا انتقال ۱۷دسمبر ۲۰۰۲ کو امریکی ریاست فلوریڈا کے شہر جیکسن ول میں ہوا۔

= تحقیق کے مقاصد کے لیے متعدد اسلامی و یورپی ممالک کا دورہ بھی کیا، جن میں عہد نبوی کے میدان جنگ نامی کتاب کے سلسلہ میں نجد وحجاز کے میدانوں کا سفر کیا اور تاریخی مواد اکٹھا کیا، انگریزی میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس میں نقشے وغیرہ بھی شامل تھے، آپ نے فرانسیسی زبان میں سیرت نبوی پر کئی جلدوں میں کتاب تحریر کی، اس کے ساتھ امام محمد الشیبانی کی ''کتاب السیر'' اور شاہ ولی اللہ کی ''حجة الله البالغة'' کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔

آپ کی کتاب ''خطبات بہاولپور'' سرسید احمد خان کے خطبات احمدیہ کے بعد اردو میں تاریخی وتحقیقی مواد کے لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل کتاب ہے، خصوصا ان کا پانچواں خطبہ ''قانون بين الممالك'' ایسا موضوع ہے، جو عام طور پر دینی درسگاہوں کے طلباء کی دسترس سے باہر ہے۔

(۱) اسلامک سینٹر آف جنیوا کا قیام شیخ سعید رمضان کے ہاتھوں ۱۹۶۵ء میں عمل میں آیا، یہاں بیک وقت اسلامی تعلیمات کے عام کرنے کا نظم، غیر مسلموں میں دعوتی کام کا پھیلاؤ، مساجد کا قیام، اور دوسرے بہت سارے دعوتی کام انجام دیئے جاتے ہیں۔

شیخ حسن بن عبداللہ آل الشیخ

۱۳۵۲ھ ۱۹۳۳ء تا ۱۴۰۸ھ ۱۹۸۷ء

وزیر التعلیم العالی برائے سعودی عرب معالی الشیخ حسن بن عبداللہ آل الشیخ رئیس اعلیٰ جامعات مملکت کی وفات کی اخبارات کے ذریعہ اطلاع ملی۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون.

معالی الشیخ حسن بن عبداللہ نے ۵۵ سال اپنی عمر کے بڑی دینی، علمی خدمت میں گزارے اور جلیل القدر کام انجام دیئے، وہ شیخ عبداللہ بن الحسن آل الشیخ کے چھوٹے صاحبزادے جو مملکت کے چیف جسٹس اور دوسرے الفاظ میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز رہے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے ان عظیم المرتبت والد کے زیر سایہ تعلیم و تربیت حاصل کی، اور خاندان کے دوسرے علماء کے اشراف میں علم وثقافت حاصل کیا یہ خاندان عظیم اسلامی مصلح امام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ سے انتساب رکھتا تھا اس لیے اس کے افراد آل الشیخ کے لقب سے معروف ہیں، شیخ حسن بن عبداللہ تعلیمی مراحل پورے کرنے کے بعد جب عملی میدان میں آئے تو وزیر المعارف کے منصب پر فائز ہوئے، پھر وزیر التعلیم العالی کے عہدہ پر ترقی کی، پہلے یہ دونوں وزارتیں ایک تھیں بعد میں کام کی وسعت کو دیکھتے ہوئے دو وزارتیں کر دی گئیں، تعلیم کو ترقی دینے، جامعات کو فروغ دینے اور ابتدائی وثانوی تعلیم کے نظام کو زیادہ بہتر بنانے اور باہر کے علماء ودانشوروں کو دعوت دے کر ان کے مشوروں اور آراء سے مستفید ہونے کے مواقع زیادہ سے زیادہ فراہم کیے، اور مملکت میں تعلیم کا جو رجحان بڑھا، اور نوجوانوں نے اس میں ترقی کی اس میں شیخ حسن

بن عبداللہ کا نا قابل فراموش کردار ہے، وہ بڑے مخلص اور پابند عہد شخص تھے، اور معاملات میں فہم وبصیرت رکھنے کے ساتھ بڑے خوش مزاج اور اعلیٰ اخلاق کے حامل شخصیت تھے، اور علم وثقافت وادب میں بھی اعلیٰ مقام کے حامل تھے، اور اپنے اعلیٰ علمی وادبی ذوق سے لوگوں کو مستفید بھی کرتے اور رسائل وجرائد اور اخبارات میں ان کے آرٹیکل شائع ہوتے۔

وہ خطیب عرفات اور امام حرم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل الشیخ کے چھوٹے بھائی تھے اور اپنی ان خالص دینی ذمہ داریوں سے پہلے مملکت کے وزیرالمعارف بھی رہ چکے تھے شیخ حسن بن عبداللہ اپنے بھائی شیخ عبدالعزیز کی وزارت چھوڑنے کے بعد وزیرالمعارف ہوئے۔

شیخ حسن کا خاندان اپنے علمی ودینی مقام میں عالمی شہرت کا حامل اور مملکت کا رہنما خاندان ہے، شیخ حسن کے بھائی شیخ عبدالعزیز اور والد شیخ عبداللہ بن حسن مملکت کی بڑی محترم شخصیات میں شمار کئے جاتے ہیں اور شیخ حمیدالدین الحسن قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے منصب پر جو مملکت میں شیخ الاسلام کے منصب کی حیثیت رکھتا ہے فائز رہے تھے، اس بڑی علمی، دینی وجاہت کے ساتھ ذاتی صفات وخصوصیات، اخلاص وللّٰہیت، ذوق عبادت، شوق خدمت خلق وغیرہ میں خاندان کے یہ سب افراد ممتاز رہے ہیں، شیخ حسن کے عم نامدار شیخ عمر بن الحسن بھی مملکت کے علمائے کبار اور ممتاز داعیوں اور مفکرین میں تھے، اور هيئة الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر اور اس کے متعلق منطقہ میں ذمہ دار (رئیس) تھے۔

ان کے اور ہمارے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان بڑے محبت واخوت کے روابط تھے اس کی بنیاد اس وقت پڑی تھی جب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ حرمین شریفین کا پہلا سفر ۱۹۴۷ء میں ہوا تھا، اس سفر میں وہ مملکت کی سرکردہ وسربرآوردہ شخصیات سے ملے تھے جن میں چوٹی کے ادباء اور مفکرین ودانشور اور ممتاز علماء ورہنما وقائد شخصیات تھیں، شیخ عمر بن الحسن سے جو تعلق اس وقت قائم ہوا تھا اس تعلق کا امتداد ان کے ان بھتیجوں شیخ عبدالعزیز اور شیخ حسن سے تعلق میں ظاہر ہوا اور اپنے والد

اور چچا کے تعلق کی نسبت سے شیخ عبدالعزیز اور شیخ حسن نے حضرت مولانا سے نیاز مندانہ تعلق رکھا، چنانچہ شیخ حسن کی توجیہ سے وزارت المعارف نے حضرت مولانا کو ریاض دعوت دی اور ریاض کی کلیات میں ان کے محاضرات اور خطابات کرائے، جن کا مجموعہ کتاب کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

شیخ حسن بن عبداللہ آل الشیخ نے حضرت مولانا کے ساتھ ریاض کے اس سفر میں بڑے احترام وتکریم اور بڑی اخوت ومحبت کا معاملہ کیا اور بعد میں یہ تعلق اور مضبوط ہوتا گیا۔

ان کے بھائی شیخ عبدالعزیز آل الشیخ بھی ایسا ہی تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے جب برصغیر کا دورہ کیا تو حضرت مولانا کی دعوت پر ندوۃ العلماء بھی تشریف لائے چونکہ وہ امام حرم بھی تھے اس لیے اس نسبت سے جمعہ کی نماز ان کے پیچھے ادا کرنے کے لئے اتنا بڑا مجمع ندوہ میں اکٹھا ہو گیا تھا جس کی نظیر نہیں ملتی۔

اس پورے گھرانہ سے حضرت مولانا کا اور ندوۃ العلماء اور ان حضرات کا حضرت مولانا اور ندوۃ العلماء سے جو تعلق تھا اور پورے عالم اسلام کے دینی مرکز حرمین شریفین سے ان کو جو نسبت تھی اس سے ہمارے پورے حلقہ کو ایک ذاتی وخاندانی حادثہ کی طرح یہ حادثہ محسوس ہوا، یہ صرف مملکت عربیہ سعودیہ کا ہی حادثہ نہیں ہے بلکہ پورے عالم اسلام کا سانحہ ہے، شیخ علی طنطاوی نے بھی اس کو اپنے مضمون میں جو الشرق الاوسط میں چھپا تھا عظیم خسارہ سے تعبیر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس عظیم خسارہ کو دور فرمائے اور اس خلا کو پُر فرمائے جو ان کی وفات سے پیش آیا ہے اور شیخ کو درجات عالیہ اور مغفرت ورضوان سے نوازے۔

شیخ حسن الہضیبی

۱۳۰۹ھ ۱۸۹۱ء تا ۱۳۹۳ھ ۱۹۷۴ء

شیخ حسن الہیضی نے جنوری ۱۹۷۴ء کے آغاز میں دار فانی سے دار بقا کو کوچ کیا اور وہ اپنی قربانیوں کا دائمی وابدی صلہ حاصل کرنے کے لئے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون.

تحریک اخوان المسلمون کے قائد اور رہنما شیخ حسن الہضیبی کے سانحۂ ارتحال کو عالم اسلام نے بہت محسوس کیا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ہمارے دار العلوم ندوۃ العلماء نے بھی اس کو ذاتی خسارہ اور عظیم ملی سانحہ خیال کیا، ناسازگار حالات میں تحریک اخوان المسلمون کی قیادت ورہنمائی جس ایثار وقربانی، حکمت وبصیرت کے ساتھ انہوں نے کی اس سے ان کی وفات سے عالم عربی اور عالم اسلام میں بڑا خلا پیدا ہو گیا، ندوہ کے منتسبین اسے اپنا ذاتی غم وصدمہ محسوس کرتے ہیں اور ان کے رفع درجات کے لیے صمیم قلب سے دعا کرتے ہیں۔

شیخ حسن الہضیبی تحریک اخوان المسلمون کے بانی امام حسن البنا شہید کی شہادت کے بعد اس کے قائد ومرشد ہوئے اور انہوں نے ان کی جانشینی کا پورا حق ادا کیا اور انہیں اس عظیم جماعت کی قیادت کے لیے ۲۵ رسال کی مدت ملی، جس کے افراد کی اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے قربانیوں اور اللہ کے لئے محبت اور اللہ کے لیے نفرت کے جذبہ اور ایمان صادق وعمل صالح کی کیفیت کو دیکھ کر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا اور اسے لکھا بھی کہ ”لا یحبھم الا مؤمن ولا یبغضھم الا منافق“ کہ مومن

کو یہ محبوب اور منافق کو یہ مبغوض ہوں گے۔

شیخ حسن الہضیبی ایک بڑے بلند کردار اور وسیع فکر وسوچ والی شخصیت تھے، امام حسن البنا شہید کی وفات پر دو سال سے زائد کا عرصہ گزرا تھا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا مصر کا سفر ہوا اور وہاں ان کو اخوان کی رہنما شخصیات سے ملنے اور ان کے درمیان خطاب کرنے کا موقع ملا، جس میں انہوں نے ان کی قربانیوں کا جذبہ اور خدمات کے اعتراف کے ساتھ بعض خامیوں کی طرف بھی توجہ دلائی تو اخوان کی ان شخصیات نے اور خود اس کے قائد ومرشد شیخ حسن الہضیبی نے ان کو اسی جذبہ وخلوص سے سنا جیسے مسترشد مرشد کی اور شاگرد استاد کی سنتا ہے، اور جب وہ خطاب رسالہ کے طور پر شائع ہوا تو اس پر انہوں نے مقدمہ بھی لکھا جو ان کے گہرے تعلق اور کشادہ قلبی کی بات تھی، آج ان کے نہ رہنے سے صرف اخوان المسلمون کو ہی خسارہ محسوس نہیں ہو رہا ہے بلکہ پوری ملت اسلامیہ عظیم خسارہ محسوس کر رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور آخرت میں ان کے مرتبہ کو خوب بلند فرمائے۔ آمین

مولانا سید محمد یوسف بنوری

۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء تا ۱۳۹۹ھ ۱۹۷۸ء

علامہ سید محمد یوسف بنوری ثم کراچوی برصغیر کے ان بڑے علماء و محدثین میں تھے جن پر ملت اسلامیہ ہند فخر کرتی ہے اور بلاد عربیہ میں بھی اپنی علمی خدمات اور دینی مقام کی وجہ سے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مایہ ناز شاگردوں میں ہی نہ تھے بلکہ ان کے جانشین اور ان کے علوم و معارف کے سچے وارث وامین تھے۔

وہ رجب ۱۹۴۹ء میں پاکستان منتقل ہوئے تو انہوں نے کراچی میں ایک بڑا دینی تعلیمی ادارہ قائم کیا جو جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے نام سے پاکستان کا معروف اور بڑا مستند تعلیمی ادارہ ہے، جس کے فضلاء پاکستان میں اور پاکستان کے باہر دنیا کے مختلف ملکوں میں دین کے نشر و اشاعت کے کام میں مصروف ہیں، انہوں اس تعلیمی ادارہ کو بعض خصوصیات میں دوسرے اداروں سے ممتاز رکھا اور اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہاں سے تعاون حاصل کرنے کے لیے لوگ نکلتے نہیں، اور نہ ہی ضرورت دوسروں کے سامنے رکھتے ہیں۔

مولانا بنوری نے یہ دعا کی تھی کہ اس کام میں مخلوق کی محتاجگی نہ ہو، اس کا کھلا اثر یہ ظاہر ہوا کہ لوگ آکر خود تعاون دیتے ہیں، ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ تعمیرات پر توجہ کے بجائے تعلیم پر توجہ زیادہ ہے، اور جو سادگی دینی ادارہ کی ہونی چاہئے وہ یہاں قائم ہے۔

مولانا علماء کے حلقہ میں بڑی محترم شخصیت کے طور پر دنیا میں معروف رہے، اور پاکستان میں ان کو یہ مقام بھی حاصل ہوا کہ ۱۹۷۳ء میں تمام دینی جماعتوں نے متفقہ طور پر تحریک ختم نبوت کا صدر انھیں منتخب کیا اور انہی کی سربراہی میں قادیانیوں کو غیر مسلم

اقلیت قرار دینے میں کامیابی ہوئی۔

مولانا کی اصل خصوصیت وامتیاز علم حدیث سے ان کا اشتغال تھا اور اس میں ان کو رسوخ حاصل تھا، انہوں نے ترمذی شریف کی شرح کا سلسلہ بھی شروع کیا جس کی متعدد جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ معارف السنن کے نام سے ان کی شرح غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے، اسی طرح ان کی کتاب یتیمۃ البیان فی مقدمۃ تفسیر القرآن مختصر مگر بڑا جامع رسالہ ہے۔ تفسیر کے طالب علم کے لیے اس میں بڑا خزانہ ہے۔

حضرت بنوری کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ سلف صالحین کے مسلک پر سختی سے قائم تھے اور اس سے انحراف کو ملت کے لیے خطرہ سمجھتے تھے، حدیث شریف کی طویل خدمت نے ان کے دل کو حب رسولؐ سے معمور کر دیا تھا، اور وہ ہر سال مشقت اٹھا کر رمضان المبارک میں مدینہ پاک حاضری دیتے اور مسجد نبوی میں اعتکاف فرماتے تھے، حضرت بنوری کی شخصیت کا اعتراف صرف برصغیر کے علماء کو ہی نہیں، بلکہ علمائے مصر وشام وحجاز کو بھی تھا، اور ان کی ایک دل آویز شخصیت تھے۔

ان کا خاندانی تعلق حضرت سید آدم بنوریؒ سے تھا اس طرح وہ دو نسبتوں سے آدمی نسبت رکھتے تھے، حضرت شاہ علم اللہ حسنی حضرت سید آدم بنوری کے فیض یافتہ اور خلیفہ تھے اس نسبت سے بھی علامہ بنوری بڑی محترم شخصیت تھے، ان کی وفات سے جو عظیم خلا ہوا ہے اللہ تعالیٰ ہی اس کو پورا فرمائے اور ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

شیخ صالح حصین رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۵۱ھ ۱۹۳۲ء تا ۱۴۳۴ھ ۲۰۱۳ء

شیخ صالح حصین جو مملکت سعودیہ عربیہ کے ایک دینی اور اسلامی جذبہ کے حامل بڑے دانشور شخص تھے، ان کی دینداری ان کا خاندانی ورثہ تھا، جو نجد کے خاندانوں میں عام طور پر وہاں کے اسلامی جذبہ کے حامل مقامی علماء کے طریقہ تعلیم سے حاصل ہوتی تھی، جس میں عقیدۂ توحید کو اسلام میں بنیادی حیثیت حاصل ہے، اس کی طرف وہاں خاص توجہ کا مزاج رہا ہے، اس مزاج کے اثرات برابر اب بھی قائم ہیں، ان میں شیخ صالح الحصین ایک جامع ذہن کے شخص رہے ہیں، جن کا تعلق بنو تمیم سے تھا، وہ وقت کے دینی اور علمی تقاضوں کو سمجھتے تھے اور اس میں فہم وصلاحیت کے مطابق طریقہ کار اختیار کرتے تھے، ان کی اس جامعیت اور دانشوری نے مملکت سعودیہ میں ان کو خصوصی عزت کا مقام عطا کیا تھا، وہ حکومت کے ایک بڑے عہدہ پر رہنے کے بعد اس سے علاحدہ ہو گئے تھے لیکن ان کا مرتبہ وزیر کی حیثیت کا سمجھا جاتا تھا، انہوں نے اپنی زندگی کے اس مرحلہ میں مدینہ منورہ میں قیام اختیار کیا تھا، اور ذہنی وعملی طور پر اپنی صلاحیت کو عمل میں لاتے تھے، پھر ان کو حرمین شریفین کی نگرانی کا بڑا عہدہ دیا گیا، جس کو انہوں نے تقریباً آخری وقت تک انجام دیا، حتی کہ وہ علیل ہو کر علاج کے لیے یورپ بھیجے گئے اور پھر اس علالت کے نتیجہ میں آخرت کی طرف رحلت کر گئے۔

زہد وقناعت، تواضع وغیرہ ان کی نمایاں صفات تھیں بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود وہ ایک عام آدمی کی طرح رہتے جب ان کی حیثیت وزیر کی رہی تب بھی وہ اسی

طرح رہے، اور جو تنخواہ ان کو ملتی اس میں جو زائد محسوس کرتے اس کو کم کرادیتے، شیخ کو رئیس شوؤن الحرمین کا عہدہ سپرد کیا گیا تھا، اور فیصل ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔

ان کی تعلیمی لیاقت بھی بڑھی ہوئی تھی اور کئی زبانوں کے ماہر تھے اور عصری علوم سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے، اس کے ساتھ اچھا دینی فہم اور علماء سے مربوط تھے اور اس عہد کے علماء میں ان کو عالی مقام حاصل تھا، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ سے ان کا مخلصانہ تعلق تھا۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے ان کی اور ان کے بھائیوں کی جو ملاقاتیں رہی تھیں، ان کے اثر سے دونوں کے درمیان اچھا تعلق ہو گیا تھا، مجھے بھی ان سے ملنے کا بار بار موقع ملا، اور وہ بہت ہی اخلاق ومحبت سے ملتے تھے علمی وفکری موضوعات پر ان سے گفتگو کرنے کا موقع میسر ہوا، ان کی تعلیم مقامی اور بیرونی بھی تھی، یورپ میں انہوں نے عصری تعلیم حاصل کی تھی، ان طرح وہ مذہبی فکر کے معاملات کو بھی سمجھتے تھے، اور عصر حاضر کے تقاضوں کو بھی جانتے تھے، اس سے ان میں جامعیت پیدا ہوئی تھی، ان کے تعلقات میں محبت اور موانست کا اظہار ہوتا تھا، ان کے انتقال سے ایسی خوبیوں والے شخص کا اپنے معاشرہ کو داغ مفارقت دینے پر وہاں کے اہل فکر کے درمیان ایک کمی پیدا ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کی خوبیوں کا اجر عطا فرمائے، اور ان سے جو خلا ہوا ہے، اس کو پورا فرمائے۔

ان کے ایک بھائی ابراہیم الحصین سعودی عرب کے سب سے بڑے عالم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کے سکریٹری رہے ہیں اور دوسرے بھائی سعد الحصین سعودی عرب کے تعلیمی محکمہ کے بڑے عہدے پر رہے ہیں، اور یہ سب بھائی دعوتی ذہن کے حامل ہیں، وہ اپنے دونوں بھائیوں کے مقابلہ میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے، اور ان کے انتقال سے جو کمی ہوئی ہے، اس کو بہت محسوس کیا جائیگا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو بلند درجات عطا فرمائے، اور پس ماندگان کو صبر کا اجر عطا فرمائے، آمین۔

استاذ صالح العشماوی

۱۳۳۹ھ ۱۹۱۱ء تا ۱۴۰۴ھ ۱۹۸۳ء

حال ہی میں مصر کی بڑی شخصیت صالح عشماوی نے وفات پائی، ان کا سانحۂ وفات عالم اسلام اورخاص طور پر عالم عرب کے لئے ایک بڑا سانحہ ہے جو ۱۹۸۳ء کو پیش آیا،ان کی وفات سے دعوت وفکر اسلامی اور صحافت وقیادت کے میدان میں وہ خلا پیدا ہوا ہے جس کا پُر ہونا آسان نہیں۔

استاذ مرحوم کی خصوصیات وامتیازات میں صحافت کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی وہ بڑی خدمت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، وہ ایک قائد شخصیت اور صحافت کے زعماء میں ان کا شمار ہوتا تھا، انہوں نے دعوت اخبار عربی میں نکالا، اوراس کے ذریعہ دعوت وفکر اسلامی کو تقویت پہنچانے کا کام کیا، مصر اور دوسرے عرب ممالک میں ''الدعوۃ'' کو جومقبولیت ملی اس کا اثر صرف عرب ممالک تک محدود نہیں رہا بلکہ غیر عرب ممالک میں اس کی گونج ہوئی اور اس کو دیکھ کر اسلامی وعربی صحافت کو بڑا فروغ ملا، ندوۃ العلماء سے ''الرائد''(۱) نکلنا شروع ہوا اس نے الدعوۃ کو ہی نمونہ بنایا تھا، اور پھر ''الرائد'' کی آواز

---

(۱) ۱۹۵۹ء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی ادارت میں ایک عربی پندرہ روزہ الرائد کے نام سے نکلنا شروع ہوا، جو اپنی خصوصیات و مقاصد میں البعث الاسلامی کا شریک ہے، اور اپنی ذمہ دارانہ اسلامی صحافت کے سبب وہ عالم اسلام میں وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، مدارس کے طلباء واساتذہ اس سے خصوصی استفادہ کرتے ہیں، اسلامی ذہنیت کو بنانے اور ادبی رجحان کو فروغ دینے اور نوخیز طلباء کی عربی بہتر بنانے میں یہ جریدہ لاجواب ہے، اس وقت مولانا وثیق ندوی صاحب استاذ ادب دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو کی توجہ اور بڑوں کی سرپرستی اسے حاصل ہے۔ (تاریخ ندوۃ العلماء)

دنیا کے مختلف حصوں میں پہنچنے لگی۔

استاذ صالح العشماوی مرحوم نے صحافت کے ذریعہ سحر انگیز طریقہ سے خدمت انجام دی، جس کے لئے ان کے افتتاحی مضامین شاہد عدل ہیں۔

استاذ صالح عشماوی نے مصر کے انقلاب اور اس کے پس منظر کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا، اور ان اسباب وظروف کو اچھی طرح سمجھا تھا جو اس کے محرک بنے تھے، اور جب یہ انقلاب شروع میں اصلاحی انقلاب چاہتا تھا تو اس کے مؤید اخوان بھی تھے اور خود استاد صالح عشماوی بھی اس کا استقبال کرنے والوں اور اس کے حق میں مضامین لکھنے والوں میں تھے، ان کا ایک افتتاحیہ جس نے ہم کو بہت متاثر کیا اس کا عنوان تھا" جیش باسل وشعب عظیم" اس افتتاحیہ نے ہم سب کو جو متاثر کیا تھا اس تأثر کو ہم لوگ بھول نہیں سکتے، اس میں ان کی حسن انشاء وتعبیر، ان کی فصاحت وبلاغت اور ادبیت ان کی حرارت ایمانی اور غیرت دینی وملی کے ساتھ ایسی جلوہ گر تھی جس کی مثال ملنی مشکل ہے، یہ کوئی پہلا اور آخری موقع نہیں تھا کہ انہوں نے کاغذ پر اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہو، ان کو اللہ نے قلب وقلم کی جو تاثیر دی تھی اس کے نمونے الدعوہ کے صفحات پر نظر آتے رہتے تھے، اسلام اور مسلمانوں کے لئے الدعوہ کو ایک سند وحجت کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی بعد میں جب سید قطب شہید بھی اس کے لکھنے والوں میں شامل ہوگئے اور الدعوہ کے پلیٹ فارم سے انہوں نے بھی صدائے حق بلند کرنی شروع کی تو اس کی مقبولیت میں اور زیادہ اضافہ ہوا، ان کا مضمون الرجل الابیض ان کے کتابی اسلوب کا شاہکار ہے جس میں انہوں نے مغربی تہذیب اور یورپین ڈپلومیسی کے پرخچے اڑائے ہیں جس کا ہدف اسلام اور مسلمان رہے ہیں۔

اخوان المسلمون نے اپنے اخبار کے لئے پھر سید قطب شہیدؒ کی خدمات حاصل کر لیں، اور پھر وہ اخبار بعض سیاسی حالات کی نظر ہوکر بند ہوگیا لیکن الدعوہ دین وملت کی خدمت کرتا رہا۔

استاذ عشماوی نہ صرف ایک بے باک اسلامی صحافی تھے بلکہ وہ اخوان المسلمون کے بڑے قائدین وزعماء میں سے ایک تھے، وہ مکتب الارشاد العالم کے ممبر بھی تھے، اور امام حسن البنا شہید کے اہم مساعد ودست راست بھی رہے تھے، آخر تک شیخ صالح العشماوی

اخوانی فکر کے مطابق کام کرتے رہے، حالانکہ بعد میں اخوانی رہنماؤں میں نظریاتی اختلاف بعض مواقع پر سامنے آیا، اوران میں شیخ صالح عشماوی زیادہ صالح فکر کے حامل نظر آئے ،اورانہوں نے تاعمراپنی صلاحیتوں کے ذریعہ دین وملت کی تقویت کا کام جاری رکھا، یہاں تک کہ داعی اجل کولبیک کہا، اوراپنے مالک حقیقی کے حضور حاضر ہوگئے جہاں ان کوان کی خدمات وحسنات کا صحیح صلہ مل رہا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ان کے مقام کو بلند فرمائے اور راضی ہو۔

معالی الشیخ محمد صالح القزاز

۱۳۲۱ھ ۱۹۰۳ء تا ۱۴۰۹ھ ۱۹۸۹ء

عظیم مرد صالح معالی الشیخ محمد صالح قزاز نے آخر جمادی الثانی کو نوے سال کی عمر میں وفات پائی اوران کارناموں اور خدمات کو اپنے پیچھے چھوڑا جو ہزاروں انسانوں میں کسی کسی کو نصیب ہوتے ہیں، حرمین شریفین کی توسیع کا جو عمل پہلی بار سب سے وسیع پیمانہ پر انجام پایا تھا وہ انہیں کی نگرانی میں ہوا، اور تحفیظ القرآن الکریم کے اداروں کو ان کے ذریعہ فروغ ملا، جب کہ مملکت میں اس کی طرف لوگوں کا رجحان بہت کم تھا، اس کے بعد لوگوں کا اس کی طرف بڑا رجحان بڑھا، اور تیسرا دائرہ خدمت رابطہ عالم اسلامی (۱) کے ذریعہ عالمی سطح پر تھا جس کے سب سے زریں عہد کے وہ جنرل سکریٹری تھے اور اس منصب سے پہلے ان کو اس کے ترجمان کی حیثیت حاصل تھی۔

شیخ صالح قزاز اصلاً حجازی تھے، اوران کا شمار مکہ معظّمہ کے عمائدین میں ہوتا تھا، اور سعودی عرب کے وزیر مالیات شیخ محمد سرور الصبان جو رابطہ عالم اسلامی کے پہلے جنرل سکریٹری قرار پائے تھے سے ان کا بڑا قرب رہا تھا اور اس کی وجہ سے ان کو خدمت کے اہم مواقع حاصل ہوئے، چنانچہ حرمین شریفین میں پہلے وہ مسجد نبوی کی توسیع کے مدیر کی حیثیت

---

(۱) رابطہ عالم اسلامی کا قیام ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۸ مئی ۱۹۶۲ء کو مکہ مکرمہ میں عمل میں آیا، یہ ایک سرکاری ادارہ ہے جو حکومت سعودیہ کی ماتحتی میں کام کرتا ہے، ایک زمانہ میں یہ بہت فعال ادارہ تھا اور اس کی بہت پکڑ تھی، لیکن مملکت میں غیر دینی عناصر کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ اس کو کمزور کرتا چلا گیا، اور اب یہ ایک رسمی ادارہ بن کر رہ گیا ہے، ہر سال یہ مختلف عناوین پر مجلس مذاکرہ منعقد کرتا ہے اور اس کے اراکین دنیا بھر سے اس میں شریک ہوتے ہیں

سے اور پھر حرم مکی کی توسیع کے مدیر کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ پھر رابطہ عالم اسلامی کے ذریعہ ان کا دنیا میں اچھا تعارف ہوا، ان کی شخصیت ایک موقر شخصیت تھی لیکن وہ اپنی منکسر المزاجی اور اخلاق کریمانہ سے لوگوں کا دل موہ لیتے تھے، اور لوگ ان سے مل کر ان کی محبت وعنایت سے محظوظ تھے اس طرح ان کے دلدادہ پورے عالم اسلام میں لوگ موجود ہیں۔

شیخ مرحوم صرف ایک فرد نہیں تھے وہ ایک پوری تحریک تھے جو عالم اسلام میں برپا تھی، ان کے ذریعہ اسلامی کاز کو پوری دنیا میں جو تقویت پہنچی اس میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔

خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے ان کے روابط ان کے پہلے یا دوسرے سفر حج سے قائم ہوگئے تھے اس وقت شیخ صالح قزاز مدیر الحج تھے، اور یہ تعلقات اتنے مستحکم تھے جو دونوں میں آخر وقت تک اسی طرح قائم رہے، اور خال معظم نے ان کی وفات سے قبل اپنے سفر مکہ معظّمہ میں ان سے ملاقات بھی کی تھی جس سے ساری پرانی یادیں تازہ ہوگئی تھیں، اور شیخ بہت مسرور ہوئے تھے، جس کے تین ماہ بعد شیخ صالح قزاز نے وفات پائی، آخر عمر میں شیخ صالح خلوت نشین ہوگئے تھے، اور اپنے ضعف وعلالت کی وجہ سے انہوں نے لوگوں سے ملنا جلنا بند کردیا تھا، لیکن خال معظم سے مل کر ان کو بڑی خوشی ہوئی اور انہوں نے بڑی تکریم ومحبت کا اظہار کیا جیسے پہلے وہ کیا کرتے تھے، کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ یہ آخری ملاقات ثابت ہوگی اور ان کی زندگی کے صرف اب تین مہینے ہی رہ گئے ہیں۔ چونکہ اس ملاقات میں میں بھی شریک تھا اس لئے مجھے بھی ان کی توجہ وعنایت حاصل ہوئی، جیسے پہلی ملاقاتوں اور گزشتہ سفروں میں جو خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ ان کی رابطہ عالم اسلامی کے جلسوں کی مناسبت سے ہوتے تھے ان کے مرافق کے طور پر حرم کی حاضری کی مجھے بھی بار بار سعادت حاصل ہوئی تھی۔

شیخ صالح قزاز نے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں، ان کو اللہ نے جن صفات وخصوصیات سے نوازا تھا اس میں سبھی کام کرنے والوں کے لئے بڑی نصیحت کا سامان ہے، غفر اللّٰہ له ورفع درجاته وندعو اللّٰه له باكرم جزاء على اعماله الحسنه.

شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری

۱۳۴۰ھ ۱۹۲۱ء تا ۱۴۱۰ھ ۱۹۸۹ء

۱۴/۳/۱۴۱۰ھ مطابق ۱۵/۱۰ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں یہ خبر نہایت رنج وغم کے ساتھ سنی گئی کہ دوحہ کے جلیل القدر عالم و بزرگ جناب عبداللہ ابراہیم الانصاری لندن میں وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم اپنی علمی جلالت شان اور قدیم علمی سرمایہ کی ازسرنونشر واشاعت سے گہری بلکہ عشق کی حد تک دلچسپی کے ساتھ ساتھ اپنی وضع قطع اور سادگی میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، سنت پر عمل کی دعوت اور خود عمل کا پورا اہتمام تھا اس وقت جب کہ منکرات سے چشم پوشی اور بہت سی غیر شرعی چیزوں کو نظر انداز کر دینے کا مزاج بن گیا ہے مرحوم ٹوکنے سے باز نہیں رہتے تھے، ایک جلسہ میں جس کی صدارت وہ خود فرما رہے تھے، مقررین کی تقریروں پر جب تالیوں کا سلسلہ شروع ہوا، جواب ایک عام بات ہوگئی ہے، شیخ نے فوراً ٹوکا کہ یہ ایک غیر شرعی فعل ہے، ایسا نہیں کرنا چاہئے یوں تو یہ ایک معمولی واقعہ ہے، لیکن اس سے شیخ کے دینی جذبات کا پتہ چلتا ہے اور سنت کے اہتمام کا جذبہ سامنے آتا ہے، حکومت قطر نے انھیں شعبۂ امور دینی کا ناظم بنایا تھا، اس کے بعد پھر ان کو ایک نئے شعبہ کی تشکیل کر کے اس کا سربراہ مقرر کر دیا گیا، تاکہ ان کی علمی صلاحیت سے زیادہ مطابقت رہے، یہ شعبہ تھا ''اسلامی ثقافتی سرمایہ کی حفاظت ونشر واشاعت'' پھر وہ اس شعبہ کے تاحیات ناظم رہے، ان کے رہن سہن کا انداز بہت سادہ تھا ایک سے زیادہ باران کے دولت کدہ پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، ہر بار یہ

محسوس ہوا کہ دینی کاموں کے کارکنوں کے ساتھ وہ کس قدر محبت واکرام کا معاملہ فرماتے تھے، اور تعاون کی جو بھی صورت ممکن ہوتی تھی اس میں ان کو کوئی باک نہ ہوتا تھا۔

سنت کا اہتمام اور سیرت نبوی کو اپنانے کی دعوت سے ذوق وشغف ان پر اتنا غالب تھا کہ سیرت نبوی پر اپنی مملکت میں زبردست عالمی کانفرنس منعقد کی اور حکومت نے پوری دریادلی کے ساتھ اس میں تعاون کیا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (جن کی ذات سے شیخ کو والہانہ تعلق ومحبت تھی) کو بڑے اہتمام سے بلایا نہ صرف بلایا بلکہ اس موقع پر حضرت مولاناؒ کی کتاب ”السیرة النبویة“ کو بڑی تعداد میں چھپوا کر تقسیم کرایا، حضرت مولاناؒ کے والد ماجد مولانا عبدالحیؒ مولانا نے اپنی مختصر زندگی میں کتاب ”تهذيب الاخلاق“ (۱) کو بھی بڑے اہتمام سے شائع کیا اور تقسیم فرمایا، علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبیؐ کے عربی ترجمہ کا منصوبہ بنایا اور اس کے پورے اخراجات کی ذمہ داری لی، ندوۃ العلماء اور اس کی سرگرمیوں سے ان کو بہت گہرا تعلق تھا، ادب اسلامی کا پہلا جلسہ جو ندوۃ العلماء میں ہوا، اور جس میں عالم عربی کے چوٹی کے لوگ شریک ہوئے اس میں شیخ بھی تشریف لائے اور ”ادب التربية“ کے عنوان سے ایک وقیع مقالہ پڑھا، شیخ پورے بلاد عربیہ میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اور ان کی بات کو وزن حاصل ہوتا تھا، وہ عالم اسلام

---

(۱) یہ کتاب اصلاً ”تلخيص الاخبار“ کے نام سے صحاح کی احادیث پر مشتمل ”الادب المفرد“ اور ”رياض الصالحين“ کے طرز کی کتاب مبتدیوں اور متوسطوں کے لیے مولانا نے مرتب کی تھی، مولانا کی بڑی خواہش تھی کہ وہ علوم حدیث کے لیے یکسو ہو کر حدیث کا درس دیں، لیکن زندگی میں اس کا موقع نہ آسکا لیکن یہ کتاب حضرت مولانا علی میاں نے چھاپ کر ان کی اس خواہش کی تکمیل کی کہ آج یہ کتاب مدارس اسلامیہ کے نصاب میں شامل ہے، اصلاح نفوس وفضائل اعمال پر مشتمل ۱۶۳۶ احادیث کو الگ الگ عناوین قائم کر کے ترتیب دیا ہے، رمضان میں اس کتاب کا درس بھی دائرہ شاہ علم اللہ کی مسجد میں ہوتا ہے، جس میں معتکفین اور رمضان گذارنے کے لیے آنے والوں کی بڑی تعداد شریک مجلس ہو کر استفادہ کرتی ہے، مولانا نے اس کی شرح ”منتهى الافكار في تلخيص الأخبار“ کے نام سے کی تھی، وہ ان کے محفوظ اوراق میں اسی طرح چلی آرہی تھی، ابھی کچھ عرصہ پہلے انہی کے پڑپوتے مولانا بلال عبدالحی حسنی نے اپنی تحقیق وتعلیق کے بعد ”تنویر الآفاق“ کے نام سے اس کو شائع کیا، اس کے علاوہ مدینہ یونیورسٹی کے فاضل اور ندوۃ العلماء کے استاد مولانا ابو سحبان روح القدس نے بھی ”روائع الاعلاق“ کے نام سے اس کی شرح کی ہے۔

میں اسلامی موضوعات پر ہونے والی مختلف کانفرنسوں میں شریک ہوتے تھے، اور پیرانہ سالی کے باوجود سفر کی مشقت برداشت کرتے تھے، انہوں نے مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہاں عرصہ تک مقیم رہے۔(۱)

(۱) مکہ مکرمہ میں واقع مدرسہ صولتیہ کا شمار جزیرہ عرب کے قدیم ترین مدارس میں ہوتا ہے، اسے ہندوستان کے معروف عالم دین مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے ۱۸۷۳ء میں قائم کیا تھا، مدرسہ صولتیہ کے قیام سے قبل مکہ میں مولانا رحمت اللہ کی سرپرستی میں محدود پیمانے پر قرآن کریم کی تعلیم کا انتظام تھا، بعدازاں صولت النساء نامی ایک ہندوستانی خاتون نے باقاعدہ مدرسہ کے قیام کے واسطے زمین خرید کر عطیہ کردی، اسی نسبت سے مدرسہ کو صولتیہ کا نام دیا گیا۔ یہ مدرسہ محلہ شبکیہ میں تعمیر کیا گیا اور افتتاحی تقریب میں مکہ کے علماء اور بعض اہم شخصیات نے شرکت کی، ۲۰۱۰ء تک اسی جگہ قائم رہا یہاں تک کہ حرم مکی کی توسیع کے سبب اسے مکہ کے جنوب میں الککعیہ میں جگہ ملی، مدرسہ صولتیہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ سے علوم دینیہ کی اشاعت کا مرکز بنا ہوا ہے، سلطان عبدالحمید اپنے زمانہ میں ان کی مالی اعانت کرتے تھے، اسی طرح سعودی حکومت کے بانی ملک عبدالعزیز نے اسے ملک سعودیہ کا جامع ازہر قرار دیا تھا، اس وقت اس کے موجودہ ذمہ دار مولانا ہشیم ماجد مسعود صاحب ہیں۔

شیخ عبدالبدیع السید صقر

۱۳۳۵ھ ۱۹۱۷ء تا ۱۴۰۷ھ ۱۹۸۶ء

دبئی سے قاری عبدالحمید ندوی صاحب نے یہ افسوس ناک اطلاع دی کہ ممتاز عالم وداعی شیخ عبدالبدیع السید صقر ایک سڑک حادثہ میں محاضرہ دے کر واپس ہوتے ہوئے مصر میں وفات پاگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون.

یہ اندوہناک حادثہ ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ کے پہلے ہفتہ میں پیش آیا، شیخ عبدالبدیع امام حسن البنا شہید کے تربیت یافتہ اوران کی دعوتی سرگرمیوں میں حصہ لینے والوں میں صف اول کی شخصیات میں تھے، اور پوری دنیا میں اسلامی بیداری لانے کا ان میں وہ درد وفکر پایا جاتا تھا جو کمیاب ہے، اسلامی فکر کے حامل لوگوں سے ان کو قربت رہی، اوراسی وجہ سے امام حسن البنا کی صحبت ورفاقت بھی انہوں نے اختیار کی تھی اوران کی شخصیت اورذاتی زندگی پر امام حسن البناء کی گہری چھاپ تھی، اوروہ ایک نہایت مخلص اوردردمند داعی اورربانی عالم کے طور پر دیکھے جاتے تھے، حکومت قطر نے ان کی قدر کی اورشیخ احمد علی الثانی (۱) حاکم قطر ان کو دل سے چاہتے اوران پر پورا اعتماد کرتے تھے، دارالکتب القطریہ کا ان کوذمہ دار (مدیر)

---

(۱) احمد بن علی الثانی ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے، ۱۹۶۰ء میں ان کو قطر کی حکومت حاصل ہوئی اورانہی کے زمانے میں پہلے پٹرول کے کنویں کا انکشاف ہوا، اور برطانوی قبضہ سے مکمل آزادی کا اعلان ۱۹۷۱ء میں انہی کے دور صدارت میں ہوا، ان کے دور میں کئی نئے منصوبے روبہ عمل آئے، قطری ریال کا اجراء انہوں نے ہی کیا، اسی طرح ۱۹۶۸ء میں قطر ریڈیو کا افتتاح عمل میں آیا، اوراس کے دوسال بعد قطر ٹیلویژن چینل بھی لانچ ہوا، ۱۹۷۲ء میں ان کو تخت سے دستبردار ہونا پڑا، اور ۱۹۷۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

بنادیا تھا جس کے ذریعہ وہ اسلامی و دینی، علمی میراث کی تقسیم وتوزیع اورنشر واشاعت کا کام حکومت کے حساب میں کرتے تھے،اوراس کے ذریعہ سے انہوں نے کافی کتابیں اسلامی موضوعات پر طبع کرائی،اوردنیا بھرمیں اس کو پھیلانے کا کام کیا،بعدمیں بعض سیاسی حالات ومجبوریوں کی بناپر سموالشیخ احمدعلی آل ثانی حاکم قطر کوقطر سے دبئ منتقل ہونا پڑا تو شیخ نے بھی قطرکوالوداع کہا،اورپھردبئ کوانہوں نے اپنی دینی وعلمی نشاطات وسرگرمیوں کا مرکز بنایا،اور ایک تعلیمی ادارہ بھی مدرسۃ الایمان کے نام سے قائم کیا،اس سے عرب امارات میں اسلامی تعلیم وتربیت کو بڑا فروغ ملا جس کی کمی بہت محسوس کی جارہی تھی،اورنئ نسل کی تربیت و اصلاح کے لیےایک مرکزی حیثیت اس کوحاصل ہوئی،ان کواللہ نے اچھی اولاددی اورخوب نعمتوں سے نوازاوہ اس پراللہ کا بڑاشکراداکرتے اوردین کی خدمت کے لئے انہیں جومواقع ملے اس پربھی وہ اللہ کے بڑے شکرگزارہوتے تھے،اوردینی فکر کی ترویج کا کوئی موقع ان کو میسرہوتاتواس کوضروراستعمال کرکےاسلامی فکرکوپہونچانے کا کام کرتے۔

حضرت مولاناسیدابوالحسن علی ندوی سے ان کو بڑاتعلق تھااور یہ تعلق نہایت مخلصانہ اوردل کی گہرائیوں سے تھاجسے ان کے ملنے والے صاف طورپرمحسوس کرتے تھے،اسی طرح ان کوحضرت مولانااورندوۃ العلماء سے دعوتی،فکری اورتعلیمی نظریات میں پوری مناسبت اور ہم آہنگی تھی،جس کا وہ اظہاربھی کرتے، وہ ندوۃ العلماء۱۹۸۱ء-۱۴۰۱ھ میں تشریف لائے اوراس کی بین الاقوامی ادب اسلامی کانفرنس میں بھی شرکت کی، اورہوٹل میں رہناپسندنہ کیا بلکہ ندوۃ العلماءمیں حضرت مولاناکےقریب رہنےکواختیارکیا،اورظاہری وجسمانی راحت پر باطنی راحت کوترجیح دی، اس طرح ہم لوگوں کوان سے استفادہ کابھی اچھاموقع ملا،اوران میں وہ صفات وخصوصیات محسوس کیں جوایک مومن کامل میں ہونی چاہئیں۔

وہ اصلاً مصری تھے صقرگاؤں میں پیدا ہوئے، اورکلیۃ الآداب قاہرہ سے سند حاصل کی، وہ ایک فصیح البیان خطیب، پُرجوش داعی، ممتازمفکراورکثیرالتصانیف عالم ومصنف تھے،اسلامی اخلاق وصفات کے حامل اورامت کے لیے دردوسوزرکھنے والے تھے،ان کی

دعوت کے موضوع پر اہم کتاب "کیف ندعو الناس" ہے جو علماء، دعاۃ اور طلبہ واساتذہ سبھی کے لئے رہنما کتاب ہے، حدیث کے موضوع پر مختار الحسن والصحیح من الحدیث الشریف ہے، نقد وادب پر "نقد لقصیدۃ البردۃ للبوصیری" ہے اور حجاج کی رہنمائی کے لئے "مرحلۃ الحج ومایلزمھا"، قرآن مجید کے موضوع پر "التجوید وعلوم القرآن" ان کی تصنیفات ہیں۔

ان کی وفات کا حادثہ دعوت وفکر اسلامی اور تعلیم وتربیت کے حلقوں کے لئے ایک بڑا سانحہ ہے جو ایک بڑے خلا کے طور پر محسوس کیا جاتا رہے گا۔

استاذ عبد العزیز الرفاعی

۱۳۴۲ھ ۱۹۲۳ء تا ۱۴۱۴ھ ۱۹۹۳ء

کچھ دنوں پہلے عالم اسلام اور خاص طور پر عالم عربی عظیم اسلامی شخصیت استاذ عبدالعزیز الرفاعی کی وفات کے صدمہ سے گزرا، وہ سعودی عرب کی مجلس الوزراء کے امین العام کے منصب پر رہ چکے تھے، اور دوسرے اہم سرکاری مناصب ان کو حاصل ہوتے رہے لیکن سیاست میں اس اہمیت و مشغولیت کے باوجود علم وادب سے تعلق انہوں نے کمزور ہونے نہ دیا، اوران کا شمار اعلام ادب میں ہوتا تھا، رابطۂ ادب اسلامی کا جب قیام عمل میں آیا تو اس کی انہوں نے پوری تائید کی اور تقویت پہنچائی اور اعزازی رکن بھی منتخب ہونا منظور کیا، ریاض میں اپنے مستقر پر وہ ادبی مجلسیں، سیمینار وغیرہ منعقد کرتے اور علم وادب اور ثقافت میں نمایاں مقام رکھنے والوں کو مدعو کرتے، اور وہ لوگ اپنی شرکت مقالات کے ساتھ کرتے، اس طرح ادب کو فروغ دینے میں ان کا اہم کردار رہا، اوران کی منزل نے ادبی عکاظ کی حیثیت کر لی تھی، کہ وہ اہل علم وادب کا اجتماع گاہ بن گئی تھی، ادب کے ذریعہ اسلامی رجحان کے فروغ کو تقویت پہنچانے والے کاموں اور اداروں کے ساتھ وہ نہ صرف اظہار قدردانی کرتے بلکہ خود بنفس نفیس اپنی شرکت سے عملی تعاون پہنچاتے، چنانچہ جب ندوۃ العلماء نے ۱۴۰۱ھ میں لکھنؤ میں پہلی اسلامی ادبی مؤتمر بلائی تو اس میں بھی وہ شریک ہوئے، اس مؤتمر کی خصوصیت تھی کہ اس میں ایک حصہ عربوں اور عربی زبان کے لئے خاص تھا اور دوسرا حصہ غیر عربی زبانوں اور انگریزی وغیرہ کے لئے تھا، استاذ عبدالعزیز الرفاعی عربی سیکشن کے لئے مقرر عمومی تھے جس میں زیادہ مقالات پیش

کیے گیے۔ ادب اسلامی کی اس عالمی کانفرنس نے ایک کمیٹی تشکیل دی اس کے تین نائب صدر منتخب ہوئے تو استاذ عبدالعزیز الرفاعی ان تین میں ایک تھے، یہی کمیٹی عالمی رابطہ ادب اسلامی کی تشکیل کی محرک ہوئی اور مکہ مکرمہ میں عالمی رابطۂ ادب کا قیام عمل میں آیا۔

استاذ عبدالعزیز الرفاعی کا حادثہ وفات ہم سب کے لئے ایک بڑے صدمہ کی خبر لےکر آیا، اور ہم سب نے ادب اسلامی کے سالاروں میں ایک سالار کے جدا ہونے کی حیثیت سے اس خبر کو سنا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی بھی اس حادثۂ وفات سے بڑے متاثر ہوئے اور استاذ مرحوم کے لئے اظہار افسوس کے ساتھ اپنا تعلق ظاہر کرتے ہوئے ان کے نیک اعمال کی قبولیت اور مغفرت و رفع درجات کی دعا کی۔

استاذ عبدالعزیز الرفاعی اپنی خوش خلقی اور خوش مزاجی کے ساتھ باوقار شخصیت کے طور پر ایک بڑے ادیب اور اسلامی دانشور کے طور پر معروف تھے، انہوں نے ترییتی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا جس میں وہ اسلوب نگارش میں اچھوتا انداز رکھتے ہیں، ان کی اہم کتابوں میں: ١۔الرسول كأنك تراه، ٢۔حديث أم معبد، ٣۔الحج في الأدب العربي، ٤۔يوميات مئذنة مكية، ٥۔ خولة بنت الأزد، ٦۔ من عبدالحميد، مكاتب الى المؤظفين، ٧۔ توثيق الارتباط بالتراث الاسلامي، ٨۔ زيدالخير، ٩۔ ام عمارة الصحابية الباسلة، ١٠۔ أرطاة السهمي، ١١ظلال وأغصان، ١٢۔ رحلتي من المكتبات، ١٣۔رحلتي مع التأليف، ١٤۔ أعلام العلماء، ١٥۔ الاعلام ببناء المسجدالحرام. ہیں۔

استاذ رفاعی مجلّہ ''العربیۃ'' کے مشرف، رابطۂ عالم اسلامی کے بنیادی رکن، المجلس الاعلى للاعلام کے رکن، مجمع اللغۃ العربیۃ مصر کے رکن تھے اور اخیر میں ۱۴۱۴ھ میں مجلس شوریٰ سعودی عرب کی بھی رکنیت کا اعزاز حاصل ہوگیا تھا لیکن اسی سال انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے رب کے جوار رحمت میں پہنچ گئے۔

کلید بردار کعبہ شیخ عبدالعزیز شیبیؒ

۱۳۴۶ھ ۱۹۲۷ء تا ۱۴۳۱ھ ۲۰۱۰ء

کعبہ کے کلید بردار اور خادم شیخ عبدالعزیز شیبی تقریباً ۸۳ سال کی عمر میں یکشنبہ کے روز یکم ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ مطابق ۷ نومبر ۲۰۱۰ء کو وفات پا گئے، ان کی وفات غلاف کعبہ کی تبدیلی کا عمل انجام پانے سے قبل قلبی دورہ میں ہوئی، جبکہ بیماری اور سینہ کی تکلیف میں کئی سالوں سے مبتلاء تھے، انتقال جدہ کے انٹرنیشنل اسپتال میں ہوا جہاں علاج کے لیے لے جائے گئے تھے، شیخ نے ساری زندگی بڑے حسن وخوبی کے ساتھ کعبہ اور حرم شریف کی خدمت انجام دی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے، آمین۔

شیبی صاحب نے حضرت مولانا کے اکرام میں ایک موقع پر کعبہ کا دروازہ کھولا تھا، اور مولانا اور ان کے رفقاء کو اندر جانے اور نماز پڑھنے کی سعادت مہیا کی تھی البتہ اس موقع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے ساتھ یہ خصوصیت برتی کہ ان کی خدمت میں کلید کعبہ پیش کیا کہ وہ اپنے دست مبارک سے تالا کھولیں، حالانکہ یہ خصوصیت صرف شیبی صاحب کی رہی ہے، اور یہ کام ان ہی کی مرضی پر ہوتا ہے کہ کب کھولیں اور کس کے لیے کھولیں، حضرت مولانا کی ملاقات چوں کہ شیبی صاحب سے پہلے سے تھی، اور وہ تعلق سے ملے بھی تھے، اس موقع پر عالم اسلام کی چیدہ چیدہ شخصیتیں جمع تھیں اور کعبہ مشرفہ میں جو اندرونی طور پر تعمیر جدید کا کام مکمل ہوا تھا، اور تعمیر کی تجدید کے بعد اس کے افتتاح کا بھی موقع تھا، اس لیے اس کی شہرت بھی بہت ہوئی، اس واقعہ کو مولانا نے کاروان زندگی

میں بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''رابطہ کے جلسہ میں مکہ مکرمہ حاضری کا موقع ملا، اس کا افتتاحی جلسہ بروز دوشنبہ ۶ شعبان ۱۴۱۷ھ ۱۶ دسمبر ۱۹۹۶ء کو منعقد ہوا، ڈائس پر صرف پانچ نشستیں تھیں جن میں مملکت سعودیہ کے مفتی اعظم اور دینی رہنما شیخ عبدالعزیز بن باز، صاحب السمو الملکی الامیر ماجد بن عبدالعزیز، معالی الدکتور عبداللہ بن صالح جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی، راقم الحروف اور آخر میں استاد میں کامل الشریف شامل تھے، مجلس کا آغاز تلاوت قرآن شریف سے ہوا، پھر عالی مرتبت امیر ماجد بن عبدالعزیز نے خادم الحرمین الشریفین ملک فہد کا پیغام اور بیان پڑھ کر سنایا، پھر سماحۃ الشیخ بن باز نے خطاب کیا، جس میں مساجد کے مرتبہ و مقام اور خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی، اور حرمین شریفین کا ذکر کرتے ہوئے حکام و علماء کے فرائض و ذمہ داریاں بیان کیں، پھر جنرل سکریٹری صاحب کا خطاب ہوا، اس کے بعد راقم کو اس محترم مقام اور اس موقر مجلس کو خطاب کرنے کا شرف حاصل ہوا راقم نے آیت قرآنی:

فِيْ بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَن تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ يَخَافُونَ يَوْماً تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ

''وہ ایسے گھروں میں جن کے لیے اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے، اور ان میں اس کا نام لیا جائے، ان میں وہ لوگ صبح و شام اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں ایسے لوگ جنہیں نہ تجارت غفلت میں ڈال دیتی ہے، نہ خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے غافل کرتی ہے، وہ ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس دن نگاہیں اور دل پتھرا جائیں گے۔''

اس آیت کو پڑھ کر اپنی تقریر کا آغاز کیا، اور مساجد کا مقام، مقصد و غایت اور

دوسرے مذاہب کے معابد کے مقابلہ مین ان کے امتیاز توحید خالص، عبادت رب واحد، دنیاوی اغراض ومقاصد سے بعد اور معابد اقوام وملل کے مقابلہ میں ان کے امتیاز پر روشنی ڈالی، اوراس یہ بھی کہا: کہ انہیں امتیاز وتفردات میں نسلی قومی، وطنی، نسبی اور مادی ومنصبی تفاوت وامتیاز سے صرف نظر بھی شامل ہے، وہاں عربی وعجمی میں کوئی فرق نہیں، کسی شہرو دیاراورنسل ونسب کا آدمی امامت بھی کرسکتا ہے، اور خطاب بھی، اس کا نتیجہ تھا کہ مسجد نبوی میں اذان کے منصب رفیع پر بلال حبشیؓ فائز تھے، جن کی شہرت وعزت آج تک اسی حیثیت سے ہے، اوراسی کا ایک نمونہ یہ ہے کہ عالم عربی وعالم اسلامی کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے مؤقر وفود اور فاضل نمائندوں کے سامنے اور حرم شریف کے حدود میں ایک ہندی کو خطاب کرنے کا موقع اور عزت دی جارہی ہے، اس خطاب کی برجستگی اور روانی میں صاف طریقہ پر تائید الٰہی، موضوع اور مقام کی عظمت وبرکت کا احساس ہورہا تھا، مجلس کا یہ جلسہ سہ روزہ تھا جو ۶، ۷، ۸ر شعبان تک جاری رہا، آخری دن ارکان اور شرکائے جلسہ کو دخول کعبہ کا پروانہ یا اجازت نامہ لکھ کر دیا گیا، راقم فضل خداوندی سے یہ شرف کئی بار حاصل کرچکا تھا، پھر اپنے ضعف اور نقل وحرکت کی دشواری کی بناء پر اور یہ خیال کر کے کہ اس تقریب سے مجمع بہت ہوگا، اور وقت بھی صبح ساڑھے چھ بجے کا تھا، جو دواؤں کے استعمال کا وقت ہے، راقم کواس وقت حرم شریف کی حاضری اوراس شرف کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد میں تامل تھا، لیکن پھراس کی ہمت کرلی گئی کہ یہ شرف روز روز نہیں ملتا، اور زندگی اور صحت ومصروفیات کا کچھ اعتبار نہیں۔

راقم اپنے رفقاء بھائی عثمان صاحب، حاجی عبدالرزاق صاحب اور عزیزی بلال کے ساتھ حرم شریف میں حاضر ہوگیا، وہ پہلے بیت اللہ شریف سے کچھ دور کھڑا رہا، پھر داخلہ کے مشتاق ومنتظر مجمع میں شامل ہوگیا، اس کو برابر خیال رہا کہ اس اژدہام اور ادب واحترام کے مقام میں وہ کیسے یہ سعادت حاصل کرسکے گا، اچانک کلید بردار کعبہ شیبی صاحب آئے، اورانہوں نے راقم کواشارہ کیا کہ وہ زینہ پر چڑھے، راقم اوپر پہونچا توانہوں نے کلید کعبہ در

کعبہ پر رکھ دی اور اشارہ کیا کہ میں دروازہ کھولوں، راقم نے یہ شرف حاصل کیا اور بیت اللہ میں پہلے داخل ہوا، (بیت اللہ شریف کی بہت دنوں سے صفائی اور کچھ تعمیری کام کا سلسلہ جاری تھا، ایک طویل عرصہ تک ایک سمت میں باہر غلاف بھی لگا ہوا تھا، ایک ہی دن پہلے ملک فہد کے چھوٹے بھائی اور سابق بادشاہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے کعبہ میں داخل ہوکر اندر کی صفائی اور دھلائی کی تھی اب اس ۸ شعبان کو عمومی داخلہ کا انتظام کیا گیا تھا،) وہاں شاہ سعود کے پوتے سموالامیر مشعل بن محمد بن سعود نے راقم سے کہا کہ دعا کیجئے، راقم نے اپنی بساط کے مطابق یہ شرف بھی حاصل کیا، جس میں داخل ہونے والوں کا مجمع شامل تھا، یہ شرف وسعادت جو اس ناچیز گنہ گار کو حاصل ہوئی اس کا مقابلہ دنیا کے بڑے بڑے اعزاز نہیں کرسکتے۔ وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء"

شیخ عبدالقادر نورولی

۱۳۱۶ھ ۱۸۹۶ء تا ۱۳۹۸ھ ۱۹۷۸ء

جدہ کی سرکردہ شخصیات میں ایک شخصیت شیخ عبدالقادر محمد نور عبدالغنی محمد نور ریاض میں جمعہ کو چاشت کے وقت ۲۴ / ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ کو ۸۲ سال کی عمر میں وفات پاگئے اور ان کی تدفین مکہ معظّمہ میں عمل میں آئی۔

شیخ عبدالقادر نورولی سعودی عرب میں نورولی خاندان کے اس وقت سرپرست تھے، یہ جدہ کی سوسائٹی میں بڑے احترام اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ان میں جو اخلاقی، سماجی خصوصیات وصفات تھیں ان کے ان صفات سے لوگ قریب ہوئے اور مستفید ہوئے۔

شیخ عبدالقادر نورولی کا خاندان حجاز گجرات (ہندوستان) سے منتقل ہوا تھا اور تجارت ان لوگوں کا خاندانی مشغلہ ہے جس میں وہ مملکت میں اپنی امانتداری اور دیانت وسچائی کی صفت سے معروف ہوئے اور ان کا کاروبار مملکت میں وسعت اختیار کرتا گیا، اور پورے سماج میں اس خاندان کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

شیخ عبدالقادر نورولی ایک باوقار اور بھاری بھرکم شخصیت تھے، اور وہ اپنے وطن گجراتی خصائص کے ساتھ حجازی خصائص سے بھی متصف ہوگئے تھے اور دونوں خصوصیات کو انھوں نے اچھے طریقے سے جمع کیا تھا، اس کے ساتھ وہ بڑے علم دوست اور علماء ومشائخ کے قدرداں اور اعمال خیر اور دعوت ودینی کاموں میں بڑی فراخدلی سے خرچ کرنے والے تھے، اور یہ صفت اس پورے خاندان میں مشترک صفت ہے جس کے وہ سرپرست تھے۔

شیخ عبدالقادر نورولی نے مدینہ منورہ میں ایک عوامی مسجد اپنے خرچ پر تعمیر کرانی شروع کی تھی جو قریب التکمیل ہے، ان کو خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بڑا مخلصانہ تعلق تھا، اور وہ جدہ میں انہی کے مہمان ہوتے تھے، اسی طرح مدینہ منورہ کا قیام بھی ان کے یہاں بستان نورولی میں ہوتا، اور وہ ایک بڑے ہی فدائی میزبان کی طرح پیش آتے، اور ہم سب کو ان کی شفقت حاصل ہوتی۔ سعودی عرب میں وہ ان کے اور ندوۃ العلماء کے ترجمان بنے رہتے۔

یہ سانحہ صرف ان کے خاندان کا نہیں بلکہ ہم لوگوں کے لئے بھی کسی خاندانی حادثہ سے کم نہیں ہے۔ ہم ان کے صاحبزادگان و پسماندگان خصوصاً الحاج محمد نور عبدالقادر اور الحاج عبدالرحمٰن اور سبھی افراد خاندان و متعلقین کو دلی تعزیت پیش کرتے ہیں اور شیخ مرحوم کے لئے دعائے مغفرت و رضوان کرتے ہیں۔

قاری عبدالماجد ذاکرؒ

۱۳۵۳ھ ۱۹۳۴ء تا ۱۴۳۲ھ ۲۰۱۰ء

امام القراء قاری عبدالمالکؒ کے صاحبزادہ قاری عبدالماجد ذاکر (صدر مدرس جمعیۃ تحفیظ القرآن الکریم، ریاض) کا ۷۶ سال کی عمر میں ۷ مئی ۲۰۱۰ء کو کنگ فہد میڈیکل یونیورسٹی ریاض میں انتقال ہوگیا، عصر بعد مسجد الراجحی میں نماز جنازہ ہوئی، اور نسیم قبرستان میں تدفین ہوئی، آپ نے ۱۳۶۹ھ میں مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں حفظ وقرأت مکمل کر کے سند لی تھی، ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں اپنے والد اور دیگر اہل خانہ کے ساتھ پاکستان ہجرت کر گئے جہاں اپنے والد قاری عبدالمالک علیہ الرحمۃ سے روایت حفص اور پھر قرأت سبعہ کی سند حاصل کی اور اس دوران لاہور کے مختلف مدارس میں دینی تعلیم حاصل کی، جامعہ اشرفیہ میں عالم دین مولانا محمد تقی عثمانی کے ہم سبق رہے، اور زندگی بھر قرآن مجید کی خدمت میں مصروف رہے۔

قاری ذاکر صاحب سے میری ملاقاتیں رہیں، انہوں نے سعودی عرب میں علم قراءت کو خوب فروغ دیا اور ان کے شاگردوں میں بعض حرم شریف میں منصب امامت پر بھی فائز ہوئے، قاری صاحب کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور ندوۃ العلماء سے بڑا تعلق تھا اور وہ البعث الاسلامی، الرائد، تعمیر حیات وغیرہ کو بھی شوق سے پڑھتے اور ندوہ کی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالمنعم النمر مصری

۱۳۳۱ھ ۱۹۱۳ء تا ۱۴۱۱ھ ۱۹۹۱ء

ماہ ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ کے تیسرے ہفتہ میں معروف اور جلیل القدر مصری عالم اور مشہور مصنف و محقق اور اسلامی مؤرخ ڈاکٹر عبدالمنعم النمر سابق وزیر اوقاف مصر نے ایک اچھی علمی مشغولیت اور نمایاں سماجی وسیاسی خدمات کے ساتھ زندگی گزار کر رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

وہ مصر کے علاقہ دسوق میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پھر ثانوی دینی تعلیم دسوق میں پھر تعلیم عالی جامع ازہر قاہرہ میں حاصل کی اور ازہر میں ہی وہ استاد مقرر ہوگئے، پھر انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور ڈاکٹریٹ کا موضوع ہندوستان کی عظیم وعبقری شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت تھی، ان کا مقالہ عربی میں تھا لیکن وہ بعد میں اردو میں منتقل ہوا اور ہندوستان میں بھی اس کی بڑی پذیرائی ہوئی حالانکہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت پر ہندوستان میں اہم سے اہم کتابیں تصنیف کی جاچکی ہیں اور حکومت ہند کی طرف سے اس کے لئے مختلف ادارے بھی قائم ہیں، وہ حکومت مصر کی طرف سے ہندوستان کے لئے مبعوث کرائے گئے تھے اور انہوں نے ہندوستان کے معروف بین الاقوامی شہرت کے حامل ادارے دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان وادب کی تعلیم دی اور لوگوں کو خوب مستفید کیا، انہیں ہندوستان کی تاریخ سے بھی دلچسپی بڑھ گئی تھی اور انہوں نے ہندوستان میں مسلم حکمرانی پر عربی میں ”تاریخ المسلمین فی الهند“ کے نام سے

کتاب بھی لکھی، ان کی یہ کتاب ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر بڑی تحقیقی کتاب ہے جس میں انہوں نے کتابوں اور اشخاص سے مدد لے کر ایک جلد میں وہ مواد فراہم کردیا ہے جو کئی جلدوں کا ہے۔

ڈاکٹر عبدالمنعم النمر ہندوستان میں لمبا علمی وقت گزرنے کے بعد مصر واپس تشریف لے گئے لیکن یہاں کی شخصیات اور علماء سے رابطہ قائم رکھا، ان کا یہ رابطہ علمی، ثقافتی، ادبی تھا، خاص طور سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے ان کا یہ رابطہ تھا اس طرح ان کو ہندوستان سے اور ہندوستان کی شخصیات سے انس ہوگیا اس سے ان کو ہندوستان آنے پر پھر آمادہ کیا، اوران کے یہ دوسفر پھر ہوئے، ہندوستان کے قیام اور سفروں میں وہ ندوۃ العلماء بھی تشریف لائے۔ایک بار مصر کے شہرۂ آفاق قاری شیخ عبدالباسط (۱) الصمد ہندوستان کے دورے پر آئے اور ندوۃ العلماء بھی آئے تو ہمارے یہ ڈاکٹر عبدالمنعم النمر بھی ساتھ تھے۔

ڈاکٹر عبدالمنعم النمر کو دینی علوم میں رسوخ حاصل تھا اور وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنی ان خصوصیات سے لوگوں کو مستفید کرتے تھے، اسی طرح محاضرات کے ذریعہ بھی ان کا فیض عام ہوا تھا، وہ مصر کے اخبارات میں بھی لکھتے تھے اور اسلامی صحافت کو فروغ دینے میں بھی ان کا بڑا حصہ ہے، کویت سے مجلۃ الوعی الاسلامی، ابوظہی سے مجلّہ ''منارالاسلام'' ان کی سرپرستی میں نکلا۔

وہ ایک صائب فکر کے حامل شخصیت تھے اور جنگ خلیج میں ان کا جو موقف سامنے

---

(۱) عبدالباسط عبدالصمد ۱۹۲۷ء میں قنا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے شیخ محمد امیر سے قرآن حفظ کیا، استاد محمد سلیم حمادہ سے قرائت سیکھی، مصری ریڈیو میں ۱۹۵۱ء میں آئے، اور سب سے پہلے ریڈیو پر سورہ فاطر کی تلاوت کی، مسجد امام شافعی میں قاری مقرر ہوئے، اور پوری دنیا میں اپنی نادر تلاوت سے انہوں نے شہرت حاصل کی، وہ اپنی بیماری کے سبب لندن علاج کے لیے گئے تھے لیکن جب ان پر ظاہر ہوا کہ اب مرض لاعلاج ہوچکا ہے، تو مصر واپسی اختیار کی، اپنے پیچھے انہوں نے بہت ساری نادر تلاوت قرآن اور تجوید قرآن کی ریکارڈنگ چھوڑی، ان کا انتقال ۱۹۸۸ء میں ہوا۔

آیا وہ ایسے حالات میں سامنے آیا جب وہ جنگ خلیج سے پہلے عراقی صدر صدام حسین کی دعوت پر جوانہوں نے دنیا کی اہم شخصیات اور علمائے کبار کو دی تھی، آپ بھی عراق گئے تھے اور عراقی صدر نے اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے تئیں جس تعلق اور محبت کا اظہار کیا تھا اس سے متاثر ہوکر انہوں نے اس وقت ان کے ظاہری موقف کو سراہا تھا جیسے وہاں حاضر اور شریک علماء ودعاۃ نے سراہا تھا لیکن جب انہوں نے عراقی صدر کے اس کے خلاف طرز عمل کو کویت پر حملہ کے تعلق سے دیکھا اور اس کے نتیجے میں جو ناحق خون خرابا ہوا تو انہوں نے کھل کر عراقی صدر کے خلاف کہا اور لکھا اور کسی کی پرواہ نہ کی، اور بعض اسلامی تحریکوں کے ذمہ داروں کی طرف سے عراقی صدر کی اس جارحیت کی حمایت وتائید کی جارہی تھی ان سے انہوں نے حوار ومناقشہ کیا، یہ ان کی حق گوئی کی وہ صفت تھی جو کھل کر ظاہر ہوئی۔

ڈاکٹر عبدالمنعم النمر کے لئے ہم مغفرت ورفع درجات کی دعا کرتے ہیں اور ان کے پسماندگان کے لئے صبر وتسلی کی، اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق دے جس میں اس کی رضا ہو۔

استاذ علی حسن فدعق

۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء تا ۱۴۱۷ھ ۱۹۹۶ء

سرزمین مقدس حجاز کے ممتاز ادیب ودانشور استاذ علی حسن فدعق نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا اور جدہ میں اسّی سال کی عمر میں ماہ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ/ستمبر ۱۹۹۶ء میں وفات پائی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون.

استاذ علی حسن فدعق سعودی عرب کی ممتاز شخصیات میں تھے، انہوں نے ۴۰-۵۰ء کی دہائی میں تعلیمی بیداری اور علم وادب کے فروغ اور ثقافت کی خدمت میں حصہ لیا اور ملک کی ترقی میں کارہائے نمایاں پیش کئے، یہ وہ زمانہ تھا جب سعودی عرب میں کالج اور یونیورسٹی کے نظام کی طرف توجہ نہیں تھی اور وہ ان حالات میں ادھر توجہ مبذول کرانے میں سرگرداں تھے، یہاں تک کہ صحافت کے میدان میں بھی کوئی خاص توجہ نہ تھی اور مملکت میں روزنامے نظر نہیں آتے تھے البتہ سہ روزہ اور ہفت روزہ اخبارات اکّا دکّا نظر آتے، اس کی ایک بڑی وجہ وسائل کا فقدان بھی تھا، اور مملکت اقتصادی طور پر بہت کمزور تھی، چنانچہ اس وقت کے وزیر مالیات شیخ محمد سرور الصبان اس فکر وسوچ کو پسند کرتے ہوئے بھی اس میں کوئی ایسی پیش رفت کرنے میں محتاط تھے جس سے دوسرے مسائل نہ پیدا ہوجائیں وہ خود ادیب ودانشور اور اہل علم وادب کے قدردان تھے، ان کے اس وصف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ نوجوان ادیب، دانشور سامنے آئے، ان میں ایک اہم نام استاذ علی حسن فدعق کا بھی ہے، اسی زمانہ میں ۱۹۴۷ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا حجاز مقدس کا ایک دعوتی سفر ہوا اور

انہوں نے وہاں علم وادب اور اصحاب دعوت وفکر حضرات سے ملاقاتیں کیں اور اس دعوتی کام کی بھی اہمیت سامنے رکھی جس طرز کا حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی نے برصغیر میں آغاز کیا تھا، استاد علی حسن فدعق اگرچہ ترقی پسند ادیب ودانشور سمجھے جاتے لیکن انہوں نے حضرت مولانا کی بات کو بہت توجہ سے سنا اور ان سے ان کو قرب ومحبت کا تعلق قائم ہوگیا، اور وہ ایک مخلص دوست اور معاون کے طور پر مملکت میں ظاہر ہوئے اور اس تعلق ومحبت کے ربط کو انہوں نے آخر تک قائم رکھا، وہ ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی تشریف لائے اور ان کا یہ تعلق حضرت مولانا کے ادارے ندوۃ العلماء اور ان کے شاگردوں اور مسترشدین سے بھی قائم ہوگیا اور ان کی شفقت ان کے تعلق رکھنے والوں کو بھی حاصل ہونے لگی، اس لیے ان کے حادثۂ وفات کا غم ہم سبھی اہل تعلق کو ہوا اور ان کے لئے دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ خصوصی رحم وکرم وعفو ومغفرت کا معاملہ فرمائے، آمین۔

شیخ علی طنطاوی

۱۳۲۷ھ ۱۹۰۸ء تا ۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء

۴؍ربیع الاول ۱۴۲۰ھ/ ۱۹؍جون ۱۹۹۹ء کو شیخ علی طنطاوی کی حرم مکی شریف میں نماز جنازہ پڑھی جانے کے ذریعہ ان کی وفات کا ہم لوگوں کو علم ہوا اور ان کو جو تعلق ہمارے ندوۃ العلماء اور اس کے ناظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے رہا تھا اس کی وجہ سے محسوس ہوا کہ ہمارے گھر میں یہ حادثہ پیش آیا، شیخ علی طنطاوی کا تعلق ندوہ اور حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی سے قدیم ہے، وہ پہلی بار ۱۹۵۴ء میں ندوۃ العلماء تشریف لائے تھے اور اس وقت ان کے ساتھ شیخ امجد الزہاوی بھی تھے، انہوں نے اپنی خودنوشت آپ بیتی ''ذکریات'' میں ندوۃ العلماء اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے اپنے تعلق کو خوب ذکر کیا ہے، اور ان کا یہ تعلق ان کے ان مقدمات سے بھی خوب ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے حضرت مولانا کی کتابوں پر لکھے، خاص طور پر الطریق الی المدینة اور فی مسیرة الحیاة (جو حضرت مولانا کی خودنوشت سوانح حیات کاروان زندگی کا عربی ترجمہ ہے) کے مقدموں میں ان کا یہ تعلق جو خالص دین وایمان اور دعوت وفکر اسلامی میں فکری ہم آہنگی کی وجہ سے تھا پورے خلوص وللہیت کے ساتھ جھلکتا ہے، جہاں اس سانحۂ وفات کا حضرت مولانا پر گہرا اثر پڑا، ہم چھوٹوں کو اس موقع پر ان کی وہ شفقتیں یاد آئیں جو ان کی حضرت مولانا اور ندوہ سے تعلق کی بنا پر ہم لوگوں پر رہی تھیں۔

شیخ علی طنطاوی کا اس عہد کے ممتاز ترین، خالص اسلامی الفکر ادباء اور بڑے علماء

میں شمار ہوتا تھا، اورانھوں نے ایک دردمند داعی، پُرسوز مفکر اور سحر انگیز ادیب وخطیب کی حیثیت سے زندگی گزاری اوران کو دین کے خاطر جوصدمات اٹھانے پڑے خالص اللہ کی رضا کے لئے اس کو برداشت کیا، ان میں ان کے لئے ایک بڑا صدمہ ان کی صاحبزادی استاذہ بنان طنطاوی جوشیخ عصام العطار کی اہلیہ تھیں کی مظلومانہ شہادت کا واقعہ بھی ہے، شیخ علی طنطاوی کے بھائی شیخ سعید طنطاوی بھی ایک بڑے عالم اور بڑے صالح شخص ہیں، دونوں کا قیام مکہ مکرمہ میں تھااور مکہ مکرمہ ہی کی مقدس سرزمین نے ان کواپنی آغوش میں لیا۔ شیخ علی طنطاوی کے بھائی شیخ سعید طنطاوی اوران کے سبھی پسماندگان کوہم لوگ دلی تعزیت پیش کرتے ہیں اوران سب کے لئے صبر کی اور شیخ مرحوم کے مغفرت ورفع درجات کی دعا کرتے ہیں۔

محدث حرم شیخ علوی بن عباس المالکی

۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء تا ۱۳۹۱ھ ۱۹۷۹ء

۱۳۹۱ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں جن عظیم شخصیات نے دنیائے فانی کو الوداع کہا ان میں ایک نا قابل فراموش شخصیت اور عالم عرب کی بلند مقام علمی و دینی ہستی شیخ علوی بن عباس المالکی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ہے، ان کا خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور ندوۃ العلماء سے بڑا گہرا تعلق تھا، اور ندوہ کے نظام تعلیم اور منہج کو وہ بڑی افادیت کا حامل سمجھتے تھے، ان کا اسی لیے یہ بھی ارادہ ہوا کہ وہ اپنے فرزند محمد المالکی کو ندوہ میں تعلیم کے لیے بھیجیں، انہوں نے اس کا ارادہ بھی کرلیا تھا لیکن ہندوستانی سفارت خانہ نے ان کو تعلیم کا ویزہ نہیں دیا اس لیے وہ اس پر عمل نہ کرا سکے، اور پھر انہوں نے قاہرہ کے دار العلوم میں دو سال کا تعلیمی کورس پوا کرایا۔ ان کے یہی فرزندان کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔

شیخ علوی بن عباس المالکی اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ جب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی حجاز تشریف لے جاتے اور ان کا قیام مکہ مکرمہ میں مولانا عبداللہ عباس ندوی مرحوم کے مکان پر ہوتا تو وہ اہتمام سے ملنے آتے، اس طرح مجھے بھی ان سے نیاز حاصل ہوتا اور ان کی شفقت حاصل ہوتی، یہ ان کے اعلیٰ اخلاق پر فائز ہونے کی بات تھی کہ ایک بار حضرت مولانا کی غیر موجودگی میں بھی وہ قیام گاہ پر تشریف لے آئے اور مولانا عبداللہ عباس صاحب سے یہ کہا کہ سماحۃ السید أبی الحسن الندوی حفظہ اللہ آتے ہیں تو میں بار بار تمہارے یہاں آتا ہوں، اور جب وہ نہیں ہوتے تو تم سے ملنے ملانے کا موقع

نہیں ملتا، اس لیے سوچا کہ ان کی عدم موجودگی میں بھی ایک بار تمہارے پاس آؤں گا تا کہ ان کی آمد کے موقع پر جب آؤں تو یہ نہ سمجھو کہ مجھے تم سے کوئی تعلق نہیں ہے، شیخ علوی مالکی بلاد عربیہ کے کبار علماء میں ایک تھے، اور بڑی محبوبیت رکھتے تھے اس لیے ان کے سانحۂ ارتحال کو بہت محسوس کیا گیا، مولانا عبداللہ عباس ندوی نے جوان کے جنازہ میں شریک تھے ان کی وفات پر لوگوں کے تاثر اور جنازہ میں مشایعت کا حال میرے نام اپنے مکتوب میں لکھا ہے، وہ کہتے ہیں:

''شیخ علوی بن عباس المالکی رحمۃ اللہ علیہ کی موت نے نہ صرف ہمیں اور آپ کو متاثر اور غمگین کیا بلکہ اہل حرم کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ ہے، یہاں کے بڑے بوڑھوں کا بیان ہے کہ چالیس سال سے کوئی ایسا جنازہ نہیں دیکھا جس کی مشایعت اتنے لوگوں نے کی ہو، حرم سے معلّٰی تک سر ہی سر نظر آرہے تھے، جنت المعلیٰ کے دونوں میدان بھرے ہوئے تھے، اور ہر طبقہ کے لوگ شریک تھے، یہاں تک کہ اغوات حرم، اور موذنین، ائمہ جن کو شاید ہی کسی نے کسی جنازے کے ساتھ دیکھا ہو وہ بھی جنازہ کے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے، جنازہ کا عالم یہ تھا کہ کسی کو بھی کاندھا دینے کا موقع نہ مل سکا، شیخ کے افریقی شنقیطی، دراز قامت شاگرد چاروں طرف سے اپنی انگلیوں پر کلائی کے زور سے پورے ہاتھ بلند کئے ہوئے جنازہ اٹھائے ہوئے تھے، اس حالت میں کاندھا دینے کا سوال ہی نہیں تھا، اخباری نامہ نگاروں کی طرح اگر لوگوں کے تاثرات معلوم کئے جاتے تو نہ معلوم کن کن الفاظ میں لوگ اپنے تاثرات کا اظہار کرتے، چلتے پھرتے جو الفاظ کان میں پڑے وہ اس طرح کے تھے ''اب حرم میں کوئی مدرس نہ رہا''۔ کسی نے کہا کہ یہ تو حرم کے حمامہ تھے، یعنی حرم میں اس پابندی کے ساتھ رہنے والے جیسے کبوتران حرم، دوسرے الفاظ میں اس کا ترجمہ یوں کر سکتے ہیں کہ بلبل حرم تھے، ایک واقف کار طالب علم نے کہا واللہ ان سے حرم کی زینت تھی۔

شیخ علوی مالکی نے تقریباً چالیس سال حرم شریف میں درس دیا، عام طور سے وہ

مؤطا امام مالک اور بخاری شریف کا درس دیتے تھے، پڑھانے کا انداز علمائے سلف کا تھا، اور حرم شریف کی روایات کے پابند تھے، ہر درس خطبہ سے شروع اور دعا پر ختم ہوتا، مناسک پر انھیں کافی عبور حاصل تھا، ہر سائل کو اس کے مذہب کے مطابق مدلل مسئلے بتاتے تھے، ان کے والد سید عباس مالکی بھی حرم شریف کے مدرس تھے، اور انہوں نے اپنی زندگی میں ان کو مسند درس پر بٹھادیا تھا، اور خود وہ اپنے صاحبزادے، سید علوی کے درس میں شریک ہوئے اور اطمینان کا اظہار کیا تھا۔

سید علوی مدرسۃ الفلاح کے باقاعدہ مدرس تھے، مدرسہ کے خارج اوقات میں عصر اور مغرب کے بعد حرم شریف میں درس دیتے رہے، بیس سال سے سعودی ریڈیو سے جمعہ کے دن بعد فجر ان کا دینی وعظ نشر ہوتا تھا، رمضان المبارک میں عصر کے بعد سے افطار تک ان کا درس ہوتا، جس میں آخری ایک گھنٹہ دعاؤں میں صرف ہوتا، ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا، لوگ ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے تھک جاتے تھے، مگر وہاں ایک سیل رواں تھا جو خشک نہیں ہوتا، عربی خطبہ کی قدرت کلام اور تسلسل بیان کی صلاحیت کا اظہار کرتے تھے، کبھی زبان یا حلق خشک نہیں ہوتی تھی۔ ان کے انتقال کے تین روز بعد شیخ حسن مشاط، شیخ نور سیف حسن کتبی وغیرہ نے آکر ان کے صاحبزادے محمد المالکی کو ان کی جگہ پر بٹھایا، پہلے ان علماء نے مختصر وعظ کے بعد دعائیں کیں، اس کے بعد ان کے والد کی مسند پر بٹھایا، شیخ محمد بن علوی مالکی نے "بسم الله الرحمن الرحيم لله مااخذ وله مااعطى ولاحول ولاقوة الا بالله" کہہ کر سبق اسی جگہ سے شروع کرایا جہاں سے ان کے والد نے چھوڑا تھا، اس موقع پر کئی ہزار اہل حرم کا مجمع تھا اور تمام شاگرد اسی طرح بیٹھے تھے جیسے ان کے والد کے حلقہ میں بیٹھا کرتے تھے"۔

اسلامی مفکر وشاعر عمر بہاء الدین الامیری

۱۳۳۴ھ ۱۹۱۵ء تا ۱۴۱۲ھ ۱۹۹۲ء

ریاض (سعودی عرب) سے کل ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ٹیلی فون کے ذریعہ یہ اطلاع ملی کہ اسلامی دنیا کے ممتاز شاعر وادیب عمر بہاء الدین الامیری کا اسی (۸۰) سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

عمر بہاء الدین الامیری کی طاقت وشخصیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عالم عربی کی مشہور دعوتی تحریک اخوان المسلمین کے رہنما شیخ حسن البنا کی شہادت کے بعد ان کے جانشین کی حیثیت سے جن تین لوگوں کا نام تجویز کیا گیا تھا ان میں عمر بہاء الامیری کا نام سرِ فہرست تھا۔

عمر بہاء الامیری شام کے مشہور شہر حلب کے ایک ممتاز علمی ودینی اور نوابی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ۱۹۵۰ء میں شام کی حکومت نے ان کو پاکستان میں سفیر کی حیثیت سے متعین کیا، جہاں مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا محمد ناظم ندویؒ، مولانا مسعود عالم ندویؒ، اور جماعت اسلامی کے رہنما مولانا مودودیؒ سے ان کے گہرے روابط قائم ہو گئے، پاکستان میں انہوں نے اردو زبان اتنی سیکھ لی کہ علامہ اقبال کے کلام کا عربی شعر میں براہ راست ترجمہ کرنے لگے، ہندوستان آئے تو اردو میں بھی انہوں نے تقریریں کی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ان کے تعلقات ۱۹۵۰ء سے قائم تھے جب مولانا کی نگرانی وصدارت میں رابطۂ ادب اسلامی کا ابتدائی جلسہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہوا تو بڑے اہتمام سے عمر بہاء الامیری شریک ہوئے، پھر جب رابطہ ادب اسلامی کی تشکیل ہوئی تو اس کے رکن اور اس کے پیغام کے پر جوش داعی بن گئے۔

عمر بہاء الامیری ایک پر جوش شاعر تھے، اب تک ان کے بیس دواوین چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں، بعض کتابوں کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، ان کا پہلا دیوان ''مع اللہ'' ہے اور آخری دیوان جس پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ ہے، ''ریاحین الجنۃ'' ''جنت کے پھول'' ابھی حال ہی میں چھپ کر شائع ہو گیا ہے، اس کتاب میں انہوں نے بیٹوں، پوتوں کے ساتھ والدین کو جو تعلق ہوتا ہے اس احساس کو فطری انداز میں بڑے موثر اور طاقتور اشیاء میں ڈھال کر بیان کیا ہے۔

عمر بہاء الامیری کی شاعری میں احساسات کی گہرائی، جدت وندرت اور وجدانیت پائی جاتی ہے، حمد ومناجات کے موضوع کو انہوں نے خوبصورت، مؤثر اور اچھوتے اسلوب میں ایسے طاقتور ادبی قالب میں ڈھال دیا ہے کہ ادبی وشعری حلقوں نے اس میدان میں ان کی انفرادیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے، اسی بنا پر عالم عربی کی متعدد دانش گاہوں میں ان کے فکر وفن کو موضوع بنا کر لوگوں نے پی. ایچ. ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

عمر بہاء الامیری عرصہ سے مراکش کی مشہور دانش گاہ دار العلوم الحسینیہ میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، وہاں کے طلباء کی علمی وادبی رہنمائی کرتے، اس کے علاوہ اسلامی دنیا کی مختلف دانش گاہوں میں اسلامی شعر وادب پر لکچر بھی دیا کرتے تھے، اسلامی ادب کی حمایت اور دفاع میں ہمیشہ سینہ سپر رہا کرتے اور اسلامی غیرت وحمیت کا کھل کر اظہار کرتے۔

رابطہ ادب اسلامی کی مقامی شاخ کے ارکان نے عمر بہاء الامیری کی وفات پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور ان کی وفات کو عربی واسلامی ادب کا غیر معمولی خسارہ قرار دیا ہے۔

مرحوم کو عرصہ سے قلب کی تکلیف تھی جب تکلیف بڑھ گئی تو مراکش سے ریاض لائے گئے جہاں ان کے بیٹے ڈاکٹر احمد براء الامیری موجود تھے، فوری طبی امداد پہنچائی گئی لیکن ان کا آخری وقت آ چکا تھا۔

رابطہ ادب اسلامی کی طرف سے ایک تعزیتی جلسہ بھی منعقد ہوا اور مرحوم کے لیے ایصال ثواب کیا گیا۔

شیخ عمر تلمسانی

۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء تا ۱۴۰۷ھ ۱۹۸۶ء

گزشتہ مہینہ مئی ۱۹۸۶ء میں عالم اسلام کو جن بڑی شخصیات کے جدا ہونے کے صدمہ سے گزرنا پڑا ہے ان میں ایک بڑی اہم دینی اور قائد شخصیت شیخ عمر التلمسانی کی بھی ہے جو الاخوان المسلمون کے مرشد عام تھے، وہ تحریک الاخوان المسلمون کے تیسرے قائد تھے جو شیخ حسن البنا شہید کے جانشین شیخ حسن الھضیبی کے جانشین کے طور پر سامنے آئے تھے، مصر میں ان کو تین عہد سے سابقہ پڑا، جمال عبدالناصر کا عہد، پھر انور السادات کا عہد اور آخر میں حسنی مبارک کا عہد۔ اس میں ان کو بڑے تجربے ہوئے اور ایک تجربہ ان تجربوں میں بھی ہوا کہ ٹکراؤ کی پالیسی پر افہام وتفہیم اور اصلاح کی پالیسی کو ترجیح دینی چاہئے اور دعوت کے میدان میں حکمت وتدبر سے کام لینا چاہئے، اور اس کا انہوں نے خود تجربہ کیا، اور اہل سیاست واقتدار کے سامنے ملاقاتوں اور افہام وتفہیم کے ذریعہ اور حکمت وتدبر سے مسائل رکھے، اور دوسری طرف اپنی تحریک سے وابستہ لوگوں کو بھی تحریر وتقریر اور ملاقات ومناقشات کے ذریعہ ایسی راہ اختیار کرنے کی طرف توجہ دلائی جس سے اہل حکومت خود وہ اقدام کریں جن کی وہ ضرورت محسوس کر رہے ہیں اور معاملات کو شدت کے بجائے خوش اسلوبی سے حل کرنے کی راہ نکالیں۔

شیخ عمر تلمسانی ایک غیر معمولی صلاحیت وقیادت کی حامل شخصیت کے طور پر ابھرے اور اپنی معتدل فکر کے ذریعہ انہوں نے دین وملت کی عظیم خدمت انجام دی،

مصر میں ان سے ہمارے ندوۃ العلماء کے بعض نمائندے ملے تو انہوں نے اپنی گفتگو میں دعوت واصلاح کے ان طریقوں کی طرف توجہ دلائی جس میں زمانہ کے تقاضوں کا خیال ہو اوراس کا منہج واسلوب حکیمانہ ہو، ہمارے ندوۃ العلماء کی دعوت وفکر سے ان کو ندوۃ العلماء آنے کی دعوت بھی دی گئی، اس لئے وہ ہندوستان میں دعوت اسلامی کے امکانات کے تعلق سے اچھا خیال رکھتے تھے مگر پھر ان کی صحت کمزور ہوتی گئی یہاں تک کہ ۲۲رمئی ۱۹۸۶ء کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور قاہرہ میں بہت بڑے مجمع نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً وادخله فی جنت النعیم مع الشهداء والصدیقین.

حضرت مولانا حکیم محمد اختر رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۴۲ھ ۱۹۲۳ء تا ۱۴۳۴ھ ۲۰۱۳ء

حضرت مولانا حکیم محمد اختر رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکت کا انتقال ہندوپاک کی ملت اسلامیہ کی ارشادوتربیت دینی کے دائرہ میں ایک بڑا خسارہ ہے، ادھر متعدد اصحاب ارشادوتربیت یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوئے، اوراس دائرہ میں بڑی کمی واقع ہوئی، مولانا حکیم محمد اختر صاحب کے ذریعہ اس کمی کی تلافی ہورہی تھی، وہ اس کمی کو اپنے بیانات ومواعظ اوراپنی توجہات سے پورا کرتے تھے، اوران کے پرتاثیر کلام سے بہت لوگوں کی اصلاح ہورہی تھی، اوران کا فیضان عام ہورہا تھا، لوگ دین کی طرف متوجہ ہورہے تھے، اوراپنی سیرت واخلاق کوسنواررہے تھے۔

حضرت حکیم شاہ محمد اختر صاحب کوطبی تعلیم مکمل کرنے کے بعد حکیم کی حیثیت توحاصل ہوئی لیکن اپنے عہد کے بزرگوں سے رشدواصلاح باطن کے دائرہ میں فیضان اٹھانے سے ارشاددینی اورصلاح باطنی کا غلبہ ہوا، اورانہوں نے اس سلسلہ میں اوّلاً حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ (۱) کی صحبت میں رہ کرخوب مجاہدے کیے اوردس سال تک ان کی

(۱) مولانا پھولپوری حضرت تھانوی کے اجل خلفاء میں تھے، اعظم گڑھ میں ان کا علمی وروحانی فیض نصف صدی سے زیادہ جاری رہا، ان کی تحریروتقریر میں اپنے شیخ کا اثرمحسوس ہوتا تھا، اہتمام شریعت اورمریدین ومتوسلین کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال کرتے تھے، مولانا نے دو مدرسہ بھی قائم کئے تھے، آپ کی کئی کتابیں معیت الہیہ، معرفت الہیہ، براہین قاطعہ، ملفوظات حضرت تھانوی وغیرہ ہیں، جوسالکین ومسترشدین کے لیے بہت مفید ہیں، آپ کی وفات ۱۹۶۳ء کراچی میں ہوئی۔

بے لوث خدمت کی، پھر یہ تعلق رشتہ میں بھی تبدیل ہوگیا جب ان کی والدہ سے حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ نے نکاح کیا۔

حضرت حکیم صاحب کا حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھیؒ (۱) سے بھی تعلق قائم تھا اور یہ اس وقت سے تھا جب حضرت پرتاپگڑھی الہ آباد تشریف لائے تھے اور حضرت حکیم صاحب الہ آباد کے اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے یہ ان کی بالکل نوعمری کا زمانہ تھا، اور ان کے فیضان نظر سے حضرت حکیم صاحب کی ارشادی خصوصیت میں مزید اضافہ ہوا، اسی دوران انہوں نے مثنوی کی شرح لکھنی شروع کی، ان کو مثنوی مولانا رومؒ سے حد درجہ عشق تھا، اور اپنی مجلسوں کو ان کے ناصحانہ کلام سے مزین رکھتے تھے اور اپنے درد دل کی کیفیتوں کو شامل کر کے حاضرین مجلس پر محبت الٰہی کا رنگ پیدا کرتے تھے، مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری کی وفات کے بعد حضرت مولانا ابرار الحق حقیؒ سے باقاعدہ تعلق قائم کیا، اور ان کی تربیت وارشاد سے معرفت کا اونچا مقام حاصل کیا، اور ان سے بھی اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے، ان کو اپنے ان تینوں حصوں سے خلافت حاصل ہوئی۔

وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے تین مشائخ سے استفادہ کیا ہے، اور ان تینوں

---

(۱) حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی اس آخری عہد کی عظیم شخصیتوں میں سے تھے، ان کی خصوصیات میں کئی باتیں ایسی ہیں کہ استفادہ کے طالب اپنی ضرورت کے لحاظ سے فائدہ حاصل کرتے تھے اصلاح حال و جذبہ محبت ان کی نمایاں صفات تھیں، اور ان میں تواضع کی خصوصی شان نظر آتی تھی اصلاح حال کے سلسلہ میں ان کا ناصحانہ طرز اور گفتگو کا محبانہ انداز ملتا تھا، چنانچہ ان کی صحبت کا فیض اٹھا کر آدمی کو زندگی کی خوشی حاصل ہوتی تھی، مولانا جسمانی کمزوری اور بعض امراض کے اثر سے زیادہ چلنے پھرنے کا بوجھ اٹھانے میں معذوری رکھتے تھے، کوئی خاص ملاقاتی آتا تو اس کو پہونچانے اسٹیشن چلے جاتے، اور تعلق والوں میں کوئی سفر پر جاتا تو اس کو سفر کی سہولت کے ساتھ دعا دے کر رخصت کرتے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اعلیٰ خوبیوں کو اختیار کرنے میں بڑی ریاضتیں اور محنت کی تھی، ٹیلے والی مسجد میں عرصہ تک قیام اور پھر اویس زمانہ حضرت شاہ بدر علی صاحب سے استفادہ اور سلسلہ نقش بندیہ میں علو نسبت کے حامل ہونے کے ساتھ پرتاپ گڑھ کے دو سو سے زائد دیہات کے دوروں نے مولانا کی زندگی کو جہد مسلسل سے عبارت کر دیا تھا، ۹۳ سال کی عمر میں ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

کا فیضان ان میں پایا جاتا تھا، وہ پاکستان ہجرت کر گئے تھے، اور ان کی صحبت وتربیت سے لوگوں میں صلاح وتقویٰ پیدا ہوا، اور زندگیوں میں تبدیلی آئی، وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے، اور اپنی شاعری کو دینی جذبہ کی تقویت کے لیے استعمال کرتے تھے، ادھر کئی سال سے ان کو فالج کے حملہ سے سابقہ پڑا، اور ان کو جسمانی معذوری پیش آئی، لیکن وہ بستر علالت سے ہی اپنے فیض کو قائم رکھے رہے، اور لوگوں کی اصلاح وتربیت کا کام انجام دیتے رہے، ان کے مواعظ بڑے پرتاثیر ہوتے تھے، اور جب سے جدید مواصلاتی نظام عام ہوا، تو ان کے خدام ومتوسلین نے ان کے مواعظ وبیانات کو انٹرنیٹ کے ذریعہ سے دنیا کے دوردراز علاقوں تک پہونچا دیا، اس طرح ان کے ریکارڈ شدہ بیانات ومواعظ کا فیضان جاری وساری رہا، اللہ تعالیٰ ان کو مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ بنائے، اور امت مسلمہ کی تقویت کا سامان بہم پہونچائے۔

بزرگوں کی رحلت سے اس بات کا خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کے نہ رہنے سے پیدا ہونے والی کمی کیسے دور ہوگی، اور خطرہ کا احساس ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ جانے والے کے درجات بلند فرمائے، اور انہوں نے اصلاح وارشاد کا جو عظیم کام انجام دیا ہے، اس کا بیش از بیش صلہ عطا فرمائے، اور جو کمی پیش آئی ہے اس کو دور فرمائے۔

مجھ کو ان سے ملاقات کا شرف کئی بار حاصل ہوا، اور مجھے ان کی عظمت کی قدر ہوئی، اور ان کی دینی تاثیر محسوس کرنے کا شرف حاصل ہوا، وہ میرے وطن رائے بریلی کے پڑوسی ضلع پرتاپ گڑھ کے رہنے والے تھے جہاں وہ ۱۹۲۳ء کو اٹھیہہ میں پیدا ہوئے، جو ہمارے رائے بریلی کے علاقہ انبیٹھہ سے متصل علاقہ ہے، اس طرح ہم لوگوں کا ان سے قرب وطن کا بھی تعلق ہے، اللہ تعالیٰ انہیں ان کی کوششوں کا بہترین بدلہ عطا فرمائے، اور پسماندگان کو صبر کا اجر نصیب فرمائے، اور ان کے صاحبزادہ عالی قدر مولانا محمد مظہر کو ان کا حقیقی جانشین ووارث بنائے، جو ان کی علالت کے زمانہ سے ہی ان کے کاموں کی نگرانی فرمانے لگے تھے۔

ڈاکٹر محمد عبدہ یمانیؒ

۱۳۶۰ھ ۱۹۴۰ء تا ۱۴۳۱ھ ۲۰۱۰ء

کلید بردار کعبہ شریف عبدالعزیز شیبی کی وفات کے ایک دن بعد ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی سعودی عرب کے سابق وزیر ثقافت واعلام کا دوشنبہ کے دن ۲ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ مطابق ۸ نومبر ۲۰۱۰ء کو انتقال ہوا، شیخ کی عمر ستر سال سے متجاوز تھی، مختلف ومتنوع اسلامی خدمات سے بھرپور اور مغرب میں مسلمانوں کے معاملات اور اسلامی معاشروں کے مسائل کے حل میں زندگی گزاری، جس کی وجہ سے ان کی شخصیت عوام وخواص میں یکساں طور پر قابل احترام ہوگئی تھی۔(۱)

شیخ نے اپنے پیچھے علم اور دین وثقافت پر مشتمل کئی کتابیں چھوڑی ہیں، جن کی تعداد ۳۵ تک پہنچتی ہے، ان کتابوں میں سب سے مشہور ان کی کتاب "علموا اولادکم حب رسول الله صلى الله عليه وسلم" ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرما کر ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

---

(۱) شیخ کی ولادت ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء مکہ مکرمہ میں ہوئی، وہیں پروان چڑھے، مشائخ حرم سے علمی استفادہ کیا، پھر مکہ کے مدرسۃ الفلاح میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی، یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے بعد وہیں بحیثیت استاد کے مقرر ہوئے، ان کو ۱۳۹۵ھ سے ۱۴۰۳ھ تک وزیر الاعلام مقرر کیا گیا، اس کے بعد وہ جامعۃ الملک عبدالعزیز میں تدریس کے لیے مقرر ہوئے، اور اخیر عمر تک اسی طرح علم ودین کی خدمت کرتے رہے۔

شیخ کو سیرت نبوی سے بہت دلچسپی تھی اور ان کی خواہش رہتی تھی کہ اہل ایمان اس جانب زیادہ سے زیادہ توجہ دیں، اسی طرح انہوں نے دنیا میں پائی جانے والی مسلم اقلیات کے مسائل میں دلچسپی لی اور ان کو حل کرنے میں اپنی خدمات پیش کیں، خصوصا براعظم افریقہ، ایشیا، سودیت یونین اور چین کے علاقے میں پائی جانے والی مسلم اقلیت کے مسائل کو عالمی سطح پر رابطہ عالم اسلامی کے پلیٹ فارم پر پیش کیا۔

شیخ محمد علی دولۃ رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۵۸ھ ۱۹۳۹ء تا ۱۴۳۷ھ ۲۰۱۶ء

گذشتہ دنوں ملت اسلامیہ کے جن کارگذار افراد نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، ان میں ایک مخلص اور دین کا درد رکھنے والے عالم وداعی استاذ محمد علی دولہ بھی ہیں، جنہوں نے جمعہ کی صبح ۱۹/ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۹/جنوری ۲۰۱۶ء کوشہر کسوہ، سوریا میں ۷۷/سال کی عمر میں وفات پائی، اور دار الاشاعت کے طور پر دو بڑی یادگار دمشق میں دار القلم اور جدہ میں دار البشیر چھوڑ کر رخصت ہوئے جو صحیح اسلامی دینی فکر وشناخت کا بڑا ذریعہ بنے اور نئی نسل کی تربیت ورہنمائی میں بڑا اچھا کردار ادا کیا، یہ ان کے لیے ان شاء اللہ صدقہ جاریہ اور ان کی مغفرت ورفع درجات کا سبب بنے گا۔

شیخ محمد علی دولہ مرحوم شام کی ایک ممتاز شخصیت تھے، انہوں نے اشاعت کتب کے ذریعہ فکر اسلامی کی بڑی خدمت انجام دی، اسلامی رجحانات کو تقویت پہونچانے والی کتابوں کو طبع کرانے کا بڑا کام انجام دیا، ان کتابوں میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی بھی تصنیفات ہیں جن کو انہوں نے طبع کرا کر علم وادب کے حلقوں میں خوب پھیلایا، اور اہل فکر ودانش اور دین کا شوق رکھنے والے لوگوں کو اس سے بڑی رہنمائی ملی، اور اس حلقہ نے بھی فائدہ اٹھایا جو دین سے قریب نہیں تھا، اور اس کا اس پر یقین کمزور تھا کہ اسلام موجودہ زمانہ میں بھی ہماری رہنمائی کرسکتا ہے، انہوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی بعد میں اہم تصنیفات کو بھی شائع کرنے کا اہتمام کیا، جو

دیگر ناشرین کے ذریعہ عام ہوئی تھیں، انہیں میں دار الشـروق جدہ سے شائع ہونے والی ان کی معرکۂ آراء کتاب "السيرة النبوية" بھی ہے، اور بعض وہ کتابیں بھی ہیں جو مؤسسہ الرسالۃ بیروت سے شائع ہوئیں اور خوب عام ہوئیں، دار الشروق، جدہ کے ذمہ دار استاذ محسن باروم حجاز کے ہی باشندہ تھے، اور ان سے حضرت مولاناؒ کا تعلق اپنے پہلے سفر حجاز سے ہی قائم ہو گیا تھا، اور مـؤسسة الرسـالة بیروت کے ذمہ دار استاذ رضوان دعبول بھی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا خیال رکھتے تھے، لیکن حضرت مولاناؒ کی زیادہ تر کتابیں اور رسائل شیخ محمد علی دولہ مرحوم نے شائع کیں، وہ حضرت مولاناؒ کی شخصیت سے متاثر تھے اور عقیدت سے ملتے اور تعلق و محبت سے پیش آتے تھے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق کی بنا پر ان کے عزیزوں اور شاگردوں اور دیگر متعلقین سے بھی تعلق ہو گیا تھا جو ان کی وفات کے بعد انہوں نے قائم رکھا، اور یہ تعلق ان کے صاحبزادوں میں بھی پایا جاتا ہے، جو ان کی علالت اور ضعف کے بعد ان کے کام کے بوجھ کو ہلکا کرنے لیے شریک کار ہوئے تھے، اور نظام کو سنبھال لیا تھا۔

ندوۃ العلماء سے جو ان کو تعلق تھا اس کو سبھی ان کے تعلق والے محسوس کرتے تھے، ندوہ کی متعدد شخصیات سے متعلق بھی انہوں نے کتابیں شائع کیں جن میں ندوہ کی تین اہم اور مرکزی شخصیات علامہ شبلی نعمانیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کی شخصیت پر عزیزی ڈاکٹر محمد اکرم ندوی (آکسفورڈ لندن) کی کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق عالم اسلام کی قد آور شخصیت شیخ یوسف القرضاوی کی کتاب اور عزیزی مولوی ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندوی مرحوم کی کتابیں بھی شائع کیں، یہ ان کے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلق کی بات تھی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سے ان کا جو تعلق تھا اس بنا پر انہوں نے اور بھی مصنفین کی کتابیں شائع کیں اور پھیلائیں، مزید ہندوستان کی بعض ان شخصیات کے متعلق بھی کتابیں شائع کرنے اور عام کرنے کا اہتمام کیا جن سے حضرت مولاناؒ کو خاص تعلق

رہا تھا، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ اور داعی الی اللہ مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ پر کتابیں وہاں سے طبع ہوکر خوب پھیلیں اور عام ہوئیں، ایک اچھا اور مفید سلسلہ " أعلام المسلمين " کی سیرت وتذکرہ کا شروع کیا تھا جس کی سو سے زائد کتابیں وہ منظر عام پر لائے، جن کے ذریعہ اسلامی تاریخ کی عظمت رفتہ کو پیش کرنے کے ساتھ موجودہ عہد کی ممتاز اور صاحب اقتداء شخصیات کی خدمات کو نمایاں کرکے نئی نسل کو حوصلہ دینے کا بھی مؤثر کام کیا، اس سے پہلے انہوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی " رجال الفكر والدعوة في الاسلام " کو جوان کی تاریخ دعوت وعزیمت کا عربی ایڈیشن ہے، معیاری طباعت کے ساتھ سامنے لاکر صحیح فکر ونہج پر کام کرنے کی راہ دی، اس کا دوسرا حصہ جو شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اور ان کے نامور تلامذہ واخلاف پر ہے، بہت وسیع پیمانہ پر شائع کیا جس کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی مدینہ منورہ کی ممتاز دینی شخصیت اور سابق صدر امور حرمین شریفین شیخ صالح الحصین نے بھی لی تھی۔

استاذ محمد علی دولہ نے مصنف کتاب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے اس سلسلہ کی تکمیل کا بھی تقاضہ رکھا تھا، وہ اپنی علالت کی وجہ سے خود اس خدمت کو انجام نہ دے سکے، ان کے ایماء پر یہ کام ان کے فاضل بھانجہ برادر عزیز مولوی سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نے انجام دیا، یہ کتاب پہلے ہندوستان سے " رجال الفكر والدعوة ، الجزء الخامس، الامام أحمد بن عرفان الشهيد " کے نام سے شائع ہوئی اور پھر بلاد عربیہ میں بھی اس کی اشاعت ہوئی، اس طرح یہ بھی ان کی حسنات میں شمار کیا جانے والا کام قرار پائے گا، انہوں نے حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کی دوسری اہم کتابوں کو بھی شائع کیا جو شروع میں قاہرہ مصر سے اور دارالقلم، کویت سے شائع ہوئی تھی، جن میں " ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين " بھی ہے، ان کی شائع کردہ اس کتاب کو ابھی حال میں وزراۃ الاوقاف، قطر نے عالم اسلام میں بڑے پیمانہ پر عام کیا، فکر اسلامی پر دوسرے مفکرین کی بھی اہم کتابیں منظر عام پر لائے۔

شیخ محمد علی دولہ مرحوم سوریا (شام) کے شہر کسوہ میں ۱۳۵۸ھ بمطابق ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے تھے، ممتاز علماء شام سے انہوں نے تعلیم وتربیت پائی اور علمی، ادبی و دینی استفادہ کیا، جن میں استاذ عبدالغنی الدقر، استاذ مصطفیٰ سباعی، استاذ محمد المبارک، استاذ معروف الدوالیبی جو شام کے وزیر اعظم بھی ہوئے اور ملک فیصل کے مستشار بھی رہے تھے اور اپنے عہد کے ممتاز عالم وفقیہ شیخ مصطفیٰ الزرقاء کے نام زیادہ نمایاں ہیں، اوران سب کا تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے گہرا تھا اور ۱۹۵۶ء کے سفر دمشق میں ان کے محاضرات میں یہ حضرات جو علم وادب کے اساطین اور فکر اسلامی کے اقطاب شمار ہوتے تھے، استفادہ کی غرض سے شریک ہوئے تھے۔

شیخ محمد علی دولہ مرحوم کا دونوں جگہ ان مصروفیات کی وجہ سے قیام رہتا تھا اور سعودی عرب کے سفروں میں ان سے ملاقات کے مواقع حاصل ہوتے تھے جہاں ان کا جدہ میں قیام رہتا، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے جوارِ رحمت میں اجر جزیل عطا فرمائے، آمین۔

امام حرم علامہ محمد بن عبداللہ السبیّل رحمہ اللہ

۱۳۴۳ھ ۱۹۲۴ء تا ۱۴۳۴ھ ۲۰۱۲ء

ایک عرصہ تک حرم مکی کے مؤقر امام اور حرمین شریفین کے انتظامی امور کے صدر رہنے والے شیخ علامہ محمد بن عبداللہ السبیل نے مکہ مکرمہ میں دوشنبہ کے دن ۴؍صفر المظفر ۱۴۳۴ھ موافق ۱۷؍دسمبر ۲۰۱۲ء کو اس دار فانی کو الوداع کیا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، انا للہ وإنا إليه راجعون۔

وہ کچھ عرصہ سے بیمار تھے اور حرمین شریفین کی خدمت سے معذور ہو گئے تھے، ان کی وفات سے علمی و دینی سطح پر ایک خسارہ ہوا، اور امت اسلامیہ ایک اہم شخصیت سے محروم ہوگئی، وہ بڑے جلیل القدر عالم دین اور اہم خصوصیات کی حامل شخصیت تھے، حرمین شریفین کے امور کے طویل مدت تک رئیس (صدر) رہے، اور اس کے ساتھ انہوں نے حرم مکی کی امامت کی ذمہ داری بھی انجام دی، امامت کی ذمہ داری میں ان کے ساتھ فرزند جلیل شیخ عمر السبیل بھی شریک کار رہے۔(۱)

علامہ محمد بن عبداللہ السبیل دین وملت کی نصرت کے کام سے بھی خصوصی دلچسپی رکھتے تھے، اس کے لیے انہوں نے دنیا کے مختلف حصوں اور خطوں کے بار بار سفر بھی کیے۔

ہندوستان و پاکستان میں بھی ان کے سفر ہوئے اور یہاں کے عوام وخواص نے

---

(۱) امام صاحب کی ولادت ۱۹۲۴ء شہر بکیریہ قصیم میں ہوئی، صغر سنی میں ہی قرآن حفظ کر کے اپنے والد اور شیخ سعدی، عبدالرحمٰن الکریدیس جیسے ائمہ سے علم کی تحصیل کی، جھیمان کے حرم پر حملہ میں یہ قتل سے بال بال بچے، ۱۳۸۵ھ سے ۱۴۲۹ھ تک مستقل امام حرم کے منصب پر فائز رہے۔

ان کے لیے زبردست اظہار عقیدت کیا، ہندوستان میں ندوۃ العلماء کی دعوت پر وہ دوبار تشریف لائے، دونوں باران کے ساتھ مملکت سعودی عرب کی متعدد اہم شخصیات بھی ہمراہ تھیں، ان کا آخری سفر ندوۃ العلماء کی طرف سے بلائی گئی انٹرنیشنل دعوتی کانفرنس کے موقع پر ہوا، جو اصلاً فرق ضالہ محرفہ ومنحرفہ (قادیانیت وغیرہ) کے فتنہ اور خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے منعقد ہوئی تھی اور یہ کانفرنس امام حرم علامہ محمد بن عبداللہ السبیل کے زیر صدارت منعقد ہوئی، انہوں نے اس پیش کش پر تواضع اختیار کرتے ہوئے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو صدر بنانے کا مشورہ دیا لیکن حضرت مولاناؒ کے اصرار پر امام حرم نے اس کو قبول کیا۔

علامہ سبیل متواضع اور سادگی پسند عالم دین تھے، اپنے کو نمایاں کرنے سے بچتے تھے، متعدد باران کو حرم شریف میں دیکھا گیا کہ وہ نماز پڑھا کر جارہے ہوتے تو رکن یمانی کی طرف بیٹھے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے پاس آجاتے، اور ان کی مزاج پرسی کرتے اور کچھ دیر ان کے پاس بیٹھتے، اس کے علاوہ بھی جہاں کہیں کسی پروگرام میں ساتھ ہوا تو بڑی تواضع سے پیش آئے اور عقیدت واحترام کا معاملہ ظاہر کیا، اور جب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا سانحۂ ارتحال پیش آیا، تو حرمین شرفین میں ان کی نماز جنازہ (غائبانہ) کا نظم بنانے میں انہوں نے حصہ لیا، اور حرم مکی میں خود نماز جنازہ (غائبانہ) پڑھائی اور ان کے مقام اور کام کا اظہار کر کے اس کا اعلان بھی کیا، ایسے خصوصی معاملات میں بادشاہ کی منظوری ضروری ہوتی ہے، لہٰذا اس کے لیے دیوان ملکی سے اجازت حاصل کرنے کا اہتمام کیا، اس وقت مملکت سعودی عرب کے بادشاہ اور دونوں حرموں کے خادم شاہ فہد بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تھے، شاہ کی طرف سے راقم کے نام جو تعزیتی خط موصول ہوا، اس میں شاہ نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مقام وکام کو سراہا، اور اس کا اظہار کیا جو نماز کے سلسلہ میں انہوں نے اجازت دی تھی اور شیخ سبیل کو جو یہ ذمہ داری دی، خود شیخ نے اپنی تعزیتی مکتوب میں جو تحریر کیا اس کے ایک ایک جملہ سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے

گہرا تعلق ظاہر ہورہا ہے، اس مکتوب کو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سبھی قدردانوں نے بہت پسند کیا اور اظہار قدردانی کی، حضرت مولاناؒ سے متعلق جو رسائل وجرائد کے خصوصی نمبر نکلے اور کتابیں تصنیف ہوئیں، ان میں اس مکتوب کو خصوصیت سے اہمیت دی گئی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ امام حرم کا جو تعلق وقدردانی کا رویہ رہا، وہ میں نے کئی بار حضرت مولاناؒ کے ساتھ سفر میں رہنے کے موقع پر دیکھا، ان کی یہ خصوصیت وامتیاز ان کے فرزند جلیل شیخ عمر السبیل میں بھی منتقل ہوئی تھی، وہ بھی ندوۃ العلماء آئے تھے، اور ندوہ کے طلبہ سے ملاقات پر وہ حضرت مولاناؒ اور ندوۃ العلماء سے تعلق کا اظہار کرتے اور وہاں کا حال دریافت کرتے تھے، ان کے فرزند عالی مرتبت کا سڑک کے ایک حادثہ میں انتقال ہوگیا جس کا ان کو گہرا صدمہ پہونچا، یہ حادثہ طائف کے راستہ میں پیش آیا تھا، ان کی نماز جنازہ خود شیخ نے حرم مکی میں لاکھوں کے مجمع میں پڑھائی جس میں حجاج کرام کا بڑا مجمع تھا، ہمارے بعض اعزہ نے جو اس موقع پر مکہ مکرمہ میں تھے، جاکر ہماری طرف سے شیخ سے تعزیت کی، اس موقع پر شیخ کا وہ تعلق پھر ظاہر ہوا جو ان کو حضرت مولاناؒ اور ندوۃ العلماء سے تھا۔

اس حادثہ نے شیخ کی صحت کو بہت متاثر کیا، حالانکہ انہوں نے اس کو اپنی ایمانی قوت سے برداشت کرلیا تھا، لیکن ایسے باکمال فرزند کی موت جو جواں سال ہو اور جن سے مستقبل میں بڑی توقعات وابستہ ہوں، شیخ کو ہلا کر رکھ دیا، اور پھر ان کی صحت روز بروز کمزور ہوتی گئی، اور گویا عزلت نشیں ہوگئے۔

تقویٰ وطہارت، تدین، پاکیزگی اخلاق، تواضع، ملت کا درد وسوز، اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ، توحید وسنت کی اشاعت کی فکر اور اس کے لیے کوشش، عالمانہ مقام ووقار اور داعیانہ کردار ان کو اپنے عہد کے علماء میں ممتاز کرتا تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جب ان کی پہلی تشریف آوری ہوئی، جو یکم نومبر ۱۹۸۶ء میں ہوئی تھی، بڑا عالمانہ، داعیانہ اور مصلحانہ خطبہ دیا، اور الگ سے عوام کو خطاب بھی کیا، اس کے علاوہ فجر کی نماز کی بعد درس قرآن بھی دیا، دارالعلوم کے اساتذہ، طلبہ کے علاوہ، وہ علماء اور خواص بھی شریک تھے جو ان کے دیدار

وملاقات اوران کے پیچھے نماز ادا کرنے کے لیے دور دور سے آئے تھے، توحید خالص، تقویٰ، صحیح دینداری، فرائض وحقوق کا خیال اور کتاب وسنت کو مضبوطی سے پکڑنے کے ساتھ وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تلقین کی۔

شیخ کے ساتھ اس وقت کے رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف بھی تھے، انہوں نے بھی جلسۂ عام کو خطاب کیا، اور سعودی سفیر فواد صادق بھی تھے، جو ان کے اعزاز وتکریم میں دہلی سے ساتھ آئے تھے، اسی طرح دوسری تشریف آوری کے موقع پر جو گیارہ سال بعد ۱۹۹۷ء میں ۱۲، ۱۳ / نومبر کو منعقد ہوئے، عظیم عالمی، دعوتی وعلمی اجتماع کی مناسبت سے ہوئی تھی اوران کے ساتھ ایک مؤقر وفد نے بھی شرکت کی تھی، جن میں شیخ محمد بن ناصر العبودی نائب امین عام رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ اور مملکت سعودی عرب کی اور بعض ممتاز شخصیات تھیں، امام حرم نے اپنے فاضلانہ ومحققانہ مقالہ کے ساتھ شرکت فرمائی تھی، جو ردقادیانیت پر تھا، اوراس میں عقیدۂ ختم نبوت کو بڑے مدلل انداز میں پوری قوت وصراحت کے ساتھ پیش کیا تھا، ان کا یہ مقالہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے بڑی تعداد میں شائع کراکر تقسیم کرایا گیا اوراس کا اردو ترجمہ اور پھر اس سے ہندی ترجمہ بھی کراکر عام کیا گیا۔

ان دونوں موقعوں پر ہزاروں افراد نے ایرپورٹ پہونچ کر آپ کے شایان شان استقبال کیا اور لاکھوں افراد نے آپ کے پیچھے نماز جمعہ ادا کی، جس کا اعتراف شہر لکھنؤ کے سبھی اردو، ہندی، انگریزی اخبارات نے کیا، بعض غیر مسلم اخبارات نے ۵، ۶ لاکھ کی تعداد بتائی۔

اللہ تعالیٰ نے شیخ کو بڑا دینی منصب عطا فرمایا تھا، ان میں حق پرستی، حق شناسی، تواضع، ملی مسائل سے دلچسپی اور حسن اخلاق کی جو صفات تھیں، ان سے وہ لوگوں میں بڑے محبوب بن گئے تھے، اور دیوان ملکی میں بھی ان کو بڑی عزت اور مقام حاصل تھا، اور حرمین شریفین کی خدمت کی ان کو جو طویل عرصہ خدمت اور امامت کی توفیق ملی، وہ ان کی عنداللہ

مقبولیت کے لیے کافی ہے، اور لوگوں میں مقبولیت ومحبوبیت کا اندازہ ان کے جنازے میں شریک ہونے والوں کی کیفیت سے لگایا جاسکتا ہے جو دیکھی گئی، عزیزی مولوی عبیداللہ اسحاقی ندوی جو اس موقع پر وہاں موجود اور نماز جنازہ وتدفین میں شریک تھے، نے اپنا تاثر بیان کیا کہ وفات کے دوسرے دن منگل کو عصر کی نماز میں ان کا جنازہ حرم شریف میں لایا گیا، پورے حرم شریف میں بے حد ازدحام تھا، شیخ صالح بن حمید نے نماز جنازہ پڑھائی، ان کی آواز رقت آمیز تھی، وہ غالباً رو رہے تھے، ہر کوئی اشکبار، ہچکیاں لے رہا تھا، ہر کوئی غمزدہ غمگین اور افسردہ وحزین تھا، کیا شہری، کیا اجنبی، حرم شریف سے مقبرہ ''العدل'' تک یہی منظر تھا، مقبرہ میں بھی دو تین دفعہ نماز جنازہ ادا کی گئی، ہر ایک کی زبان پر دعائیہ کلمات: "اللّٰهم اغفر له، اللّٰهم ارحمه، اللّٰهم ثبته بالقول الثابت" کے الفاظ تھے۔

رحمه اللّٰه تعالیٰ رحمة النبيين والصديقين والشهداء والصالحين واحشره معهم وأدخله في جنة النعيم.

استاذ محمد المبارک

۱۳۳۱ھ ۱۹۱۲ء تا ۱۴۲۰ھ ۱۹۸۱ء

سعودی عرب میں مقیم بلند پایہ شامی مفکر و ادیب اور داعی استاذ محمد المبارک مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے جمعہ کی مبارک شب میں ۱۵ر صفر المظفر ۱۴۲۰ھ / دسمبر ۱۹۸۱ء کو دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

دعوت وفکر اسلامی اور اسلام کے دفاع کے میدان میں استاذ محمد المبارک کی جو گراں قدر خدمات رہی ہیں اس کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، ان کو جو بڑا علمی مقام حاصل تھا اس کا اعتراف یورپ کے مستشرقین کو بھی تھا اور بعض مستشرقین کے ان کی شخصیت سے متعلق مضامین بھی آئے، انھیں دنیا کے مختلف خطوں میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں، سیمیناروں میں دعوت دی جاتی اور ان کی تحقیقات وآراء سے اہم شخصیتیں بھی فائدہ اٹھاتیں، جب رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ تدریب ائمہ ودعاۃ کے لئے دنیا کے مختلف ملکوں میں مخیمات تربوی کا انعقاد کرتا تھا اس میں ان کے دروس اور محاضرات رکھے جاتے تھے۔

استاذ محمد المبارک ۱۹۱۲ء میں دمشق (سوریا) میں پیدا ہوئے، دمشق کے ہائی سکنڈری اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جامعہ سوریہ میں تعلیم حاصل کی اور ۱۹۳۵ء میں تعلیم عالی کی تکمیل کی، پھر استاد کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا، اور کلیۃ الحقوق، کلیۃ الآداب، کلیۃ الشریعہ میں استاد رہے، وزارت زراعت، وزارت مواصلات، وزارت معارف نے بھی ان کی خدمات حاصل کیں، اور ان کے مقالات ان قضایا کے تعلق سے

آتے رہے جو اسلام، عقیدہ اور زبان و آداب سے متعلق ہیں۔

انہوں نے فرانسیسی استعمار کے خلاف جہاد میں بھی حصہ لیا، یہاں تک کہ ان کے ملک شام کو آزادی حاصل ہوئی اور ایک سے زائد بار انہیں جیل میں بھی رہنا پڑا۔ پھر شام کے البعث العربی کے انقلاب کے نتیجہ میں انہیں ملک سے باہر زندگی گزارنی پڑی، اور جامعہ اردن، جامعۃ الملک عبدالعزیز جدہ، جامعہ ام درمان سوڈان اور بحیثیت استاذ زائر کے عالم عربی و عالم اسلام کی مختلف یونیورسٹیوں میں ان کی خدمات لی گئیں۔

انہوں نے اپنے پیچھے کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا، جن میں فقه اللغة، من منهل الأدب الخالد، العقيدة فى القرآن الكريم، نحو انسان سعيدة اور سلسلة نظام الاسلام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کا ندوۃ العلماء سے گہرا تعلق تھا اور یہ تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ان کے اسی تعلق کی وجہ سے قدیم بھی تھا جو حضرت مولانا کے دمشق کے دعوتی سفر میں ۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۱ء میں قائم ہوا تھا اور پھر ۱۹۵۶ء میں جب سفر ہوا تو یہ تعلق اور مستحکم ہوا۔

ان کا سانحۂ وفات ندوۃ العلماء کے لئے اور اس کے فرزندان کے لئے بڑے خسارہ کا ہے اور تمام مسلمانوں کے لئے عمومی خسارہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے، آمین۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ میں منعقد ہو رہے بین الاقوامی اسلام اور مستشرقین سیمنار میں ان کی کمی کا شدت سے احساس ہوگا جو فروری ۱۹۸۲ء / ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ میں منعقد ہو رہا ہے اور عالم اسلام و عالم عرب کی منتخب شخصیات اس میں شرکت فرما رہی ہیں، لیکن استاد محمد المبارک کی اس کے باوجود بہت کمی محسوس کی جائے گی۔

شیخ محمد محمود الصواف عراقی

۱۳۳۴ھ ۱۹۱۵ء تا ۱۴۱۲ھ ۱۹۹۲ء

عظیم خطیب وداعی اسلام شیخ محمد محمود الصواف نے استنبول ترکی میں ۱۰ر ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ کو وفات پائی جہاں وہ عراق کے حالات سے مجبور ہو کر مقیم ہو گئے تھے، ندوۃ العلماء میں ان کی وفات کی اطلاع ڈاکٹر صالح مہدی سامرائی نے جدہ سے دی، ہم سبھی لوگوں پر اور خاص طور پر خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی پر ان کے سانحۂ ارتحال کا بڑا اثر پڑا کہ ان سے ان کے گہرے روابط اور ملی معاملات میں اتحاد فکر واشتراک عمل تھا۔

شیخ صواف اس عہد کے عظیم شخصیتوں میں ایک بڑی اثر ڈالنے والی شخصیت تھے اور اسلام کے ممتاز داعیوں میں نمایاں مقام کے حامل داعی تھے، اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے وہ بڑا جذبۂ ایمانی اور جرأت وبیباکی، شجاعت وجوانمردی رکھتے تھے، نہ کسی کی ملامت وتنقید وتنقیص کی پرواہ کرتے اور نہ ہی عز وجاہ کے لئے نرم پڑتے، صاف اور صریح بات کہتے اور جب ان کو موقع ملتا تو حق بات کہنے میں بالکل نہ چوکتے لیکن مؤثر انداز میں کہتے جس کا بااختیار لوگوں پر بھی اثر پڑتا، رابطۂ عالم اسلامی کے جلسوں میں بھی وہ اپنے امتیازی مقام کے ساتھ رہتے اور یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی یا پھر شیخ محمد محمود الصواف ہی کلمۂ حق جس خوش اسلوبی سے کہہ سکتے ہیں جس کا بااختیار لوگوں پر اثر ہو دوسرا اس طرح نہیں کہہ سکتا، اللہ نے شیخ کو بڑی وجاہت دی تھی اور ورع وتقویٰ، استغناء اور دوسرے اوصاف وخصوصیات سے نوازا تھا جو داعی کے مؤثر ہونے کے لئے ضروری سمجھی

جاتی ہیں، ان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا تعلق تھا اس کا اظہار اس وقت خاص طور پر ہوتا جب یہ دونوں شخصیتیں ملتیں، اسی طرح مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کا کوئی متعلق یا ان کی نسبت سے کوئی ملتا تو بھی وہ بڑا خیال کرتے اور تواضع ومحبت واظہار تعلق سے پیش آتے جس کا مجھے خوب تجربہ ہے، مکہ مکرمہ میں جب ان کا قیام ہوتا تو وہ کعبہ مشرفہ کے سامنے حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان مغرب وعشاء کی نمازوں کے وقت بیٹھتے اور ملنے والوں سے بڑے اخلاق ومحبت سے ملتے، اگر اس کا تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ندوۃ العلماء سے ہوتا تو بڑے تعلق سے ان کے متعلق سوال کرتے اور حال وخیرت معلوم کرتے، اسی طرح ندوۃ العلماء کے ترجمان البعث الاسلامی اور الرائد سے اپنے تاثر کا اظہار کرتے اور ان دونوں کے وہ مستقل قاری تھے، اور جب ندوۃ العلماء ۱۹۷۵ء/۱۳۹۵ھ میں مہرجان تعلیمی کا انعقاد کیا اور تمام ممتاز شخصیتوں کو دعوت دی تو شیخ کو بھی اہتمام سے مدعو کیا اور انہوں نے شرکت کا پورا ارادہ کرلیا تھا لیکن کچھ حالات ومجبوریاں ایسی پیش آئیں کہ وہ باوجود چاہنے کے شرکت نہ کرسکے جس کا ان کو افسوس رہا۔

شیخ محمد محمود الصواف موصل عراق کے ایک دینی خاندان میں پیدا ہوئے، ان کے والد شیخ محمود الصواف اس منطقہ کے بڑے علماء میں تھے، انہوں نے اپنے ان ہونہار فرزند کی خالص دینی تربیت وتعلیم کی طرف خصوصی توجہ کی، اور جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ان فرزند نے ازہر مصر میں اعلیٰ تعلیم امتیاز کے ساتھ حاصل کرلی اور پھر دعوت وخطابت کے میدان میں اور علوم اسلامیہ کی خدمت میں وہ اپنے معاصرین پر سبقت لے جارہے ہیں تو انہیں ان کے دینی مقام سے بڑی راحت پہنچی، انہوں نے اپنی صرف تقریروں اور خطابت کے ذریعہ ہی پالہ نہیں مارا بلکہ اپنی مؤثر تحریروں، مضامین ومقالات اور تصنیفات کے ذریعہ بھی دعوت وفکر اسلامی اور دین کی خدمت کی، اور مادیت اور دنیاداری سے روحانیت اور آخرت کی طرف نکالنے اور مغربی تہذیب سے اسلامی تہذیب کی طرف لانے کی فکر وکوشش کی اور ایک مؤثر کتاب اذکار ودعاؤں کے تعلق سے لکھی اور نماز سے متعلق اور تفسیر سے

متعلق کتابیں لکھیں، ان کی ایک کتاب قیامت وآخرت کے احوال سے متعلق بھی ہے جس کا ترجمہ اردو زبان میں بھی ہوگیا ہے جسے ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاد مولوی شمس الحق ندوی مدیر تعمیر حیات نے کیا ہے اور اس پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ اور ان کے قلم سے مصنف کا اچھا تعارف بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس خلاء کو جو ان کی وفات سے ہوا ہے دور فرمائے اور ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین۔

شیخ محمد ولی نورولی مرحوم

۱۳۴۲ھ ۱۹۲۳ء تا ۱۴۳۶ھ ۲۰۱۴ء

نورولی خاندان گجرات کا حجاز مقدس میں مقیم مشہور پابند مذہب اور معروف کاروباری خاندان ہے، جس کے افراد اپنی کاروباری مصروفیت کے ساتھ دین ودعوت سے نہ صرف جڑے رہے ہیں بلکہ علماء اور داعیان دین کے میزبان اور ان کے خوشہ چیں رہے ہیں، گجرات کے جو افراد اپنے تجارتی ذوق کے تحت ملک سے باہر جاتے رہے ہیں نورولی خاندان ان ہی کا ایک حصہ ہے، اور اپنی خاص اہمیت رکھتا ہے، ان کے سربراہ شیخ عبدالقادر محمد نورولی گذشتہ صدی کے ابتدائی دور میں اپنے وطن پٹن گجرات سے جدہ گئے تھے، اس عہد میں مملکت سعودیہ اور ان میں حجاز کا علاقہ اقتصادی لحاظ سے ترقی کی حالت میں نہ تھا، باہر سے مال پہونچتا تھا جس سے زندگی کی ضروریات پوری ہوتی تھیں، کاروبار کے سلسلہ میں باہر سے جو لوگ وہاں پہونچے، ان کو وہاں کی ضرورت پوری کرنے کا موقع ملا، یہ لوگ ان حضرات کے علاوہ تھے، جو محض دینی جذبہ سے ہجرت کرکے مختلف خطوں سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں آکر مقیم ہوئے، ایسے لوگ حجاز مقدس کے اردگرد کے علاوہ یعنی حضرموت، یمن اور شام سے بھی آئے، اور ہندوستان، مصر اور بعض شمالی افریقہ اور حجاز وغیرہ سے بھی آئے، ان میں مراکش سے آئے ہوئے شیخ محمد نصیف صاحب مرحوم اور ہندوستان سے شیخ عبدالقادر محمد نورولی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان سے انگریزوں کی عملداری کے زمانہ میں ردعیسائیت کے مشہور ماہر

داعی ومبلغ علامہ رحمت اللہ کیرانویؒ بھی ہجرت کر کے مکہ مکرمہ میں مقیم ہوئے، ان حضرات کے قیام کے نتیجہ میں ان کے ابناء واحباب بھی وہاں آباد ہوئے، ایک نام ہندوستان کے مشہور بزرگ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی کا بھی لیا جاسکتا ہے کہ وہ بھی اس دور میں ہجرت کر کے مکہ معظّمہ میں مقیم ہوئے تھے۔

شیخ محمد نصیف علمی لحاظ سے بھی بڑی خصوصیت رکھتے تھے، اور حجاز آنے والے علماء سے ملتے اور پذیرائی کرتے اور کاروباری لحاظ سے ان کی ایسی حیثیت تھی کہ سعودی خاندان کی نئی نئی حکومت کو بعض موقع پران جیسے لوگوں سے مدد ملی، محمد نصیف صاحب کی اولاد میں محمد عمر نصیف ہوئے اور ان محمد عمر نصیف کے بیٹے عبداللہ عمر نصیف کو علمی لحاظ سے ترقی وشہرت ملی، وہ جدہ کی ملک عبدالعزیز یونیورسٹی کے نائب وائس چانسلر اور رابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل کے عہدہ پر رہے، اس کے علاوہ بھی انہیں اور ذمہ داریاں ملیں اور باہر بھی اچھے مقام کے حامل بنے۔

علامہ رحمت اللہ کیرانویؒ نے اپنے داعیانہ کام کے ذریعہ مقام بنایا، ان کے اور ان کے بھائی کی کوشش سے مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ قائم ہوا جو وہاں مدارس کی کمی کی صورت میں بڑی اہمیت کا حامل بنا، وہ اب بھی تعلیمی ودعوتی خدمات اور حجاج کی میزبانی سے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جس کے آخر میں ممتاز علمی خصوصیات کے حامل فرد مولانا مسعود ہشیم ناظم مدرسہ صولتیہ کرتے تھے ان کی یہ خصوصیات ان کے بڑے صاحبزادے مولانا ہشیم عثمانی صاحب میں بھی منتقل ہوئی ہیں جو اس وقت مدرسہ صولتیہ مکہ معظّمہ کے ناظم تھے۔

اس وقت حجاز میں مقیم ایک اہم شخصیت محمود حافظ کی معروف رہی، ان کی والدہ پیشاور کی تھیں اور وہ حجاز کے تھے اور ان کی اہلیہ شام کی تھیں، لہٰذا ان کا خاندان تین ملکوں سے مرکب خاندان بنا اور انہوں نے ان تینوں کا خیال رکھا، اور تینوں جگہوں سے آنے والی اہم شخصیتوں کی پذیرائی اور اکرام کیا، وہ خود حکومت کے سرکاری دائرہ کے فرد تھے، لہٰذا

حکومت میں بھی ان کا اثر تھا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ جب حجاز مقدس گئے تو ان کے ساتھ بڑی پذیرائی اور اکرام کا معاملہ کیا، اور اس طرح مولاناؒ کے دعوتی کام میں وہاں کی اہم شخصیتوں سے ربط و تعلق کا ذریعہ بنے، انہوں نے اپنے ایک صاحبزادے محمد الحافظ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کے لیے بھیجا، جنہوں نے ندوہ میں تعلیمی سال گذارا، ہندوستان کے گجراتی پٹنی خاندان کے بزرگ شیخ عبدالقادر نورولی نے بھی حجاز مقدس میں کاروباری حلقہ میں نمایاں مقام حاصل کیا، اور اپنے کاروبار کے ذریعہ سے وہاں بڑی ترقی کی۔

جب ۱۹۵۰ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ دعوت و تبلیغ کے ایک وفد کے ساتھ حجاز گئے جس کی سربراہی ہندوستان کے مشہور بزرگ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کررہے تھے تو وہ اپنے رفقاء کے ساتھ ان ہی کے مہمان ہوئے، شیخ عبدالقادر نورولی صاحبؒ نے بہت تعلق خاطر کے ساتھ سب کو مہمان بنایا اور اپنے اس عمل کو بعد کے لیے بھی لازم بنایا، لہٰذا بعد میں بھی جب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا حجاز مقدس کا سفر ہوتا رہا، جس میں مجھے بھی بار بار ان کی رفاقت کا شرف حاصل ہوتا رہا تھا تو جدہ کے قیام کے دوران انہی کے مکان میں ٹھہرنا ہوا، اور حجاز مقدس کے دوسرے شہروں میں بھی مہمان بننا ہوتا تھا اور مدینہ منورہ میں بھی انہی کے مکان بستان نورولی میں ٹھہرنا ہوتا۔

شیخ عبدالقادر نورولی کے کئی بیٹے تھے، ان میں بڑے بیٹے محمد نور عبدالقادر عبدالغنی نورولی بھی پورا خیال کرتے تھے، وہ اور ان کے دیگر بھائی بڑی تواضع و محبت سے ملتے اور یہ سب اہل خاندان کی طرح معاملہ کرتے اور اس خاندان کے افراد استقبال تو دبئ ایئر پورٹ تک کرتے، نورولی نامی یہ خاندان پٹن گجرات میں وہاں کی تاریخی شخصیت علامہ محمد طاہر پٹنی کے یادگار مدرسہ کا بھی سرپرست تھا، اور حجاز میں رہتے ہوئے مدرسہ کی فکر کرتا تھا، نورولی سربراہ خاندان کے مورث اکبر عبدالغنی محمد نورولی تھے، جدہ میں مقیم ان کے صاحبزادہ شیخ عبدالقادر نورولی تھے، شیخ عبدالقادر کے ایک بھائی عبداللہ نورولی تھے جو شیخ عبدالقادر کے

شریک کار تھے، عبداللہ نورولی کے بیٹوں میں محمد ولی نورولی زیادہ معروف رہے، انہوں نے حضرت مولانا سے استرشاد کا تعلق قائم کیا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو خلافت بھی دی، اور اس راہ میں انہوں نے ترقی کی فکر رکھی، اور تقرب الی اللہ کے اعمال کے وہ پابند رہے۔

جدہ کے سرپرست خاندان شیخ عبدالقادر نورولی کے بڑے بیٹے محمد نور اپنی سوجھ بوجھ، اخلاق ومحبت اور اہل اللہ سے تعلق رکھنے میں زیادہ محتاط تھے، ان کا کاروبار بہت پھیلا، اور اس کی شاخیں ریاض، جدہ، مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ میں پھیلی ہوئی تھیں، یہ اپنے والد عبدالقادر نورولیؒ کے بعد حضرت مولاناؒ سے اپنے والد ماجد کے زمانہ جیسا تعلق رکھتے اور بڑے اصرار سے اپنا مہمان بناتے اور ان کے رفقاء کے ساتھ بھی محبت واخلاق کا معاملہ کرتے۔

شیخ محمد ولی نورولیؒ کا مزاج شروع سے زیادہ دین پسندی اور تعلق مع اللہ کو مضبوط کرنے اور دین میں رسوخ پیدا کرنے کا تھا، اس لیے وہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے بیعت ہوکر داخل سلسلہ بھی ہوئے اور ان کے تلقین کردہ معمولات کے ہمیشہ پابند رہے، اور اس کا اہتمام رکھا کہ رمضان المبارک کا پورا مہینہ یکسوئی کے ساتھ مسجد حرام مکہ معظّمہ میں گذاریں اور یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ گذشتہ ماہ مبارک کی ۲۳ویں تاریخ کو جمعہ کے دن داعی اجل کو بلدامین میں لبیک کہا، اس میں ان کو اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے مناسبت رہی کہ ان کا انتقال بھی انہی تاریخوں میں اور جمعہ کے دن ہوا تھا، آخری عشرہ کی وجہ سے بہت بڑے مجمع نے حرم شریف میں جمعہ کی نماز کے بعد ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی، اور جنۃ المعلاۃ میں تدفین عمل میں آئی، للّٰہ ما أخذ وله ما أعطى وكل شئی عنده بأجل مسمى، غفر الله تعالیٰ له وأدخله فی العليين مع الأبرار المتقين.

حضرت مولاناؒ سے استرشاد وخلافت کا تعلق ہونے کی بناپر مجھ سے بھی وہ قریبی ربط ومحبت کا رویہ رکھتے تھے، اور یہ غالباً ہم عمر ہونے کی وجہ سے بھی تھا اور وہ خال معظم حضرت

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے محبت وعقیدت کی وجہ سے ان سے جو میرا رشتہ تھا، اس کا وہ لحاظ کرتے تھے، اور جب میں حضرت مولاناؒ کے انتقال کے بعد حجاز مقدس حاضر ہوا تو تعلق خاطر سے وہ ملتے اور اظہار محبت وتعلق فرماتے رہے، عمر کے ساتھ ان کی صحت کمزور ہوتی چلی گئی تھی، پھر بھی وہ خیال فرماتے، بعد کے سفروں میں میرا جوان کی زندگی میں حجاز مقدس کا آخر سفر تھا اور جدہ میں عزیزی ضیاء عبداللہ ندوی سلمہ کے یہاں قیام تھا وہ ملاقات کے لیے از خود تشریف لائے، ان کی گفتگو سے برابر دین میں ترقی کی فکر ظاہر ہوتی تھی۔

حضرت مولاناؒ سے تعلق کی بنیاد پر مولانا کے اہل تعلق اور مولاناؒ کے ادارہ ندوۃ العلماء سے اور اس سے نکلنے والے رسالوں اور اس کے دارالاشاعت کی کتابوں سے بھی ان کا تعلق تھا، اسی تعلق کی بناء پر وہ ندوہ کو تعاون بھی بھیجتے، اور اس کے رسالوں ’’تعمیر حیات‘‘، ’’الرائد‘‘، ’’البعث الاسلامی‘‘ اور حضرت مولاناؒ کی کتابوں سے استفادہ کے لیے رقوم کی فراہمی بھی کرتے، مزید زکوٰۃ کی بھی اچھی رقم ندوۃ العلماء کے لیے بھیجنے کا اہتمام کرتے اور دارالعلوم کی ترقی کی فکر کرتے، جیسے انھیں اپنے خاندان کی سرپرستی والے مدارس واداراوں کی فکر تھی۔

محمد نور ولی کتابوں کے مطالعہ کے خود بھی بڑے شائق تھے، خاص طور پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تحریروں اور مضامین سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، خاندان میں ان کے بڑے الحاج عبدالقادر نور ولی صاحب زیادہ نمایاں تھے، اور ان کا مستقر برابر جدہ میں تھا، اور شارع قابل میں ان کی کئی منزلہ عمارت تھی، جس کے زمینی حصہ میں دکان تھی اور اوپر کی منزلوں میں خاندان کے افراد اور مہمانوں کے لیے جگہیں تھیں، یکے بعد دیگرے ان کے خاندان کے افراد جو مدینہ منورہ، مکہ معظّمہ اور جدہ میں مقیم ہیں، وفات پاتے گئے، آخر میں ان کی وفات کی خبر ملی جو ہم سب کے لیے رنجدہ تھی اور ایک محترم فرد خاندان کے حادثہ وفات کی طرح سنی گئی، مگر مکہ معظّمہ میں اور ماہ مبارک میں وفات کا پیش آنا اور پھر رمضان میں نماز جمعہ کے بعد نماز جنازہ اور جنۃ المعلاۃ میں تدفین، یہ سب باتیں ان کے لیے ایک

ساتھ جمع ہوگئیں جوان کے لیے بڑی شرف وسعادت کی بھی بات ہے،ان کے صاحبزادہ قاری اسماعیل نورولی قرآن مجید کے نہ صرف جید حافظ وقاری ہیں بلکہ لوگوں میں اس کی اشاعت کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور خادم الحرمین الشریفین شاہ سلمان بن عبدالعزیز کی طرف سے مملکت میں منعقد ہونے والے قرآنی مسابقات میں جج بھی بنتے ہیں۔

شیخ نادر عبدالعزیز النوری

۱۳۷۴ھ ۱۹۵۴ء تا ۱۴۳۵ھ ۲۰۱۴ء

داعی اسلام سعادۃ الشیخ نادر عبدالعزیز النوری نے ۱۶ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ ۱۶ اپریل ۲۰۱۴ء کو صبر وہمت اور رضا بالقضاء کی اعلیٰ مثال قائم کر کے ایک مثالی مومنانہ زندگی گذار کر کویت میں وفات پائی، جہاں سے انہوں نے صرف بلاد عربیہ کو ہی نہیں، ممالک اسلامیہ اور دوسرے غیر اسلامی ممالک میں آباد مسلمانوں کو دینی وایمانی تقویت پہونچانے کے لیے وہ کام کیے، جو نا قابل فراموش ہیں، ان کو یہ خصوصیات اور اعلیٰ انسانی صفات اس دینی وایمانی ماحول وتربیت گاہ سے حاصل ہوئی تھی جس کی سرپرستی ان کے عم بزرگوار عالم جلیل شیخ عبداللہ النوری کرتے رہے تھے، اور انہوں نے ہمدردی وتعاون کا ذریعہ اپنے ملک تک محدود نہ کرتے ہوئے دنیا میں جہاں بھی اس کی ضرورت ہوتی، وہاں تک وسیع کیا تھا، اس کو ان کے برادرزادہ شیخ نادر النوری نے اور وسیع اور مستحکم کیا، شیخ عبداللہ النوری کی شخصیت ایک بڑی علمی شخصیت بھی تھی، وہ قاضی، مفتی اور بڑے عالم ہونے کے ساتھ داعی حق اور بڑے مصنف بھی تھے، وزارت شؤون اسلامیہ میں سکریٹری کے منصب پر بھی رہے تھے، ہمیں کویت میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اور بھی مختلف موقعوں پر ملاقاتیں رہیں، شیخ نادر النوری نے ایسی عظیم صفات وخصوصیات کے زیر سایہ تربیت حاصل کی تھی، اوران کو مشہور داعی شیخ عبداللہ علی مطوع رئیس جمعیۃ الاصلاح کی رفاقت بھی ملی، اور ملت کے خیر وصلاح اور دوسرے رفاہی ودینی کاموں میں ملت کو بلا کسی تفریق کے نفع پہونچانے

میں ایک دوسرے کے مشورے سے بڑے کام انجام دیئے، جس سے اسلامی بیداری اور ملت کے کاز کو بڑا نفع پہونچا، شیخ نادر النوری جمعية الشيخ عبدالله النوری کے امین عام لجنة التعريف بالاسلام کے صدر، لجنة فلسطين الخيرية کے صدر، حیاء خیریۃ اسلامیۃ عالمیہ کے مدیر عام، مؤسسة الاغاثة الاسلامية کے مجلس امناء کے ممبر اور مجلس الكلية الاسلامية فرانس کے ممبر وزارت اوقاف کویت کے ادارہ خارجی روابط کے مدیر اور مختلف تنظیموں اور اداروں کے رکن کی حیثیت سے دین وملت اور اسلام ومسلمانوں کی نصرت کا بڑا نمایاں کردار پیش کیا، وہ ملکی وغیر ملکی کانفرنس سیمینار اور اجتماعات میں بھی حصہ لیتے تھے، اور خود ایسے اجتماعات کراتے، جو دعوت وتعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے میں معاون ہوں۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ عالم اسلام کو ان کی زیادہ ضرورت تھی، ان کا سانحہ وفات کا پیش آنا یقیناً بڑا ملی خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ پوری ملت کی طرف سے انہیں بہترین جزائے خیر دے، اور ان کی خدمات وجذبات کو قبول فرمائے، اور ان کے قائم کئے ہوئے سلسلہ خیر واعانت کو جاری رکھے، اور ان کو انبیاء وصدیقین وشہداء وصالحین کا ساتھ نصیب فرمائے۔ آمین

شیخ ناصر الدین الالبانی

۱۳۳۳ھ ۱۹۱۴ء تا ۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء

ابو عبدالرحمٰن محمد بن الحاج نوح بن نجاتی محدث کبیر، نابغۂ روزگار شخصیت المعروف بہ شیخ ناصر الدین البانی نے دمشق میں ۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء کو وفات پائی، علم وتحقیق سے عبارت ان کی زندگی اہل علم وتحقیق کے لئے ہمیشہ مشعل راہ رہے گی، انہوں نے دین وشریعت اور حدیث وسنت کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں اس سے متقدمین اور سلف کی یاد تازہ ہوتی ہے، ان کی بہت سی تصنیفات وآراء سے اختلاف کی پوری گنجائش کے باوجود ان کی شخصیت اس عہد کی بڑی غیر معمولی شخصیت کے طور پر یاد کی جائے گی، خاص طور پر ان کا سلسلة الاحادیث الصحیحه اور سلسلة الاحادیث الضعیفه بڑا علمی کارنامہ ہے۔

وہ ایک مدت تک جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں استاد حدیث بھی رہے اور طلبہ نے ان سے میدان علم وتحقیق میں بڑا استفادہ کیا، انہوں نے حدیث کے راویوں اور جرح وتعدیل کو اپنا خاص موضوع بنایا تھا، اور اس میں انہوں نے اتنی ترقی کی کہ وہ اس میدان کے شہسوار بن گئے، اور ان کی ان خدمات کے اعتراف میں حکومت سعودی عرب نے شاہ فیصل ایوارڈ سے بھی نوازا۔

شیخ کی ولادت البانیا کے قدیم پائے تخت اشقودرہ میں ہوئی، ان کے والد علماء احناف کے بڑے مقتدر علماء میں سے تھے، جب البانیا میں عورتوں کے حجاب پہننے پر پابندی

لگی، اس وقت ان کے خاندان نے حکومت کے اس فیصلے سے اختلاف کیا، اور انہیں وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا، وہ وہاں سے ہجرت کر کے دمشق منتقل ہوئے، دمشق میں ہی شیخ کی ابتدائی تعلیم کی تکمیل ہوئی، ان کے والد نے اس وقت موجودہ نظام تعلیم کو دیکھ کر بجائے اس کے کہ ان کو کسی مدرسہ میں داخل کرتے خود ان کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اٹھائی، اور ان کے لیے ایک خاص نصاب مقرر کر کے اس کے مطابق ان کو تعلیم دینا شروع کیا، اس دوران اپنے والد سے گھڑی سازی کا کام بھی سیکھا، اور اس میں اتنی مہارت پیدا کی، کہ اسی سے اپنا معاشی نظام چلانا شروع کیا، اگر چہ ان کے والد نے حدیث کی طرف ان کو زیادہ رغبت نہیں دلائی تھی لیکن ان کا فطری ذوق اور حدیث کی طرف رجحان اور شریعت کو اس کے اصل مصادر سے حاصل کرنا اور سنت کی اتباع کے شوق نے ان کو حدیث کی طرف متوجہ کیا، اور بیس سال کی عمر میں پوری تندہی کے ساتھ حدیث کی متوجہ ہوئے، اور ان کا پہلا کام حدیث کے سلسلہ میں "المغني عن حمل الأسفار في تخريج مافي الأحياء من الأخبار" نامی کتاب کی تنسیخ وتعلیق تھی، اس سے دمشق کے علمی حلقے میں وہ پہچانے جانے لگے، کچھ دنوں بعد ہی دمشق کے مکتبہ ظاہریہ والوں نے شیخ کے علمی کاموں کے لیے ایک کمرہ مختص کر دیا، اور لائبریری کی ایک کنجی بھی شیخ کے حوالے کر دی، تاکہ وہ جب چاہیں اس سے علمی استفادہ کر سکیں، ان کی پہلی مکمل تصنیف تحذیر الساجد من اتخاذ القبور مساجد ہے، ہفتہ میں ان کے دروس کا سلسلہ بھی شروع ہوا، اور بڑی تعداد میں طلباء وعلماء وعوام نے ان سے استفادہ کیا، اور اسی دوران شام کے مختلف شہروں میں ان کے دعوتی دورے ہونے لگے، ان کی بڑھتی ہوئی علمی شہرت کے باعث جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ان کو بحیثیت استاد کے دعوت دی گئی اور وہاں انہوں نے ۱۳۸۱ھ سے ۱۳۸۳ھ تک خدمت انجام دی، آپ کے اہم مشائخ میں جن سے آپ نے استفادہ کیا وہ آپ کے والد کے علاوہ شیخ محمد سعید البرھانی شیخ محمد بھجۃ البیطار وغیرہ ہیں، ۱۹۶۰ء کے اوائل میں حکومت کی طرف سے آپ کو نگرانی میں رکھا گیا، اور ۱۹۶۷ء میں باقاعدہ ان کو اسی جیل میں بند کیا گیا جہاں ابن تیمیہ کو قید کیا گیا تھا،

اسی دوران جنگ چھڑنے کی وجہ سے ان کو چھوڑ دیا گیا، اور کچھ عرصہ بعد پھر دوبارہ حسکہ کے قید خانے میں منتقل کیا گیا، جہاں وہ آٹھ مہینے رہے، وہاں جیل میں انہوں نے منذری کی مختصر صحیح مسلم کی تحقیق کی، پھر ان کو اردن نے اپنے یہاں بلالیا، ان کی اہم تصانیف میں سلسلہ الاحادیث کی کتابیں ہیں، اسی طرح ارواء الغليل في تخريج احاديث منار السبيل ، الثمر المستطاب فی فقه السنه والكتاب ، التوحيد أولا يا دعاة الاسلام، فتنة التكفير ،جلباب المرأة المسلمة ،وغیرہ ہیں۔

شیخ البانی ۲۸ جمادی الآخرہ ۱۴۲۰ھ ۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے ،اور اردن کے پائے تخت عمان میں ان کی تدفین عمل میں آئی ،انہوں نے اپنے پیچھے علماء، تلامذہ اور کتابوں وتصنیفات کا ایک بڑا ذخیرہ صدقہ جاریہ کے طور پر چھوڑا، میری ان سے ملاقاتیں رہی ہیں، اور ان کی شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات کو بلند کرے، آمین۔

پروفیسر نجم الدین اربکانؒ

۱۳۴۵ھ ۱۹۲۶ء تا ۱۴۳۲ھ ۲۰۱۱ء

سابق وزیر اعظم ترکی، بڑے سائنسداں، مشہور داعی اسلام اور ترکی کو اسلام کے راستہ پر واپس لانے والی عظیم شخصیت پرفیسر نجم الدین اربکان کا ۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ مطابق ۲۷ فروری ۲۰۱۱ء کو دل کا دورہ پڑنے سے انقرہ کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پروفیسر نجم الدین اربکانؒ ترکی میں اسلامی فکر کے سب سے بڑے داعی اور مفکر شیخ بدیع الزماں سعید نورسیؒ (۱) کی فکر سے بڑے متاثر تھے، جنھیں ترکی میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا روح رواں سمجھا جاتا ہے، آپ نے ترکی میں اسلامی رجحانات کو تازہ کرنے میں اور

(۱) استاد نورسی نے اپنے علم وعمل کے ذریعہ سے ایک نئی تاریخ ترکی میں رقم کی، اور مکاتب ورسائل کے ذریعہ سے ترکی میں اسلام کو باقی رکھا، ان کی پیدائش ۱۸۷۶ء کی صوبہ تبلیس کے گاؤں نورس میں پیدا ہوئے، وہ نسبتا حسینی، مذہبا شافعی، اور قومیت کے لحاظ سے کردی ہیں، مختلف مکاتب ومدارس سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، علم کا بے پناہ شوق تھا، اور ذہانت وفطانت کا خداداد عطیہ بھی تھا، کہ سو کے قریب کتابیں مختلف علوم وفنون پر حفظ کرلی تھیں، اوران کی علمی صلاحیت کی شہرت ہونے لگی ۱۹۰۷ء میں استانبول جاکر سلطان عبدالحمید دوم کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ مشرقی ترکی میں جامع ازہر کے طرز پر مدرسۃ الزہراء کے نام سے اسلامی یونیوسٹی قائم کی جائے جس میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کا نظم ہو، اور اسلامی حقائق کی نشر واشاعت کا انتظام ہو، اسی جذبہ کے ساتھ وہ شام بھی گئے اور وہاں جامع اموی میں ہزاروں علماء وعوام کے سامنے مشہور خطبہ دیا، جنگ عظیم اول کے دوران جنگ میں شریک ہوئے، اور روس کے ساتھ ایک جنگ زخمی اور گرفتار بھی ہوئے، رہائی کے بعد ترکی واپس پہونچ کرانہوں نے دار الحکمت کی رکنیت قبول کی۔

اسلام مخالف رجحانات کو دور کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے، اپنی مؤثر شخصیت اور معتدل طریقہ کار کے ذریعہ ترک قوم میں اسلام سے وابستگی کو مضبوط کیا اور ترکی قوم کے لئے اسلام پر عمل کرنے کے لئے راہ ہموار کرنے میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں حتی کہ اس کے لیے ان کو اپنے ملک سے دربدر ہونا پڑا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے ذہنی فکری ہم آہنگی رکھتے تھے اور مولاناؒ کے طریقہ کار کو ترکی کی نئی نسل کو اسلامی بنیادوں پر کھڑا کرنے میں مفید تر سمجھتے تھے، ان کی کوششوں کے ثمرات آج ہم ترکی میں دیکھ رہے ہیں۔

پروفیسر نجم الدین اربکانؒ نے اپنے دور وزارت عظمیٰ میں استنبول میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا زبردست سرکاری استقبال کیا، قطر میں مولانا کے قیام کے دوران براہ راست مولاناؒ سے استفادہ کیا۔

ترکی میں پروفیسر نجم الدین اربکان کی اسلام نواز پارٹی کے برسر اقتدار آنے سے اسلام کو وہاں پر بہت تقویت ملی، اس سے ترکی کے مذہب مخالف رویہ میں جو کئی دہائیوں سے سختی کے ساتھ قائم تھا، تبدیلی شروع ہوئی، نجم الدین اربکان اپنے مذہبی پس منظر کے ساتھ ایک معتدل سیاسی لیڈر تھے، اور مذہب کے فروغ کے لیے وہ دستوری اور جمہوری طریقہ کار کو صحیح سمجھتے تھے، انہوں نے اپنی سلامتی طبع، اور جمہوری طریقہ کار سے ترکی کے لیے یہی طریقہ اپنایا، وہ ایک موقع پر نائب وزیر اعظم رہے، پھر مذہب مخالف عناصر نے ان کو ہٹوا دیا تھا۔

= مصطفیٰ کمال نے خلافت ختم کر کے جمہوریت کی بنیاد رکھنے کے بعد ان کو انقرہ میں بلایا، مگر وہاں کا غیر دینی ماحول دیکھ کر اپنے علاقہ میں یہ واپس چلے آئے، پھر حکومت نے ان کو اپنے لیے خطرہ محسوس کیا، تو ان کو بارلا میں جلاوطن کیا، اور پینتیس سال تک آپ جلاوطن رہے، اس عرصہ میں حکومت نے ان کو زچ کرنے اور تکلیف دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، انہوں نے اپنی اس جلاوطنی میں قرآنی علوم پر متعدد کتابیں لکھی، اور لوگوں کو خطوط و رسائل لکھ کر بے دینی کے اس دور میں ایمانی قندیل کو روشن رکھا، یہ کل ایک سوتیس رسائل ہیں، جو رسائل النور کہلاتے ہیں، وہ اس کو قرآن کی معنوی تفسیر قرار دیتے تھے، ۱۹۶۰ء ۲۳ مارچ کو آپ کا انتقال ہوا، اور ان کی تدفین کے بعد بھی حکومت نے قبر کھول کر اسپارٹا میں نامعلوم جگہ پر دفن کیا، ان کی قبر اب نامعلوم ہے۔ (ترکی کا سفر، رسائل النور)

مولانا علی میاں ندوی نے جب ترکی کا سفر کیا تھا اس وقت نجم الدین اربکان حکومت میں نہ تھے صرف ممبر پارلیمنٹ تھے، وہ مولانا کی آمد سن کر ملنے آئے اور ترکی میں اسلام دشمنی کی فضا دور کرنے کے لیے اپنی کوششوں سے باخبر کیا اور اچھی توقعات کا اظہار کیا تھا، دوسری بار مولانا کے سفر استانبول کے موقع پر وہ بیرون ملک کے دورہ پر تھے، لیکن ان کے لوگ مولانا سے ملے اور مولانا کی پذیرائی کی، حکومت کے ذمہ داروں نے بھی مولانا کا بڑا خیال کیا، اور حکومتی مہمان جیسا برتاؤ کیا، مولانا کے معاملہ میں ان کا یہ رویہ عام طور پر مولانا کی مختلف تصانیف کے مطالعہ کی بناء پر تھا، جن کی ایک تعداد کا ترجمہ ترکی ہی کے ایک صاحب خیر اور ندوہ کے پڑھے ہوئے جناب یوسف قراجہ کی کوششوں کا نتیجہ ہے، یوسف قراجہ وہاں کی ایک یونیورسٹی کے پروفیسر رہ چکے ہیں اور موجودہ صدر رجب طیب اردوغان صاحب کے استاد بھی ہیں، انہوں نے وہاں مولانا کی کتابوں کے ترجمہ اور اس کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور وہاں کے ارباب حل وعقد تک مولانا کا پیغام ان کی کتابوں کے ذریعہ پہنچایا۔

(پروفیسر نجم الدین اربکانؒ ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے، ترکی میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں جرمنی کی آخن یونیورسٹی سے انجینئرنگ اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، یہ ایک بڑے سائنسداں تھے، انہوں نے ہی ٹینکوں کے جدید انجن ایجاد کئے، اور موجودہ ترکی میں تیار ہونے والے جدید جنگی آلات میں ان کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے، ۱۹۶۰ء میں ملک کی سیاست میں قدم رکھا، ۱۹۷۰ء میں پہلی مرتبہ اسلامی رجحانات رکھنے والی سیاسی پارٹی قائم کی، ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۸ء کے درمیان ترکی کے نائب وزیر اعظم رہے، ۱۹۸۰ء میں حکومت کی اسرائیل نواز پالیسی کے خلاف ایک زبردست احتجاجی ریلی نکالی جس کے نتیجہ میں ان کو جیل میں ڈال دیا گیا، جیل سے رہائی کے بعد ۱۹۸۳ء میں رفاہ پارٹی قائم کی اور اپنی سیاسی کوششیں تیز کردیں، ۱۹۸۹ء میں ترکی کے پانچ بڑے شہروں کے میونسپلٹی الیکشن میں زبردست کامیابی حاصل کی، اور ۱۹۹۶ء میں تانسو چیلر کی پارٹی سے اتحاد

کر کے حکومت قائم کی اور ملک کی معاشی حالت سدھارنے کے لیے ٹھوس ایجابی اقدامات کیے اور قرض کے بوجھ کو کم کیا، ترکی کے موجودہ قائدین (صدر جب طیب اردوغان، عبداللہ گل، بن علی یلدرم وغیرہ) انہی کے تربیت یافتہ ہیں، انہوں نے ترکی میں جدید اسلامی تحریک میں جو کردار ادا کیا ہے اس کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا) مرتب۔

پروفیسر نجم الدین اربکانؒ نے ۸۵ سال کی عمر پائی، جنازہ میں لاکھوں سوگواروں نے شرکت کی، پندرہویں صدی میں تعمیر ہونے والی فاتح مسجد کے صحن میں نماز جنازہ ادا کی گئی، جس میں اس وقت کے وزیر اعظم رجب طیب اردوغان اور صدر عبداللہ گل نے قوم کی قیادت کی، بعد ازاں ان کا جنازہ نعروں کے درمیان شاہی اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا، دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی تدفین میں فوج کے اعلیٰ افسران نے بھی شرکت کی جبکہ فوج نے ہی ان کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

ہندوستان کے مشاہیر

علماء

و

دانشوران

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء تا ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء

مربی جلیل اور عظیم مصلح ومجدد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اپنے کمالات علمی وروحانی کے ساتھ چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں جلوہ گر ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند میں باکمال اساتذہ سے کسب فیض کیا جن میں خاص طور پر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے نام نمایاں ہوئے۔ شیخ الشیوخ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی سرپرستی حاصل تھی اور یہ سرپرستی طالب علمی کے زمانہ سے جب تک حضرت مولانا حیات رہے قائم رہی۔ اولاً مولانا کو آپ سے ہی بیعت ہونے اور اصلاحی تعلق قائم کرنے کا خیال ہوا تھا، انہوں نے اس لیے اس سے روک دیا تھا کہ کہیں یہ چیز حصول علم میں مانع نہ بن جائے، بعد میں شیخ المشائخ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے یہ تعلق انہوں نے قائم کیا اور ان کی طرف سے بہت جلد اجازت وخلافت سے بھی سرفراز ہوگئے اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کی جگہ تھانہ بھون میں بھی مسند نشین ہوئے اس لیے کہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ نے اپنے وطن تھانہ بھون سے مکہ مکرمہ ہجرت فرمائی تھی۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد کانپور میں جامع العلوم میں استاد ہوگئے تھے اور ایک مدت وہاں یہ خدمت انجام دینے کے بعد پھر اپنے وطن تھانہ بھون میں اپنے شیخ کی جگہ پر بیٹھ کر افادۂ خلق اور تربیت وارشاد کے کام میں مشغول ہوگئے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اصلاح نفوس کا وہ عظیم کام آپ سے لیا جو اپنی کیفیت کے ساتھ کم کسی کے حصہ میں آیا ہے۔

بڑے بڑے اصحاب عقل ودانش اورارباب علم وفضل آپ کے دامن فیض سے وابستہ ہوکر بڑے مصلح ومربی ہوئے جن میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ، حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ، حضرت مولانا محمد حسن امرتسری جامعہ اشرفیہ لاہور، حضرت مولانا فقیر محمد پشاوری، حضرت مولانا مسیح اللہ خاں شیروانی، حضرت مولانا اسعداللہ ناظم مظاہر علوم سہارن پور، حضرت مولانا عبدالرحمٰن کانپوریؒ اورآپ کے بھانجے حضرت مولانا ظفراحمد عثمانی تھانوی اورآخر میں حضرت مولانا شاہ ابرارالحق حقیؒ کی شخصیت زیادہ نمایاں ہوئی اور بڑے وسیع پیمانہ میں ان حضرات کے ذریعہ سے اصلاح اوراشاعت علم وتبلیغ دین کا کام انجام پایا۔

یہ ان حضرات کے نام نمونہ کے طور پر پیش کیے جوآپ کے خلفاء قرار پائے تھے جوآپ کے خلفاء قرار نہیں پائے لیکن آپ کے دامن فیض سے وابستہ ہوکر ممتاز شخصیت قرار پائے ان میں خاص طور سے مولانا عبدالماجد دریابادی اورصوفی عبدالرب اناوی کواپنے اپنے میدان میں نمایاں حیثیت حاصل ہوئی۔ان کے علاوہ جن لوگوں نے آپ سے تعلیم حاصل کی ان کی بھی ایک بڑی تعداد ہے، ان میں ایک نام ہمارے نانا مولانا عبدالحی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء کا ہے، اورجن لوگوں کا آپ سے ضابطہ کا تعلیمی واصلاحی تعلق تونہیں تھا لیکن استفادہ کے لیے وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اورآپ کی صحبتوں کی برکات حاصل کیں ان میں ہمارے دونوں ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اورمولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی بھی ہیں اوران کی وجہ سے مجھے بھی حضرت کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔جب وہ لکھنؤ اپنی بیماری کے زمانہ میں علاج کی غرض سے تشریف لائے تھےاورطویل قیام فرمایا تھا، اورمسجد خواص مولوی گنج میں حضرت کا قیام تھا اور ہمارے دونوں ماموں حضرت کی مجلس میں حاضری کا پوراالتزام کرتے تھے۔

حضرت کو ان سے مناسبت ہوگئی اور مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی صاحب کے مکان پر خود اپنے تقاضے سے ایک بار تشریف لائے، ہم سب اہل خاندان کے لیے یہ ایک یادگار دن تھا، میں تعلیم کے ثانوی مراحل میں تھا کہ ایک دن یہ اندوہناک خبر ملی کہ حضرت کا سانحہ ارتحال پیش آ گیا۔ سبھی کے لیے یہ خبر صاعقہ اثر تھی، واقعہ یہ تھا کہ تربیت وارشاد، اصلاح نفوس، علم و معرفت کا روشن آفتاب غروب ہوگیا اور مریض امت نباض حکیم سے محروم ہوگئی۔ اللّٰھم اغفر له وارحمه واکرم نزله وادخله فی جنّت النعیم مع النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولٰئك رفیقا.

حضرت تو وفات پا گئے لیکن ان کے خلفاء، ان کی تحقیقات، ان کی تصنیفات، ان کے مواعظ وملفوظات، ان کی ہدایات وتوجیہات سے ان کا کام جاری رہا اور مشن آگے بڑھتا رہا، اور اپنی اپنی صلاحیتوں سے ان کے خلفاء نے اس کو بہت تقویت پہنچائی، ان کے خلفاء میں ایک نامور خلیفہ مولانا عبدالباری ندوی نے ان کی تعلیمات کو سلسلہ تجدید دین کے تحت کئی کتابوں میں نئے اسلوب میں منتقل کیا جو جامع المجددین، تجدید تعلیم وتبلیغ، تجدید معاشیات، تجدید تصوف وسلوک وغیرہ کے نام سے طبع ہو کر بہت مقبول ہوئیں۔ ان میں ایک کتاب تجدید تصوف وسلوک کو عربی میں منتقل کرنے کا کام مولانا نے میرے سپرد کیا، میری نوعمری کا زمانہ تھا، اس کتاب کے ترجمہ نے مجھے حضرت کی فکر وتعلیم سے قریب کیا اور کتاب میں التصوف والحیاۃ کے نام سے پھر المنھج الاسلامی لتربیة النفس کے نام سے طبع ہوئی۔

جہاں تک حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے علمی وتصنیفی افادات کا تعلق ہے اس میں سرفہرست کام ترجمہ قرآن مجید اور اس کی تشریح وتفسیر کا ہے جو بیان القرآن کے نام سے طبع ہو کر بہت مقبول ہوا، اور اس نے بھی تربیت اور ذہن سازی کا بڑا کام کیا، اور لوگوں کو قرآن مجید اور اس کے پیغام سے بہت قریب کیا، اس عظیم اور مبارک کام کے علاوہ ان کی کتابوں میں سب سے زیادہ فائدہ پہنچانے والی اور گھر گھر میں پائی جانے والی کتاب بہشتی زیور ہے، اس

کے بعد پھر ان کی خالص علمی کتابیں اور اصلاحی مواعظ وخطبات اور مجلسی افادات وملفوظات کے مجموعے ہیں اور یہ اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ چھوٹے بڑے سب کتب ورسائل ایک ہزار کی تعداد کے قریب پہنچتے ہیں، اور اللہ نے ان سب میں ایسی تاثیر اور برکت رکھی ہے کہ آج بھی کوئی مربی و مصلح اور عالم وداعی اپنے کو ان سے مستغنی نہیں پاتا ہے۔

مولانا اشرف علی باقوی

۱۳۵۹ھ ۱۹۴۰ء تا ۱۴۳۹ھ ۲۰۱۷ء

امیر شریعت کرناٹک عالم جلیل مولانا مفتی اشرف علی باقوی ہندوستان کی ایک رہبر شخصیت تھے، اور علمی ودینی میدانوں میں فعال وکارگذار تھے، ان سے جنوبی ہندوستان خاص طور پر اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں ملت کے مسائل حل کرنے میں مدد ملتی تھی، اور مسلمانوں کی کل ہند جماعتوں کے اہم عہدوں پر وہ اپنی خدمات سے فائدہ پہنچاتے تھے، ان سے ملت کے قائدین کو تبادلہ خیال اور مفید پروگراموں میں مشورہ ملتا تھا، اور بنگلور کی ایک موقر درس گاہ کے وہ سربراہ بھی تھے، یہ درسگاہ ''دارالعلوم سبیل الرشاد'' کے نام سے ان کے بزرگ عالم دین والد(۱) کی قائم کردہ تھی جس سے ان کا تعلق خصوصی تھا، اور وہ اس کی ترقی

---

(۱) مولانا کے والد ماجد مولانا ابوالسعود احمد امیر شریعت کرناٹک اور جنوبی ہند کے عالی قدر بزرگوں میں سے تھے، انہوں نے ہی دارالعلوم سبیل الرشاد کی بنیاد رکھی اور بعد میں مولانا اشرف علی باقوی نے اس کو ترقی دی اور درجہ کمال تک پہونچایا، آپ ایک سنجیدہ اور باوقار شخصیت کے مالک تھے، اور بیک وقت امیر شریعت کرناٹک، مہتمم دارالعلوم سبیل الرشاد، رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، نائب صدر آل انڈیا ملی کونسل اور کئی اداروں وتنظیمات کی سرپرستی کررہے تھے، مولانا کی ولادت ۲۶ فروری ۱۹۴۰ء کو شمالی ارکاٹ کے ایک قصبہ میں ہوئی، اور دینی نہج پر آپ کی پرورش ہوئی، وقت کے جید اساتذہ مفتی شیخ آدم، مولانا عبدالجبار، مولانا جعفر حسین جیسے نامی گرامی اساتذہ سے درسیات کی تکمیل کی، ۱۹۶۰ء میں آپ اس مدرسہ سے فارغ ہوئے، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند جاکر مولانا ابراہیم بلیاوی، شیخ الحدیث مولانا فخر الدین مرادآبادی سے کسب فیض کا موقع ملا، اور فقیہ امت مولانا مہدی حسن کے ماتحت افتاء کی تربیت حاصل کی، انہی ایام میں ان کے والد ماجد نے دینی علوم کی اشاعت کی غرض سے سبیل الرشاد کا افتتاح کیا اور ان کے انتقال کے بعد مہتمم کی حیثیت سے آپ نے ہی اس کام کو سنبھالا، مفتی صاحب کی خدمات کو اس علاقہ میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

کے لیے کوشاں تھے، اس درسگاہ کی بڑی خصوصیت طلبہ میں دینی مزاج بنانا اور ارشاد واصلاح دینی کا احساس پیدا کرنا ہے جو وہاں کے طلبہ میں محسوس کیا جاتا ہے، اب درسگاہ ترقی کر کے کئی اچھی عمارتوں پر مشتمل ہوگئی ہے جس سے وہاں فراخی اور تعلیم وتربیت کی آسانی پیدا ہوگئی ہے، ہندوستان کی کل ہند جماعتوں میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ملی کونسل، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، رابطہ ادب اسلامی کو ان کے مشوروں اور شرکت کار سے مدد ملتی تھی، وہ ایک موقر عالم دین اور فقہ کا اختصاص رکھنے والے تھے، اسی کے ساتھ ان کا ادبی ذوق بھی اچھا تھا جو ان کی شاعری میں دیکھا جاتا تھا، وہ اس طریقہ سے ملت اسلامیہ ہندیہ کی تقویت اور نصرت کا ذریعہ تھے، ان کی وفات سے ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کی جلد تلافی ہونا بظاہر دشوار ہے، ان کی وفات کا اندازہ ابھی نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جو عمر طے کی تھی اس میں تبدیلی ممکن نہ تھی، اب اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی کمی کی تلافی مقدر فرمائے، اور ان کی نیکیوں کا اضعافا مضاعفہ اجر انکو عطا فرمائے۔

مجھ کو ذاتی طور پر اور جن اداروں سے میرا خصوصی تعلق ہے (آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور ندوۃ العلماء جس کی شوری کے وہ ممبر بھی تھے) ان کی طرف سے میں احساس رنج پیش کرتا ہوں، ہم سب ان کے لیے دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے پسماندگان کی اس خسارہ میں مدد فرمائے، آمین۔

مولانا اطہر حسین مظاہری

۱۳۵۲ھ ۱۹۳۳ء تا ۱۴۲۸ھ ۲۰۰۷ء

اپنے عہد کی عظیم اور دینی شخصیت مولانا مفتی سعید احمد اجراڑوی کے دوسرے صاحبزادے مولانا اطہر حسین اجراڑوی سہارن پور میں صبح صادق سے پہلے ۱۶؍ جمادی الآخرہ ۱۴۲۸ھ مطابق ۱۲؍ جولائی ۲۰۰۷ء کو جمعرات کے دن وفات پاگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون.

مولانا اطہر حسین صاحب آخر شوال المکرم ۱۳۵۲ھ جمعرات کے دن (۱۹۳۳ء) پیدا ہوئے اس طرح وہ اپنے عظیم المرتبت اور مربی بھائی مولانا مفتی مظفر حسین مظاہری سابق ناظم جامعہ مظاہر علوم سہارن پور سے چار سال چھوٹے تھے، ۱۲؍ سال کی عمر میں حفظ مکمل کیا، اور مظاہر علوم سہارن پور میں تعلیم کے پانچ سال گزارے اور یہیں سے سند فراغت حاصل کی اور پھر استاد بھی ہوگئے، ان کو عربی زبان وادب سے بڑی دلچسپی تھی اس لیے وہ ادب کے ہی استاد اور مصنف کے طور پر مشہور ہوئے اس کے علاوہ فقہ، تفسیر وحدیث سے بھی ان کا اشتغال رہا، ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں ۴۸ ہیں، وہ عربی کے اچھے شاعر بھی تھے، مظاہر علوم سہارن پور کی عربی میں منظوم تاریخ بھی لکھی۔

مولانا اطہر حسین مظاہری اگرچہ کسی انتظامی عہدہ پر نہیں رہے لیکن علمی لحاظ سے بڑے پایہ کے شخص رہے، اور تدریسی شعبہ میں خصوصی مقام رکھتے تھے، اپنے ان کمالات وخصوصیات کے ساتھ ان کی یہ ایک اور خصوصیت ظاہر ہوئی کہ انہوں نے اپنے کو شہرت کے راستوں سے الگ رکھا، حالانکہ علمی، ادبی اور تعلیمی لحاظ سے ان کا خاص مقام رہا، لیکن وہ شہرت

کی جگہوں اور موقعوں سے بچتے تھے، اور ورع وتقویٰ میں وہ دوسروں پر فائق سمجھے جاتے تھے۔

وہ متعدد اہم کتب کے مصنف اور ادب وشاعری میں خصوصی صفت کے حامل تھے، عربی ادب میں ان کو یہ امتیاز حاصل ہوا کہ عربی شاعری جو کہ کسی ہندوستانی عالم کے لئے بڑی مہارت اور قابلیت کی متقاضی ہے، حضرت مولانا اطہر حسین صاحب کے لئے آسان بن گئی تھی، چنانچہ عربی میں ان کی تفصیلی نظمیں ہیں، ان کی یہ شاعری دیکھ کر عربی شعروادب سے خصوصی ذوق رکھنے والوں نے ان کی شاعری کو اچھی داد دی، اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔

ان کی ایک خوبی یہ بھی ظاہر ہوئی کہ جب انھیں ان کے بڑے بھائی مولانا مفتی مظفر حسین مظاہری کے بعد ان کو وہ منصب دیا جانے لگا تو انہوں نے قبول کرنے سے معذرت کردی لیکن پھر ان ہی کے صاحبزادے مولانا محمد سعیدی کو وہ منصب عطا کیا گیا، اور مظاہر علوم وقف کے وہی اب ذمہ دار (متولی وناظم) ہیں، انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۶ سال تھی، یہی عمر ان کے بڑے بھائی کی انتقال کے وقت تھی۔ رحمه اللّٰه رحمةً واسعةً وادخله فی جنت النعیم.

افتخار فریدی

۱۳۲۴ھ ۱۹۰۶ء تا ۱۴۰۹ھ ۱۹۸۸ء

مشہور داعی اور مبلغ اسلام جناب افتخار فریدی صاحب امروہوی نے ایک طویل علالت کے بعد اپنے وطن مرادآباد میں وفات پائی، ان کی عمر ۸۲ سال تھی، ان کا سانحہ ارتحال ماہ اکتوبر ۱۹۸۸ء میں پیش آیا۔

افتخار فریدی صاحب نے پہلے سرگرم سیاست میں حصہ لیا اور ملک کی آزادی کی تحریک میں قربانی دی جو انگریزی سامراج کے خلاف چل رہی تھی، ۱۹۴۱ء میں اس کے نتیجہ میں ان کو سات مہینے قید و بند کی صعوبتیں اٹھانی پڑیں، انہوں نے صحافت کے ذریعہ ملک وملت کی خدمت انجام دی، مؤتمر کے نام سے ایک ویکلی جریدہ نکالا، پھر وہ تبلیغی جماعت سے وابستہ ہوگئے اور حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے وفاشعار خادم اور تبلیغی جماعت کے بڑے سرگرم داعی بن گئے، اس کے ذریعہ ان کے علماء ومشائخ اور خواص وعوام سے تعلق خالص دینی بنیاد پر مضبوط ہوا، اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انہوں نے اس کام کی تحریک چلائی جس سے وہاں کے اسٹاف اور طلبہ تبلیغی کام سے خوب جڑے، اور دینداری کی ہوا چلی، لوگوں میں دین پر چلنے کی روش عام ہوئی، اور اس تحریک کے اثرات ان کے ذریعہ سے خوب پھیلے، یورپ کے ممالک اور اسلامی خطوں میں انہوں نے جماعتیں تشکیل کر کے روانہ کرائیں، اور پورے عالم میں اس کام کو فروغ دیا، اس طرح دعوت وتبلیغ کے فروغ میں جو تبلیغی جماعت کا نظر آرہا ہے، افتخار فریدی صاحب کا بھی بڑا حصہ ہے، لیکن آخر میں ان پر

غیر مسلموں میں دعوت کے کام کا غلبہ ہو گیا اور عملی طور پر وہ تبلیغی جماعت کے پلیٹ فارم کے بجائے مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی (۱) کے ساتھ اسلام کے تعارف کے کام میں لگ گئے اور پھر بیماریوں اور اعذار کے نتیجہ میں وہ صاحب فراش ہو گئے، ان کا ندوۃ العلماء سے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بڑا محبانہ تعلق تھا اور وہ ندوہ آتے تھے اور کئی کئی دن قیام فرماتے تھے۔

لکھنے لکھانے کا مشغلہ رکھا اور وصایا، عورت، مکتوبات مولانا محمد الیاس اور دوسری کتابیں تصنیف کیں جو مقبول ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات کو بلند کرے۔ آمین

---

(۱) مولانا بڑے دیندار اور صاحب تقویٰ انسان تھے، مولانا الیاس صاحب بانی تبلیغ کے مجاز اور ان کے دست راست تھے، انہوں نے تبلیغ کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا، ہر وقت اسی کی دھن میں سوار رہتے تھے، آپ کی کئی تصانیف بھی ہیں، اللہ نے ان کے ذریعہ سے اپنے دین کی تقویت کا کام لیا، معذوری کے باوجود دین کے کام میں لگے رہتے، مولانا ۱۹۰۶ء ۱۱ مئی کو پیدا ہوئے، والدہ کا آپ کے بچپنے میں ہی انتقال ہونے کی وجہ سے خالہ نے آپ کو اپنی آغوش میں لیا، مولانا عبداللہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، مولانا الیاس صاحب ان کو بعد میں اپنے ساتھ دہلی لے آئے، اور وہاں باقاعدہ عربی تعلیم دلائی، مشکوۃ شریف تک حضرت مولانا الیاس صاحب سے تعلیم حاصل کی، شدھی تحریک کے خلاف سب سے پہلے جماعت لے کر روانہ ہوئے اور اس فتنے کی روک تھام کی، سہارنپور جا کر دورۂ حدیث کی تکمیل کی، پھر حیدر آباد میں ملازمت بھی کی، اہلیہ صاحبہ کے انتقال کے بعد کاندھلہ میں مولانا الیاس صاحب نے پھر آپ کو نظام الدین چلنے کے لیے اصرار کیا، اور اس طرح یہ دوبارہ مرکز نظام الدین آئے، مولانا الیاس صاحب کو اپنے رفقاء میں سب سے زیادہ آپ پر اعتماد تھا، اور انہیں ہر لحاظ سے اپنے مزاج وفکر کے سانچے میں ڈھالا تھا، نظام الدین کے مدرسہ کاشف العلوم کے انتظام واہتمام کا کام اور تبلیغی مشوروں میں شرکت آپ کا لازمہ تھا، مولانا نے اپنے پیرومرشد کے ہمراہ تین حج کیے، پیرومرشد کی وفات کے بعد مسلسل بیماری اور معذوری کی وجہ سے آپ نے کاندھلہ ہی میں تصنیف وتالیف کو اپنا میدان بنایا، نہایت شستہ اور سلیس ادبی زبان لکھتے تھے، الفاظ کے انتخاب کا آپ کو ملکہ حاصل تھا، مولانا کو، مولانا الیاس صاحب، مولانا شاہ محب اللہ، مولانا شفیع الدین صاحب سے اجازت وخلافت حاصل تھی، مولانا تمام عمر مختلف امراض سے دوچار رہے، کینسر کا مرض تشخیص ہوا، اور ۱۹۷۱ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

مولانا صوفی اقبال صاحب رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۴۳ھ ۱۹۲۵ء تا ۱۴۲۱ھ ۲۰۰۰ء

حضرت مولانا شاہ محمد اقبال مہاجر مدنی ہوشیار پوری تصوف واحسان کی راہ پر ممتاز حیثیت سے گامزن رہنے والی شخصیت تھے، ان کو اپنے شیخ ومرشد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایسا فدایانہ تعلق تھا، جوان کی تصوف کی راہ میں خصوصی امتیاز رکھنے کی علامت تھا، وہ حضرت شیخ علیہ الرحمۃ کے تربیت یافتہ اور تزکیہ واحسان میں ان کے نقش قدم پر چلنے والے تھے، اور آخر میں انہی کے طریقہ پر وطن سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے تھے، اور وہاں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسوں میں اور خصوصی مواقع پر ان کی شفقت اور اعتماد کے حامل بنے ہوئے تھے، پھر ان کی وفات کے بعد اپنے اس حال کو قائم رکھتے ہوئے اپنے مسترشدین کو فائدہ پہونچاتے تھے، ان کو حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت حاصل تھی، اس کی بناء پر ان کو حضرت شیخ کے طریقہ حق کے متعلق طالبین حق کو فائدہ پہونچانے کا حق حاصل تھا، تزکیہ واحسان کے سلسلہ میں وہ جن احوال وکیفیات سے گذرے، ان کو انہوں نے قلمبند بھی کیا، اور حضرت شیخ الحدیث کے حکم سے بعض رسائل ترتیب دیئے، جن کو دیکھنے سے تزکیہ واحسان میں ان کی خصوصیت کا علم ہوتا ہے، ان سے تربیت حاصل کرنے والوں کو دیکھنے سے بھی ان کے اس مقام کا پتہ چلتا ہے، جوان کو حضرت شیخ کی جانب سے حاصل تھا۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں جانے سے پہلے وہ لکھنو اور رائے بریلی

میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادے کی غرض سے ایک مدت تک ساتھ رہے، وہ استفادہ ان کا علمی ودینی دونوں طرح کا تھا، وہ جدید تعلیم گاہ سے استفادہ کر کے دینی درسگاہ میں استفادہ کے لیے آئے تھے، اور انہوں نے تکیہ وندوہ کے ماحول میں علمی ودینی فائدہ بھی اٹھایا، حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ سفر وحضر میں بھی ساتھ رہے، جس کا حضرت مولانا نے اپنی کتاب کاروان زندگی میں تذکرہ بھی کیا ہے، انہیں کے مشورہ سے وہ حضرت شیخ کے یہاں حاضر ہوئے، اور تبلیغی دعوت وعمل سے بھی ربط ہوا، اس کے ساتھ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے جو ربط قائم ہوا تھا وہ برابر قائم رہا، حتی کہ مدینہ منورہ میں ہجرت کرنے کے بعد بھی حضرت مولانا علی میاں کی آمد پر ان کے پاس آنا اور بڑے دیرینہ تعلق کے انداز سے بات کرنا اور اظہار تعلق کرنا یہ اسی تعلق ومحبت کا نتیجہ تھا، جو شروع میں ان کا حضرت مولانا سے قائم ہوا تھا، اس کا اثر ہم لوگ بھی محسوس کرتے تھے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے تو ان سے میرا ربط ان کے شروع دور سے ہی ہو گیا تھا، جب وہ لکھنو اور رائے بریلی میں مقیم تھے، اور پھر جب میرے ماموں اور سرپرست حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے میرے لیے فیصلہ کیا، کہ میں مظاہر و دیوبند سے بھی استفادہ کروں، اس طرح حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی صحبت و استفادہ کا فائدہ حاصل ہو، تو اس سفر میں انہوں نے حضرت صوفی صاحب کو ہی میرے ساتھ کیا، جو طالب علمی ہی کے مرحلہ میں تھے، اور مجھ سے کچھ بڑے اور بڑے بھائی کی طرح تھے، اس طرح ذاتی طور پر میرا ان سے تعلق بڑھا، اور آخر تک رہا، ان سے اپنائیت محسوس ہوتی تھی اور حضرت مولانا علی میاں ندوی سے ان کی خوش دلی کی ملاقاتیں دیکھ کر بڑی اپنائیت کا احساس ہوتا تھا، تزکیہ واحسان کے میدان میں ان کی ترقی دیکھ کر ان کی عظمت وخصوصیت کا بھی احساس ہوتا، لیکن یہ اس اپنائیت کے ساتھ تھا جو شروع دور میں پیدا ہوئی تھی اور بعد میں بھی عند اللقاء اس کا احساس ہوتا رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ حضرت صوفی صاحب کو غریق رحمت کرے اور ان سے جو فیض پہونچا

اس کو قائم رکھے، ان کے حجاز کے دوران قیام ان کے مسترشدین ومعتمدین میں محبّ گرامی جناب ڈاکٹر سید اشرف الدین صاحب کو بڑی خصوصیت حاصل ہوئی، اور وہ ان سے ایسے وابستہ ہوئے کہ ان کے بعد بھی ان سے حاصل کردہ فیض کو جاری رکھا، اور اب ان کے ملفوظات وارشادات کا انتخاب کر کے سوانحی انداز سے قارئین کے سامنے لارہے ہیں، اس سے حضرت صوفی صاحبؒ سے جو لوگ قریب سے زیادہ واقف نہیں ہیں، اس سے انہیں بھی صوفی صاحب کی خصوصیات کا علم ہوگا۔

صوفی صاحب کو حضرت شیخ کی نسبت سے خاصی شہرت ملی، اور ان کو حضرت شیخ کا اس درجہ اعتماد حاصل ہوا کہ انہوں نے ان سے بعض اہم رسائل سلوک واحسان سے متعلق تصنیف کرائے، جن میں ایک کتاب اکابر کا سلوک واحسان بھی ہے، جس پر مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ کا بڑا بصیرت افروز مقدمہ ہے، صوفی صاحب کو حضرت شیخ کے علاوہ حضرت مولانا علی میاںؒ سے بھی اجازت وخلافت حاصل تھی، اور حضرت مولاناؒ کی طرف سے یہ اجازت ان کے معتمد خاص محبّ گرامی ڈاکٹر اشرف الدین صاحب کو بھی حاصل ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے ازراہ کرم مجھے اس تصنیف میں شریک کیا، جو حضرت صوفی صاحب کے متعلق ان کے دینی مقام کو واضح کرنے کے لیے ان شاء اللہ مفید ثابت ہوگی۔

حضرت قاری امیر حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۴۴ھ ۱۹۲۶ء تا ۱۴۳۴ھ ۲۰۱۲ء

ہندو پاک کی ملت اسلامیہ میں گذشتہ صدی کے عہد میں قائدانہ ومرشدانہ مقام کی حامل متعدد عظیم شخصیتوں کو ملت کی سرپرستی اور اصلاح وارشاد میں خصوصی مقام حاصل رہا، اورانہوں نے ملت اسلامیہ کی اصلاح وارشاد کے ساتھ عمومی رہنمائی اور قیادت کا فرض بھی انجام دیا، یہ شخصیتیں ایک ایک کر کے اٹھتی گئیں، اور ملت اسلامیہ ان کی سرپرستی سے محروم ہوتی گئی، قریبی عہد کی بزرگ شخصیتوں میں ایک شخصیت حضرت مولانا قاری امیر حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رہی، جو ابھی حال میں اس دنیائے فانی سے دنیائے باقی کی طرف منتقل ہوگئے، ان کی ارشاد واصلاح کی کوششوں سے دور وقریب کے علاقوں میں فیض پہونچا، وہ ایک مشفق مربی اور محترم المقام عالم دین کی حیثیت سے خدمت دین کا فریضہ پورے اخلاص کے ساتھ انجام دے رہے تھے، ان کو اپنے وقت کے بزرگوں سے جو فیض ملا تھا، وہ خاموشی و ہمدردی کے ساتھ عام کررہے تھے، قاری صاحب حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے تھے، قاری صاحبؒ نے حضرت رائے پوریؒ سے اپنی بیعت کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

”میں جب مدرسہ مظاہر العلوم میں ۱۳۵۵ھ میں داخل ہوا، حضرت قدس سرہ کو جانا، پھر بھی کیا جانا، عمر غفلت کی تھی، بیداری نہ ہونے میں عام طلباء کی طرح غافل رہا، مالک کا فضل وکرم ہوا، بغیر استحقاق کے فراغت

کے درمیان رائے پور کی حاضری مولوی عبدالمنان صاحب کے ہمراہ جو حضرت رائے پوری کے خادم تھے، ہوئی، اور میں خالی الذہن تھا، یوں ہی ساتھی ہونے کے لحاظ سے چلا گیا، تو حضرت نے فرمایاان کو کیوں لائے؟ میرے پاس تو دیہاتی آتے ہیں، یہ مولوی صاحب کو کیوں لائے؟ تو میں نے عرض کیا حضرت! میں بھی دیہاتی ہوں، پھر حضرت سے بیعت کی درخواست کی، تو حضرت نے بیعت فرمالیا، اور صرف ایک تسبیح درود شریف کی بتلادی۔

اسی درمیان میں مرشدنا حضرت شیخ قدس سرہ کی خدمت میں گاہے گاہے حاضری دیتا، اور حضرت کی شفقت میرے اوپر بغیر استحقاق کے ہوتی گئی، میری یکسوئی اور رائے پور کی حاضری میں الگ تھلگ رہنے اور کام کرنے سے حضرت نے بہت خوشی کا اظہار مجھ سے ایک مرتبہ کیا، اس طرح دونوں بزرگوں سے ربط بڑھتا گیا، پھر حضرت رائے پوریؒ کے وصال کے بعد مرشدنا حضرت شیخ قدس سرہ سے رجوع ہوا، تو تجدید بیعت کی درخواست کی، تو سنتے رہے، جب زیادہ اصرار کیا، تو شدت سے منع فرمایا کہ:

"میں حضرت مدنیؒ اور حضرت رائے پوریؒ سے جو لوگ بیعت ہیں، دوبارہ بیعت نہیں کرتا ہوں، البتہ خدمت کے لیے حاضر ہوں، اور جو معمولات حضرت رائے پوریؒ نے بتلائے تھے کرتے رہو۔"

اور معمولات ہی کیا تھے، یوں کہا تھا: کلمہ طیبہ جتنا آسانی سے پڑھ سکو مقرر کرلو، اسی طرح درود شریف"۔

یہ ناکارہ گاہے گاہے اپنا حال حضرت رائے پوریؒ کے وصال کے بعد مرشدنا حضرت شیخ کو لکھتا رہا، حق تعالیٰ کا فضل وکرم ہوا کہ یہ دونوں بزرگ اس ناکارہ بندہ سے محبت فرماتے رہے، ایک مرتبہ حضرت رائے پوریؒ نے

پوچھا، تم کتنے بھائی ہو؟ میں نے عرض کیا حضرت میرا کوئی بھائی نہیں ہے اکیلا ہوں، فرمایا۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔

قاری صاحب کو حضرت شیخ الحدیث کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کا موقع ملا، اور حضرت شیخؒ کی نیک توجہات حاصل رہیں، اور حضرت شیخ نے ان کو خصوصی انداز سے اپنی خلافت دی تھی، فرماتے ہیں۔

مؤرخہ ۲۸ رمضان بروز جمعہ قبل اذان عصر ۱۳۵۸ھ حیرت انگیز واقعہ پیش آیا، احقر سراپا تقصیر کو مرشدی و مولائی حضرت اقدس نے بھائی ابوالحسن صاحب کے ذریعہ اپنے معتکف میں طلب فرمایا، احقر حاضر خدمت ہوا، تو ارشاد ہوا کہ یہ جبہ پہن لو، جو حضرت کا مستعملہ تھا، خوشبو بے انتہا تھی، کئی مہینہ تک رہی، چنانچہ حسب ارشاد پہن لیا، پھر ارشاد فرمایا کہ آج سے تمہیں بیعت کی اجازت دیتا ہوں، یہ امانت ہے حفاظت کرنا۔

نوٹ۔ اس معاملہ سے ناکارہ کو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، حتی کہ سکتے میں آگیا، اور شام تک مبہوت سا رہا، حتی کہ بخار کی کیفیت طاری ہوگئی، یہ سب کچھ حق تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے قلب میں ڈالا، اس لیے یہ صورت ظاہر ہوئی۔

قاری صاحبؒ کچھ مدت بعد اپنی علمی و عملی زندگی کے فرائض کی ادائیگی کے لیے حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ کی درسگاہ دعوۃ الحق ہردوئی آگئے تھے، وہاں انہوں نے مولانا ابرار الحق صاحب کی رفاقت میں ان کی درسگاہ علم و ارشاد میں پہونچ کر پوری عمر لگادی، مولانا ابرار الحق صاحب کی وفات پر بھی انہوں نے درسگاہ کو نہیں چھوڑا، بلکہ اپنی فیض رسانی اس درسگاہ میں جاری رکھی، اور مولانا ابرار الحق صاحب کے جانشین حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہ کے ساتھ ان کی رفاقت تھی، اس طرح دونوں بزرگوں نے ارشاد و تربیت دینی کا فیض جاری رکھا، قاری امیر الحسن صاحب ضعف پیری کے باوجود دینی تعلیم و ارشاد کے

کاموں میں لگے رہے، بالآخر نوے ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی، ان کی وفات سے اس علم و تربیت کے کاموں میں بڑا خسارہ ہوا۔

حضرت قاری صاحب کی بزرگی، ان کی سادہ مزاج طبیعت سے لوگ بہت متاثر ہوتے تھے، وہ سب سے تواضع اور محبت سے ملتے تھے، رمضان کا مہینہ پابندی سے میل وشارم (تامل ناڈو) میں اپنے سیکڑوں مسترشدین کے ساتھ گذارتے تھے، اس طرح جنوبی ہند کے خطہ میں بھی ان کا فیض جاری ہوا، ان کو دیکھ کر اور مل کر ملنے والے کو عقیدت کا خاص احساس ہوتا تھا۔ حضرت قاری صاحبؒ شمالی بہار کے ضلع سیوان کے رہنے والے تھے، انہوں نے تعلیم مظاہر العلوم میں حاصل کی تھی، اور طالب علمانہ زندگی سے ہی اپنے قرب و جوار میں وقت کے بزرگوں کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے، اور ان سے متاثر ہوتے تھے، بزرگان وقت بھی ان کے ساتھ شفقت اختیار کرتے ہوئے ان کے لیے نیک توقعات رکھتے تھے، جو کہ عمل میں آئیں، حضرت قاری صاحب ایک عالم دین اور شیخ وقت کے طور پر ملت کے افراد کی اصلاح کے کام میں لگے، اور ان کے ذریعہ بہت سوں کی اصلاح ہوئی، ان کے دو صاجزادے اور صاجزادیاں ہوئیں، صاجزادوں کا انتقال خود ان کی زندگی میں ہوا، اس کے غم کو انہوں نے پورے ضبط نفس کے ساتھ برداشت کیا، ان صاجزادوں کی اولاد بڑی ہو کر اپنے والد کے قائم مقام ہوئی، اور حضرت قاری صاحب کو ان سے تقویت حاصل ہوئی، قاری صاحب اپنے سے استفادہ کرنے والوں کو اچھے اور ہمدردی کے انداز میں نصیحت کرتے تھے، اور نہایت صالح اور نیک طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے صلاح و تقویٰ کے ساتھ زندگی گذارتے تھے، اب اپنے مالک حقیقی کے پاس پہونچ کر ان کو ان سب باتوں کا صلہ مل رہا ہوگا،، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت و رحمت کا بلند مقام عطا فرمائے، اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل اور اجر عظیم عطا فرمائے۔

صوفی انعام اللہ لکھنوی

۱۳۴۷ھ ۱۹۲۹ء تا ۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء

دینی اور دعوتی کاموں میں ہم لوگوں کے رفیق اور ہمارے شیخ و مرشد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت و صحبت میں خاص وقت گزار کر ان کی محبت اور اعتماد حاصل کرنے والی شخصیت جناب صوفی انعام اللہ لکھنوی نے مختصر علالت کے بعد ۹ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۴ جون ۱۹۹۹ء کو لکھنؤ میں اسپتال میں زیر علاج رہ کر وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

صوفی صاحب مرحوم بڑے جفاکش اور دین و دعوت کی راہ میں قربانی دینی والی شخصیت تھے اور خانقاہ رائے پور میں انہوں نے جن ریاضات و مجاہدات کے ساتھ وقت گزارا تھا اور احسان و تزکیہ کی دولت کے حصول میں اپنے شیخ کی خدمت اور وہاں کے مقیمین اور مہمانوں کی خدمت اور ذکر و شغل کے لئے جو مقامات طے کئے گئے اس کی ظاہر شکل ان کے اپنے شیخ و مربی کے مجاز بیعت وارشاد ہونے کے طور پر سامنے آئی، اور پھر انہوں نے دعوت و تبلیغ کے ذریعہ جو مجاہدے کئے اس نے ان کے اندر مزید تاثیر پیدا کر دی تھی، وہ اپنے دینی مزاج و طبیعت کی وجہ سے ندوۃ العلماء اور اس کے ناظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بڑا مخلصانہ تعلق رکھتے اور ہم چھوٹوں کے ساتھ ان کا دوستانہ معاملہ ہوتا، یہ ان کی تواضع اور اخلاص عمل کی بات تھی۔

ان کی یہ خوش نصیبی تھی کہ ان کو پے در پے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہو رہی تھی

اوراس کاان کے لئے غیب سے ایسا انتظام ہو جاتا جو وقت سے پہلے ناممکن سا نظر آتا ہے، ان کو دنیوی مشکلات اور لوگوں کی جانب سے ایذاء پر صبر اور عفو و درگزر کے حالات سے بھی گزرنا پڑا، یہ باتیں ان کے مزید رفع درجات کا انشاء اللہ ذریعہ ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ خصوصی رحمت و مغفرت کا معاملہ فرمائے اور اپنی رضا اور مقام عالی سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

مولانا تقی امینی مرحوم

۱۳۴۵ھ ۱۹۲۶ء تا ۱۴۱۲ھ ۱۹۹۱ء

قدیم وجدید پر گہری نظر رکھنے والے، فقہ اسلامی کے محقق، برصغیر کے ایک جلیل القدر عالم دین مولانا محمد تقی امینی کا ۲۱ر جنوری ۱۹۹۱ء کو انتقال ہوگیا، مولانا مرحوم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کے سابق ڈین تھے، اور اسلام اور اس کے نظام عدل ورحمت کو عصری انداز واسلوب سے متعارف کرنے والے اپنی متعدد تصنیفات کی بنا پر پورے عالم اسلام میں معروف ومقبول تھے۔

مولانا مرحوم فقہ اسلامی کی جدید تدوین کے حامیوں میں تھے اور اس موضوع پر ان کی کتابیں بہت وقیع سمجھی جاتی ہیں، جن میں اسلام کا زرعی نظام، فقہ کا تاریخی پس منظر، اجتہاد کا تاریخی پس منظر اور مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر بہت اہم ہیں۔ اس کے علاوہ حدیث کا درایتی معیار، احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، تہذیب کی تشکیل جدید اور کائنات میں انسان کا مقام وغیرہ تصنیفات بھی دینی وعلمی حلقوں میں بہت مقبول ہیں، آخری عمر میں ''ہدایت القرآن'' کے عنوان سے قرآن پاک کی تفسیر بھی شروع کی تھی، لیکن سورہ مائدہ تک پہنچے تھے کہ مالک حقیقی کا بلاوا آگیا، مولانا پچاس سے زائد مضامین کی شکل میں بھی اپنا علمی ورثہ چھوڑ گئے۔

مولانا محمد تقی امینی ۵ر مئی ۱۹۲۶ء (۲۲ر شوال ۱۳۴۴ھ) کو اتر پردیش کے ضلع بارہ بنکی قصبہ سیحہ میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام عبدالحلیم تھا، ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں حاصل کی پھر جامع العلوم کان پور میں علم حاصل کیا جہاں سے مدرسہ امینیہ دہلی بھیجے گئے، یہاں انھیں مفتی

کفایت اللہ مرحوم اوراس وقت کے بعض دوسرے اکابر علماء سے اکتساب فیض کی سعادت حاصل ہوئی، لیکن مولانا مرحوم اپنے نام کے ساتھ امینی کا استعمال مدرسہ امینیہ کی رعایت سے نہیں بلکہ اپنے ''نظریۂ امانت'' کی بنیاد پر کرتے تھے، یاد رہے کہ مولانا امانت کو دین کی اساس قرار دیتے تھے اوراسی بنیاد پر گویا انہوں نے مختلف فقہی احکام کی حکمت بیان کی ہے۔

مدرسہ امینیہ سے فراغت کے بعد مدرسہ سبحانیہ، جامع العلوم کانپور، مدرسہ فرقانیہ اور مدرسہ ثانویہ ناگپور اور دارالعلوم معینیہ اجمیر میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، وہ ۱۹۶۴ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لکچرار اور ناظم سنی دینیات مقرر ہوئے، اور ۱۹۸۴ء تک متعلقہ خدمات انجام دیتے رہے، اس وقت کے وائس چانسلر سید حامد نے انھیں پروفیسر شپ کی پیش کش کی اس کے بعد وہ اگست ۱۹۸۶ء تک صدر شعبۂ سنی ودینیات اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی کی حیثیت سے تعلیمی وانتظامی فرائض انجام دیتے رہے، سابق وائس چانسلر سید ہاشم علی نے ان کی ملازمت میں ۱۹۸۹ء تک توسیع کی۔ مولانا مسلم یونیورسٹی میں اپنی خدمات کے طویل دور میں ہر جمعہ کو جامع مسجد میں خطبہ بھی دیتے تھے، جسے پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی بڑے ذوق وشوق سے سنتے تھے۔

مولانا کچھ عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے وابستہ رہے جہاں انھوں نے ادارہ تحقیقات شرعیہ کے کنوینر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیئے، لیکن یہاں بھی ان کا قیام زیادہ دنوں تک نہیں رہا، اور آخر کار ان کی بے چین طبیعت کو مسلم یونیورسٹی میں قرار ملا، مولانا مرحوم نے وعظ وتقریر اور مناظرہ کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے، لیکن بعد میں تبلیغ کے اس طریقہ کو مؤثر نہ پاکر اس میدان سے کنارہ کش ہوگئے، اس مرحلہ پر ان کے وطن سیجہ کے قریب واقع موضع تھلواڑہ کے چودھری محمد شفیع احمد مرحوم نے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ابتدائی رفقاء میں شامل تھے، مولانا امینی کی ہمنوائی، قدردانی، اور پشت پناہی کی۔ تصنیف وتدریس کے ساتھ وہ سماجی کاموں میں حصہ لیتے رہے۔ اور مسٹر منظور حسین ایڈوکیٹ اور ریڈینس ویکلی کے سابق ایڈیٹر محمد یوسف صاحب مرحوم جیسے فعال اور سرگرم لوگوں کے ساتھ وہ دینی تعلیمی کونسل کے بھی روح رواں رہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی محدث

۱۳۱۹ھ ۱۹۰۱ء تا ۱۴۱۲ھ ۱۹۹۲ء

ممتاز عالم دین اور محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کا ۱۱ر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۷ر مارچ ۱۹۹۲ء کو انتقال ہوا۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی علم حدیث اور فن اسماء الرجال کے ممتاز عالم تھے، درس وتدریس اور فن حدیث سے آپ کا انہماک مستقل رہا ہے اور آپ کی تحریریں اور مراجعات بڑی اہمیت کی حامل اور اہل علم کی نگاہ میں بڑی وقیع سمجھی جاتی ہیں، مولانا کا شمار فن حدیث اور اسماء الرجال کے چوٹی کے علماء میں ہوتا تھا جس کی گواہی آپ کی علمی کاوشیں دیتی ہیں۔

مولانا کی ولادت ۱۳۱۹ھ میں ہوئی آپ کے والد کا نام مولانا محمد صابر تھا، آپ نے دار العلوم دیوبند میں کچھ وقت گزارا۔

آپ کے اساتذہ میں مولانا انور شاہ کشمیری، مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا کریم بخش سنبھلی اور مولانا عبد الغفار صاحب مئوی قابل ذکر ہیں۔

آپ نے ۱۳۲۹ھ میں تعلیم سے فراغت حاصل کی اور اسی سال سے دار العلوم مئو میں تعلیمی خدمات انجام دینا شروع کر دیں، دو تین سال کے بعد مدرسہ مظہر العلوم بنارس چلے گئے اور وہاں علوم نقلیہ وعقلیہ کی تعلیم دی، اس کے بعد مدرسہ مفتاح العلوم از سر نو قائم کیا اور اس سے پوری طرح سے وابستہ ہوگئے، آپ نے تدریسی خدمات ہی کے تحت دار العلوم ندوۃ العلماء میں آکر بخاری شریف کا درس دیا۔

مولانا فن حدیث میں امام طحاوی کی تصنیفات سے سب سے زیادہ متاثر تھے، حافظ ابن حجر عسقلانی کے بھی بڑے قائل تھے، اور فقہ میں ابن ہمام اور شامی کی تدقیقات سے دلچسپی تھی۔

آپ نے حج وزیارت کے ساتھ علمی تلاش وجستجو کے سلسلہ میں کویت، بیروت، دمشق اور بحرین کا بھی سفر کیا، ان اسفار میں ان کے ہمراہ مولانا ضیاء الحسن ندوی مرحوم تھے جن کا اشتغال بھی حدیث سے بہت بڑھا ہوا تھا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بخاری شریف کا درس دیتے تھے۔

مولانا کا شمار وقت کے بڑے محققین واکابر علماء میں تھا جن کے علم وفضل کا سکہ دنیا پر بیٹھا ہوا تھا، مولانا کے علم وفضل کی شہادت کے لیے ان اہم اور نادر کتابوں کے نام کافی ہیں جن کے مخطوطات کو آپ نے تحقیق وترتیب کے موجودہ علمی اصول کے مطابق ایڈٹ کر کے شائع کیا، ان میں مسند حمیدی (دو جلد) کتاب الزہد والرقائق، سنن سعید بن منصورر دو جلدیں، المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ للحافظ ابن حجر عسقلانی۔ مصنف عبدالرزاق، مسند احمد کے علاوہ آپ نے المسند الحمیدی، علامہ محمد طاہر گجراتی صاحب مجمع البحار کا فن رجال سے متعلق رسالۃ التوسل، تعلیقات کتاب الثقات لابن شاهین، الاتحافات السنیه لذکر محدثی الحنفیه، اور الحاوی لرجال الطحاوی وغیرہ کی بھی تحقیق ومراجعت کی، مولانا نے علمی وتحقیقی مقالات بھی تحریر فرمائے جو معارف اعظم گڑھ، برہان دہلی، دارالعلوم دیوبند، العدل گجرانوالہ، الفرقان بریلی اور لکھنؤ، البلاغ بمبئی اور النجم لکھنؤ میں شائع ہوئے، آپ عربی زبان وادب میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے، عربی مقالات منجملہ دیگر رسائل وکتب کے ''البعث الاسلامی'' (۱) میں بھی شائع ہوئے۔

---

(۱) ''البعث الاسلامی'' ۱۹۵۵ء میں مولانا محمد الحسنی مرحوم کی ادارت میں سامنے آیا، اور اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اسلامی الفکر عربی صحافت میں نمایاں مقام حاصل کر لیا، عرب قومیت، الحاد و دہریت، تجدد و مغربیت، سرمایہ داری واشتراکیت اور دوسری خدافراموش تحریکات کے تعاقب واحتساب اور صحیح اسلامی فکر کی نمائندگی =

مولانا نے منکرین حدیث کی رد میں نصرۃ الحدیث، شیعوں کے رد میں ''رفع المجادلۃ'' اور رضاخانیت کے رد میں شارح حقیقی (النذر لاولیاء اللہ) بھی لکھے، اس کے علاوہ مولانا نے متعدد رسالے تحریر فرمائے جوان کے علمی اشتغال پر دال ہیں۔

مولانا نے ایک طویل عمر پائی مگر اس کو علمی اور تحقیقی کاموں کے لیے وقف کردیا تھا، دارالعلوم مئو، مظہر العلوم بنارس میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد اپنے رفیق کار مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی مرحوم اور مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی مرحوم کے ساتھ مل کر مفتاح العلوم میں بڑا وقت گزارا، اور عرصہ دراز تک تدریسی خدمات اعزازی طور پر انجام دیتے رہے، مولانا ۱۹۵۲ء میں اتر پردیش کونسل (ودھان پریشد) کے پانچ سال تک ممبر رہے، آپ کی علمی اور تحقیقی خدمات کی وجہ سے حکومت ہند نے آپ کو صدارتی انعام سے نوازا۔

= میں اس گراں قدر رسالے نے جو حصہ لیا، اس کا اعتراف عالم اسلامی اور عالم عربی ہر جگہ کیا گیا، مسلک حق کی تائید اور باطل افکار ونظریات کی پرزور تنقید وتردید میں مولانا محمد میاں مرحوم کے جراءت آمیز اور فکر انگیز اداریوں کا خاص حصہ تھا، حضرت مولانا علی میاں ندوی مولانا محمد میاں مرحوم کے اداروں پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔ ''محمد میاں کے ان زلزلہ انگیز اداریوں کا سلسلہ جاری رہا اور صحیح الفکر عرب نوجوان روز بروز ان کے گرویدہ ہوتے گئے جس ماحول اور تربیت میں ان کا نشو ونما ہوا تھا، اس کے بالمقابل دنیائے اسلام بالخصوص عالم عربی کی مذہب بیزار اور اسلام گریز قومی، اشتراکی، بعثی، مادی تحریکیں اور دعوتیں اور بہت سے ممالک عربیہ اور خاص طور پر ان ممالک کی جن کو دعوت اسلامی کا مرکز اور اسلامی دنیا کے لیے نمونہ ہونا چاہئے تھا مادہ پرستانہ زندگی نے ان کی طبیعت کے اندر ایک شدید کشمکش پیدا کردی، اور جیسا کہ میں نے ان کی معرکۃ الآرا کتاب ''الاسلام الممتحن'' کے مقدمہ میں لکھا ہے ان کے قلم کو ایک ایسے آبشار میں تبدیل کردیا جو چٹانوں سے ٹکرانے کی وجہ سے ابلتا ہے، اور بڑے جوش وخروش کے ساتھ گرتا ہے، اس کے نتیجہ میں ایسے مضامین ان کے قلم سے نکلے، جن میں آبشار کا شور تھا اور طوفان کا زور ہے۔

۱۹۵۹ء میں ندوہ کی مجلس انتظامی نے رسالے کو اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا اور محمد میاں مرحوم کی طرف سے ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب نے اس کی منظوری دے دی اور رسالہ اپنے مغز ومواد اور حسن طباعت کے سبب عالم اسلام وعالم عربی میں مقبولیت حاصل کرنے لگا، اس نے اپنے پورے دور میں فکر صحیح، اسلامی دعوت، اور احقاق حق وابطال باطل کے میدان میں بڑے معرکے سر کیے ہیں اور آج بھی وہ اسلام کے چند اہم رسالوں میں شمار کیا جاتا ہے اور عالم اسلامی میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ (تاریخ ندوۃ العلماء ص۔ ۴۲۵)

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی وفات (۱۱ر رمضان المبارک مطابق ۱۷ر مارچ ۱۹۹۲ء) سے علوم دینیہ بالخصوص فن حدیث کے سلسلہ میں جو عظیم علمی خسارہ ہوا ہے اور خلا پیدا ہوا ہے، اس کا احساس بہت سے لوگوں سے زیادہ اس عاجز کو ہے جس کی برصغیر ہندو پاک ہی نہیں ممالک عربیہ اور مرکز اسلام پر بھی نظر ہے اور وہاں کے علماء، اساتذہ، مصنفین و محققین سے بہت سے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ واقفیت ہے، علم حدیث خاص طور پر عالمی و علمی پیمانہ پر جس انحطاط اور تنزل کا شکار ہے اور اس فن شریف کی واقفیت میں جو سطحیت اور رسمیت پیدا ہوگئی ہے اور خاص طور پر حدیث و روایات صحیحہ اور فقہ حنفی کے درمیان تطبیق اور اس علمی حقیقت کے ثابت کرنے میں کہ مذہب حنفی حدیث کے خلاف نہیں، اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ اور خلفائے کبار محض قیاس وذہانت پر اعتماد نہیں کرتے تھے، ان کا ماخذ استنباط احکام میں آیات و احادیث ہی ہوتی تھیں، اس موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت مولانا کے ارتحال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اور بھی قابل افسوس وتشویشناک ہے۔

اس علمی تفرد و امتیاز کے علاوہ مولانا کے اخلاق، فہم و فراست، ملت کے مسائل و مفادات سے واقفیت وفکر مزید برآں ہے، اس لیے نہ صرف علمی حلقہ میں ایک عظیم خلا پیدا ہوا ہے بلکہ ملت کی صف قیادت میں بھی ایک بڑی جگہ خالی ہوگئی ہے، جس کا پُر ہونا بظاہر اسباب بہت دشوار معلوم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، درجات بلند کرے اور اہل علم و درس کو ان کی تصنیفات وتحقیقات سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے اور فن حدیث سے اشتغال وانہماک کا سلسلہ جاری ہے۔

مولانا ریاض الرحمٰن رشادی مرحوم

۱۳۷۱ھ ۱۹۵۱ء تا ۱۴۳۳ھ ۲۰۱۱ء

ریاست کرناٹک کی معروف علمی، دینی اور سماجی شخصیت وامام وخطیب سٹی جامع مسجد، بنگلور مولانا ریاض الرحمٰن رشادی کا ۲۰/نومبر ۲۰۱۱ء کو مکہ معظّمہ میں انتقال ہوگیا، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد مکہ ہی میں اپنے رب کے حضور حاضر ہوگئے، تدفین وہیں عمل میں آئی، اس موقع پر صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ وناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے جو تعزیتی پیغام ارسال فرمایا، وہ ذیل میں شائع کیا جارہا ہے۔

مولانا ریاض الرحمٰن صاحب رشادی بنگلور کی ایک عظیم دینی وعلمی شخصیت تھے، اور تعلیمی اور ملی کاموں کے میدان میں بڑا کردار انجام دینے والی شخصیت کے لحاظ سے معروف رہے ہیں، وہ بنگلور جامع مسجد کے امام اور خطیب تھے، اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی اور ملی کاموں کی سرپستی قابل قدر فکر وتوجہ سے کرتے رہے، اس سلسلہ میں انہوں نے کئی ادارے قائم کئے، جس سے بنگلور کے مسلمانوں کو ملی اور دینی میدان میں بھی تقویت حاصل ہورہی تھی، جامع العلوم بنگلور آپ ہی کا قائم کیا ہوا ادارہ ہے، جس کے تحت کئی ٹیکنکل کالج اور یونیورسٹیاں ہیں، جس میں ساڑھے چار ہزار سے زائد طلباء زیر تعلیم ہیں، جامع العلوم بنگلور کے تحت ایک مدرسہ بھی ہے جس کے مولانا مہتمم تھے، اسی کے ساتھ مولانا جامع مسجد بنگلور کے خطیب تھے، اور آل انڈیا ملی کونسل کرناٹک کے سابق صدر بھی رہے، حضرت مولانا علی میاںؒ سے اصلاحی تعلق قائم کیا، آپ حضرت مولانا کے بے انتہا عاشق اور معتقد تھے، مولانا

ابوالحسن اسلامک اکیڈمی کے قیام سے لے کر اب تک مولانا کا بھرپور تعاون حاصل رہا، مولانا ہی کی سرپرستی میں اسلامیات کا نصاب تیار ہوا، جو کہ ہندوستان کے بیشتر عصری اسکولوں میں داخل نصاب ہے، مولانا کے خطبات کا ایک مجموعہ ''خطبات جامع'' کے نام سے شائع ہوا ہے، جامع العلوم سے نکلنے والے سہ ماہی پرچہ کے آپ ایڈیٹر بھی تھے، دنیا بھر میں انٹرنیٹ پر اپنا خطبہ نشر کرنے کا کام آپ ہی نے شروع کیا۔

مولانا بڑی دلآویز شخصیت کے مالک تھے، ساٹھ سال کی عمر پائی، آپ حافظ وقاری اور جامعۃ سبیل الرشاد کے فارغ تھے، عرصہ سے شوگر کے عارضہ میں گرفتار ہونے کی بناء پر خاصے کمزور ہو گئے تھے، اس کے علاوہ مولانا کے گردوں کی کچھ سال پہلے پیوندکاری ہوئی بھی تھی، لیکن دینی کاموں کی سرپرستی اسی فکرمندی اور جذبہ سے کر رہے تھے، جو انہوں نے شروع سے اختیار کیا تھا، بنگلور شہر مسلمانوں کا دینی وملی لحاظ سے بڑا مرکزی شہر ہے، وہاں آپ جیسی کارگزار شخصیت کے ہونے سے وہاں کے مسائل اور ملی تقاضوں کو بڑی تقویت حاصل تھی، افسوس ہے کہ وہ اس کارگاہ حیات سے رخصت ہو کر اپنے مالک حقیقی سے جاملے، حالانکہ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی، لیکن مرض نے ان کو کمزور کر دیا تھا، بالآخران کا اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا، اور انہوں نے اپنے قدردانوں کو رنج میں چھوڑ کر اس دنیا کو الوداع کہا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ کوششوں کو قبولیت عطا فرمائے، اور اپنی رضامندی سے شادکام کرے، ان کے جاری کیے ہوئے کاموں کے جاری رہنے کے اسباب مہیا فرمائے، حرمین شریفین سے آپ کو بے انتہا تعلق تھا، ہر سال عمرہ کے لئے تشریف لے جاتے تھے، اور حج کے لیے بھی جانا ہوتا تھا، اس مرتبہ حج سے فارغ ہو کر وہیں دوران قیام آپ کا سانحہ وفات پیش آیا، مکہ مکرمہ میں آپ کی وفات ہونے سے آپ کے اس تعلق کو تقویت ملتی ہے، کہ حج کے بعد آپ کو بیت اللہ کے جوار میں جگہ ملی، انا للہ وانا إلیه راجعون.

آپ کے پسماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹا جو کہ حافظ قرآن ہے اور تین بیٹیاں ہیں اللہ تعالیٰ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ہم ان کے پسماندگان کو اور ان کے قدردانوں کو اپنی دلی تعزیت پیش کرتے ہیں۔

مولانا محمد زبیر الحسن کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۷۰ھ ۱۹۵۰ء تا ۱۴۳۵ھ ۲۰۱۴ء

حضرت مولانا محمد زبیر الحسن صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کاندھلہ کے اس عظیم المرتبت خاندان کے فرد تھے جس نے علومِ شریعت کے تحفظ اور مسلمانوں کی اصلاح کے کام کو بہت قوت پہونچائی، چنانچہ ان حضرات کی محنت سے امت کے بے شمار لوگوں کی اصلاح کا کام انجام پایا۔ اس خاندان نے دینی وعلمی لحاظ سے صرف تعلیم ودعوت کا کام ہی انجام نہیں دیا، بلکہ دینی اور دعوتی عمل کو ایک مضبوط حیثیت بھی عطا کردی، حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادگان مولانا محمد صاحب، مولانا محمد یحییٰ اور مولانا محمد الیاس (رحمہم اللہ) نے اس خاندان کی علمی ودعوتی خصوصیت کو بہت کامیابی سے بڑھایا اور اس میں وسعت کا بڑا فریضہ انجام دیا۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب نے علومِ دینیہ کی خدمت میں خود بھی بڑا مقام حاصل کیا اور ان کے عظیم صاحبزادے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب (رحمۃ اللہ علیہما) نے خدمتِ حدیث اور تصنیف وتدریس اور ارشاد وتزکیہ دونوں میدان میں وسیع اور غیر معمولی کام انجام دیا جس کا فیض ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کے ذریعے دور تک پھیلا۔ اس کے علاوہ ارشاد وتربیتِ دینی کے میدان میں کام انجام دیا اور اپنے پیچھے بڑی تعداد خلفاء کی جو (۱۰۰) سے متجاوز ہوئے، اور ارادت مندوں کی غیر معمولی تعداد چھوڑی۔

مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کی دینی حالت کی کمزوری کا احساس

کر کے تن من دھن سے اس دینی گراوٹ کو دور کرنے کے کام میں اپنے کو کھپا دیا۔ اور دینی دعوت کے کام کو اس خاص طریقہ واسلوب سے ایک تحریک بنا دیا جو کہ کتاب وسنت کی تعلیمات کے دائرے میں رہتے ہوئے حالات اور انسانی مزاج کی رعایت کی حامل ہونے کے ساتھ بڑی اثر انگیز بن گئی، اور یہ کام ہریانہ کے علاقہ میوات سے شروع کیا جہاں کے مسلمان دین سے اتنے دور ہو گئے تھے کہ وہ اپنے کو مسلمان تو سمجھتے تھے لیکن اپنے علاقے کے غیر مسلموں کی عادتوں کے سلسلے میں خلط ملط ہو گئے تھے۔ مولانا کو اپنی کوشش میں کامیابی کا جو فائدہ حاصل ہوا، اس کو انھوں نے سامنے رکھتے ہوئے کام کو اور پھیلایا اور پورے ہندوستان میں یہ تبلیغی و دینی دعوت دینی اصلاح کا ایک بڑا کارگر ذریعہ بن گئی۔

مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جب وفات ہوئی تو ان کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ایک دیگر عزیز قریب مولانا محمد انعام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو ان کے ہمشیر زادے مولانا اکرام الحسن صاحب کے فرزندِ جلیل تھے) دونوں نے مولانا کی تربیت پائی تھی اور اعتماد بھی حاصل کیا تھا، چنانچہ ان کی وفات پر دونوں حضرات نے اپنی وابستگی کو عملی شکل دی۔ مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نظام الدین دہلی میں بنگلہ والی مسجد سے تعلق ہونے کی بنا پر وہاں مدرسہ قائم کیا اور اسی مسجد کے ذریعے سے اپنا دعوتی کام پھیلایا، اس طریقے سے یہ مرکز دینی تعلیم کا بھی مرکز بنا، اس سے زیادہ وہ دعوت و تبلیغ کی کوششوں کا بھی زبردست مرکز بنا۔

مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد انعام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں علم و تعلیم سے زیادہ وابستہ رہے تھے، لیکن مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر مولانا محمد یوسف صاحب نے اپنے کو تبلیغ و دعوت کے بالکل سپرد کر دیا اور مولانا محمد انعام الحسن صاحب علمی اشتغال کے ساتھ ان کے رفیق رہے اور مولانا محمد یوسف صاحب کے انتقال پر انھوں نے اپنے کو بھرپور طریقے سے اس کام میں لگا دیا۔ دینی ودعوتی کام کا یہ سلسلہ مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے

شروع ہوکر مولانا محمد انعام الحسن صاحب تک ترقی کرتے کرتے پوری وسعت اختیار کر گیا اور پورے ہندوستان میں اور آخر میں پوری دنیا میں وسیع پیانے پر پھیل گیا، اس میں مولانا محمد انعام الحسن صاحب نے اپنی علمی وعملی صلاحیتوں کو پوری طرح لگایا، اوراس کی ذمہ داری کا حق ادا کیا جس سے محدود پیانے پر شروع کیا گیا کام عالم گیر حیثیت اختیار کر گیا، اس طرح مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دعوتی کام شروع کرنے کے بعد اپنے کو جیسا وقف کر دیا تھا، اس کو ان کے بعد آنے والے ان دو بزرگوں نے بہت ہی وسعت تک پہنچا دیا۔

مولانا محمد انعام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دعوتی مزاج کے ساتھ علمی مزاج میں بھی ممتاز خصوصیات کے حامل تھے، طبیعت میں بڑا توازن تھا اور ہر ایک سے محبت اور اپنائیت کا معاملہ رکھتے تھے، ان کی طبیعت کی خوبی کی بنا پر لوگ ان سے بہت مانوس ہوتے رہے اور اس بات نے بھی لوگوں کو اس کام کی طرف کھینچا۔ مولانا کا دور کام کے بہت وسیع ہو جانے کی وجہ سے بہت محنت طلب دور تھا، دنیا کے ہر خطے کے کام کرنے والوں کے کاموں سے واقفیت حاصل کرنا اور ان کی مناسب رہنمائی کرنا اگر اس کے لیے بڑا عملہ ہو اور اس کے لائق وسائل ہوں تو زیادہ مشکل نہیں، لیکن تبلیغی دعوت نے اپنا جو انداز بنایا تھا وہ سنتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زیادہ سے زیادہ پیروی کا تھا، اس لیے عام دنیاوی کاموں کے جو وسائل ہیں، وہ اختیار نہیں کیے جاتے تھے، بس مسلمانوں سے براہِ راست عملی واسطہ اختیار کیا جاتا تھا، اور نہایت پرسکون اور پُرامن طریقے سے ان کے عقائد درست کیے جاتے تھے، ان میں دین کی محبت اور دین کے مطابق زندگی کو ڈھالنے کا شوق پیدا کیا جاتا تھا، اس کے لیے سفر کرائے جاتے تھے اور ذاتی ملاقاتوں کا اہتمام کیا جاتا تھا، جس کو ان حضرات نے برابر قائم رکھا، اور دنیاوی ترقیات کا سہارا لینے سے گریز کیا، اسی وجہ سے اس کام سے واقف ہونے والوں کو اس میں کوئی تردد اور دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی اور اس کام کو سمجھ لینے کے بعد لوگ اس کو اپنے ذاتی کام کی طرح انجام دیتے تھے۔

ایک خصوصیت یہ تھی کہ کام کے بہت پھیل جانے کے بعد بھی سب کا اصل مرکز

سے برابر رابطہ رہتا تھا، ان بزرگوں کو جن میں یہ رہبر تھے، ہمہ وقت فکرمندی اور تعلیم وتوجہ دہانی کا فرض انجام دینا ہوتا تھا، وہ اس میں شب وروز لگے رہتے تھے، اوراس سلسلے میں مولانا محمد انعام الحسن صاحب نے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں، جو جذبہ اور کارکردگی کی جو تربیت حاصل کی تھی، اس کو انھوں نے بہت خوبی سے جاری رکھا اور عمر کے آخری روز تک اس میں لگے رہے اور اس طریقے سے کام کو بہت مضبوط بنادیا۔

مولانا محمد انعام الحسن صاحب کو علم ومطالعے سے بڑا شغف رہا تھا، جو اس کام کا امیر بننے کے بعد اتنا نہیں ہوسکتا تھا جتنا وہ پہلے کرتے تھے، لیکن انھوں نے علم سے جو شغف رکھا تھا، اس کا اثر ان کی طبیعت میں آگیا تھا اور ان کی طبیعت بہت علمی واقف کار کی بھی تھی، یہ چیز ان سے پہلے کے امیر مولانا محمد یوسف صاحب میں بھی بھرپور طریقے سے تھی، ان دونوں کو اپنی اپنی امارت کے زمانے میں زیادہ تر عملی ذمہ داریوں سے متعلق رہنا پڑا، لیکن مشوروں اور کاموں میں ان کے علمی ذوق کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔

مولانا محمد انعام الحسن صاحب کی وفات سے پھر اس کام کی سرپرستی کے سلسلے میں خلا پیدا ہوا، جس کا بوجھ ان کے فرزند مولانا محمد زبیر الحسن صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے مولانا محمد سعد صاحب پر پڑا، اور ان دونوں نے کام کرنے والوں میں اعتماد پیدا کیا، علمی لحاظ سے اس سلسلے میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تصنیف کردہ تبلیغی نصاب ''فضائلِ اعمال'' کے ساتھ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی کی کتاب ''منتخب احادیث'' نے کام سے جڑے لوگوں کی تعلیم و مطالعہ کی اچھی خدمت انجام دی، جس کا عمومی طور پر بڑا فائدہ ظاہر ہوا۔

مولانا محمد زبیر الحسن صاحب کاندھلوی مولانا محمد سعد صاحب کاندھلوی سے عمر میں بڑے تھے، اس طرح کام کا بوجھ بھی ان پر زیادہ پڑا، ان کو مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے دادیہالی و نانیہالی دونوں نسبتیں حاصل تھیں، ان کے دادا مولانا اکرام الحسن صاحب (والدِ محترم مولانا محمد انعام الحسن صاحب) مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ

اللہ علیہ کے حقیقی بھانجے اور ان کے نانا حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی بھتیجے تھے، اور ان کی تربیت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور مولانا محمد انعام الحسن صاحب کے زیر سایہ ہوئی تھی اور ان دونوں سے انھیں اجازت وخلافت بھی حاصل ہوئی تھی۔ مزید انھیں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی اس دینی نسبت میں شریک کیا جو انھیں اپنے مرشد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل تھی۔

حضرت مولانا محمد انعام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مولانا محمد زبیر الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تقریباً ۱۹-۲۰ سال تبلیغی جماعت کی سربراہی میں شرکت کا موقع ملا اور وہ اپنے امراض واعذار کے باوجود ملک اور بیرونِ ملک کے تقاضوں کو پورا کرنے کی آخر تک پوری کوشش کرتے رہے، وہ اور مولانا محمد سعد صاحب ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بن کر پوری رہنمائی کرتے رہے اور حضرت مولانا محمد انعام الحسن صاحب کی وفات کے بعد جو مشاورتی نظام طے ہوا تھا، اسی کے مطابق یہ عمل جاری رہا۔ بڑے اجتماعات میں اور نظام الدین مرکز کے روز کے معمولات میں جماعتوں کو رخصت کرتے وقت دعا عموماً مولانا محمد زبیر الحسن صاحب کے ہی حصے میں آتی۔

مولانا محمد زبیر الحسن صاحب بڑی دینی صفات وخصوصیات رکھنے والی بزرگ شخصیت کے طور پر معروف ومشہور تھے، ان میں کام کی سربراہی اور سنجیدہ فکرمندی اور کام کرنے والوں کو مشوروں سے تقویت پہونچانے کا پورا جذبہ وعمل پایا جاتا تھا، ان سے کام کو خصوصی سرپرستی مل رہی تھی، اور راقم بھی ان سے تعلق اور انس محسوس کرتا تھا، ان سے مجھ کو محبت اور قدر ومنزلت کے احساس کا جو تعلق تھا، اس کی بنا پر مجھ کو ذاتی طور پر بھی صدمہ محسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا کو پورا فرمائے اور ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

مولانا مفتی سعید احمد اجراڑوی

۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء تا ۱۳۷۷ھ ۱۹۵۷ء

برصغیر کی عظیم علمی ودینی شخصیت اور مظاہر علوم سہارن پور کے صدر مفتی مولانا مفتی سعید احمد اجراڑوی ثم سہارن پوری نے ۲؍صفر المظفر ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۹؍اگست ۱۹۵۷ء کو وفات پائی، یہ حادثۂ وفات صرف مظاہر علوم یا سہارن پور اور اجراڑہ کا نہیں ہے بلکہ تمام دینی وعلمی حلقوں کے لئے عظیم حادثہ اور بڑے خسارہ کا باعث سانحہ ہے جس کا سبھی کو ملال ہے، صاحب ''معلم الحجاج'' کی حیثیت سے ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور ان کی کتاب حجاج کے لئے ایک بہتر رہبر کتاب کے طور پر سامنے آئی، اور اپنے موضوع پر بڑی مفید اور کامیاب کوشش محسوس کی گئی۔

مولانا مفتی سعید احمد صاحب مرحوم کا وطن اجراڑہ، ضلع میرٹھ تھا لیکن وہ مظاہر علوم میں تعلیم پاکر وہیں مدرس ہوگئے اور ان کی مشغولیات اس ادارہ میں بڑھتی گئیں جس سے وہ سہارن پور کے ہی مکین کے طور پر معروف ہوئے۔

جامعہ مظاہر علوم سہارن پور کو ملک میں اور ملک کے باہر جو شہرت اور اہمیت حاصل ہے اس میں اصلاً وہاں کے فرزندان تعلیم اور اساتذہ فن کی فکرمندی اور کوششوں کو بڑا دخل رہا ہے، وہاں کے اساتذہ وکارگزاروں میں علم وعمل کی حامل چند در چند ہستیاں رہی ہیں، مرشد جلیل اور عظیم عالم دین حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری، حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی اور ان کے عظیم صاحبزادے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا

کاندھلوی رحمہم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے رفقاء عمل میں ناظم جامعہ مولانا عبداللطیف پورخاسوی، حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا اسعد اللہ رامپوری اہم اصحاب علم واساتذہ رہے ہیں جو اپنے عہد کے شیوخ ارشادوتربیت بھی تھے۔

ان ہی کے ساتھ جامعہ کے مفتی حضرت مولانا سعید احمد صاحب کا بھی نام نامی ہے جن کا علمی پایہ اور دینی مرتبہ اپنے مذکورہ عظیم معاصرین جیسا تھا اور جامعہ مظاہرعلوم کو ان سے بہت فیض پہنچا، مولانا بڑے بالغ النظر عالم تھے، آج کے دور قحط الرجال میں جید الاستعداد علماء کم ہیں، اور افتاء میں خصوصی درک ومہارت رکھنے والے تو اس قدر کم کہ صرف انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، انہی محدود حضرات میں حضرت مفتی صاحب ایک اعلیٰ اور امتیازی شان کے مالک تھے، وہ جامع کمالات حضرات میں سے تھے، محاسن وفضائل کا مجموعہ اور صاحب الرائے وصائب الرائے تھے، حضرت مفتی صاحب نے اپنے پیچھے صالح اور صاحب علم ورشد یادگاریں چھوڑیں جن میں مولانا مفتی مظفرحسین مظاہری اور مولانا اطہر حسین مظاہری ہیں، دونوں ہی اپنے عظیم والد کے نقش قدم پر اور ورع وتقویٰ کی صفات وخصوصیات کے حامل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی باقیات صالحات کو ان کے لئے صدقۂ جاریہ اور ذخیرۂ آخرت بنائے اور اعلیٰ مقامات سرفراز کرے۔ آمین۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء تا ۱۴۰۷ھ ۱۹۸۵ء

گزشتہ دنوں برصغیر کی بڑی علمی ودینی اور علمی شخصیت مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے کراچی (پاکستان) میں جہاں وہ بعض افراد خاندان سے ملنے گئے ہوئے تھے وفات پاگئے اور ملت اسلامیہ کو سوگوار چھوڑ گئے، للّٰہ ما أخذ وله ما أعطى وكل شئ عنده بأجل مسمى.

مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی اس وقت دارالعلوم دیوبند میں علامہ انورشاہ کشمیری کا غلغلہ بلند تھا ان سے آپ نے تعلق پیدا کیا اور بھرپور استفادہ کیا پھر عصری علوم میں محنت کی اور قدیم وجدید ثقافت کی جامعیت پیدا کی، اور ایم اے. کی ڈگری لی، اور دہلی، کلکتہ اور علی گڑھ کی جامعات میں تعلیم وتدریس کی خدمت کی، آخر میں انہوں نے اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند اکادمی کی سرپرستی کی اور ندوۃ المصنفین دہلی اور اس کے ترجمان ماہنامہ برہان کی اپنی تحقیقات اور مفید آراء ومشورہ سے خدمت کی۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا ندوۃ العلماء سے بھی گہرا تعلق تھا اگرچہ انہوں نے یہاں تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن ندوۃ العلماء کے منہج وفکر سے ان کو بڑی ہم آہنگی تھی اور اس کے ناظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے گہرا تعلق تھا اور ان کے وہ بڑے ہی قدردان اور معترف تھے اور مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کو بھی آپ کی بڑی قدر تھی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بڑا علمی ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے، اس میں ان کی کتاب عثمان ذوالنورین ان کی تصنیفات میں اہم تصنیف شمار کی جاتی ہے، حالانکہ اس میں ان کی بعض آراء سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔

مولانا اکبر آبادی مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے رفقاء میں تھے اور ندوۃ المصنفین کے بانیوں میں تھے، ندوۃ المصنفین اور اس کے ترجمان برہان کے لئے یہ حادثہ وفات زیادہ خسارہ کا باعث ہے کہ ابھی ایک ہی سال گزرا کہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے وفات پائی ہے اور اب اس ادارہ کے دوسرے نمبر کی شخصیت مولانا اکبر آبادی بھی نہ رہے۔

مولانا اکبر آبادی کے شاگرد مختلف حیثیتوں کے نظر آتے ہیں جو مختلف میدانوں میں نمایاں ہوئے اور انہوں نے ان سے جو دینی وملی فکر وسوز پایا تھا، عصری تعلیم کے ساتھ اس وصف سے متصف ہو کر وہ بڑی خدمت انجام دینے کے لائق ہوئے، دہلی میں مدینہ کالج میں جب وہ استاد تھے تو اس زمانہ میں صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق شہید نے بھی ان سے پڑھا اور استفادہ کیا تھا۔

اللہ نے مولانا اکبر آبادی کو گوناگوں خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا تھا اور وہ جس مجلس میں ہوتے میر مجلس ہوتے، ان کو جو بڑی علمی اور دنیوی وجاہت حاصل تھی اس کے ہوتے ہوئے متواضع اور کریم النفس انسان تھے جس کی وجہ سے ان کی خوبیوں سے استفادہ ہر ایک کے لئے آسان ہو جاتا تھا، وہ دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے رکن انتظامی تھے، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ساتھ اور بھی علمی وتحقیقی اداروں اور سماجی وملی تنظیموں کے بھی رکن تھے اور کانفرنسوں میں ایک ساتھ مدعو کئے جاتے تھے، اس طرح دونوں میں بہت سی چیزوں میں اشتراک عمل بھی تھا اس سے دونوں کے درمیان جو مناسبت قائم ہوگئی تھی اس کا فائدہ ہم چھوٹوں کو بھی ان کی شفقت سے پہنچتا تھا اس لیے ان کے حادثۂ وفات کو ہم لوگ اپنا ذاتی صدمہ محسوس کرتے ہیں اور اسی تعلق سے ان کے اہل خانہ ومتعلقین کو تعزیت پیش کرتے ہیں۔

سید حامد آئی اے ایس

۱۳۳۹ھ ۱۹۲۰ء تا ۱۴۳۶ھ ۲۰۱۴ء

ملک کے سابق آئی اے ایس جناب سید حامد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے ملک کے انتظامیہ کے اہم افسر کی حیثیت سے ملک کی خدمت انجام دی، اور اسی کے ساتھ محسن ملک و ملت کی حیثیت سے ملت اسلامیہ کی خدمت کی طرف بھی خصوصی توجہ دی، اور ۸۵ سال کی عمر میں انتقال کیا، ان کی خدمات کی بناء پر ان کی وفات ملک وملت دونوں کے لیے خسارہ ہے، انہوں نے حکومتی عہدوں کے ساتھ ملت کی ترقی اور بہتری کے لیے فکرمندی اختیار کی، اس نے ان کی افادیت کو اور بڑھا دیا تھا، خاص طور پر تعلیمی سطح پر ملت کو جو کمی اور کوتاہی کا سامنا تھا، اس کی انہوں نے خصوصی فکر کی، ان کی اس فکرمندی کو دیکھ کر کہنے والوں نے کہا کہ وہ اپنے وقت کے سرسید ہیں، تعلیم کے موضوع کے ساتھ ساتھ قومی اور ملکی زندگی میں ملت کی حیثیت کو بڑھانے اور بہتر بنانے کی طرف بھی انہوں نے توجہ کی، عہد حاضر میں قومی ترقی اور سربلندی کے جو مواقع پیدا ہو رہے ہیں، ان کو سید حامد صاحب نے پوری طرح محسوس کیا تھا، اس کے لیے انہوں نے آئی اے ایس کی سطح کے لوگ تیار کرانے کے لیے دہلی میں ایک ٹریننگ سینٹر بھی قائم کیا تھا، جس سے متعدد نوجوان آئی اے ایس بن کر نکلے۔

انہوں نے ملت کی ضروری اور صحیح ترجمانی کے لیے صحافت کو بھی بہت اہم ذریعہ تسلیم کیا تھا، اور کوشش کی تھی کہ مسلمانوں کا اگر کوئی ایسا انگریزی اخبار ہو جو اپنوں اور غیروں میں مسلمانوں کے مسائل کو صحیح طور پر پیش کر سکے اور تعارف کرا سکے، اس میں مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں بھی ان کے ہم خیال بلکہ داعی تھے، دونوں نے اپنے بعض رفقاء کے ساتھ اس

سلسلہ میں کوشش کی، اور اس کی اہمیت ظاہر کی، یہ ملت کی ترجمانی کے لئے ایک ضروری امر تھا، جو باجود کوشش کے تشنہ رہا، سید حامد صاحب ملت کی تعلیمی ترقی کے لیے بھی آخر تک کوشاں رہے، وہ ہمدرد یونیورسٹی کے چانسلر رہے، اور اس راہ سے بھی ان کی اچھی خدمات ہیں۔

سید حامد صاحب کو حضرت مولانا علی میاںؒ کے ساتھ بھی اچھا تعلق تھا، یہ قربت ایک دوسرے سے ملی فکرمندی کے تعلق سے پیدا ہوئی تھی، سید حامد صاحب حکومت کے بڑے عہدوں پر رہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے، وہاں بھی ملی فکرمندی کا کام انجام دیا، حکومتی کام سے ریٹائر ہونے کے بعد جامعہ ہمدرد کے تحت ملت کے تعلیمی کام کی طرف پوری توجہ مبذول کی، اس کے چانسلر ہوئے اور تاحیات اس میں لگے رہے، وہ اب ہم میں نہیں رہے، ان کے نیک کاموں کا صلہ ان کے رب کی طرف سے بھرپور ملے گا، ان کی رفاقت اور محبت میں مسلمانوں کی نئی نسل کے جو افراد رہے، امید ہے کہ وہ ان کے شروع کئے ہوئے کاموں کو بڑھائیں گے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ان کا جو قربت کا تعلق تھا اسی کے توسط سے وہ مجھ پر شفقت فرماتے اور تعلق سے ملتے، وہ مولانا کی دعوت پر ان کی سرگرمیوں میں شریک بھی ہوئے، اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عہدہ پر فائز ہونے کے زمانے میں مولانا سے بڑا قریبی تعلق رکھا۔ اور متعدد بار مولانا کو علی گڑھ کے پروگراموں میں شریک کرایا، اور خود بھی مولانا کے وطن تشریف لائے، اور ایک موقع پر جب مولانا کا گاؤں سیلاب کی زد میں تھا، تو کشتی سے گاؤں جا کر زیارت و ملاقات کی، اور ایک موقع پر جب قائد ملت ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کی یادگار میں رائے بریلی میں ایک مسافر خانہ ایوان فریدی کی عمارت کی سنگ بنیاد رکھی جا رہی تھی، تو اس موقع پر شریک بھی رہے، اس کے علاوہ لکھنؤ میں ندوہ کے کئی پروگراموں میں حصہ لیا، ان کی وفات کا حادثہ ملت کے ایک اچھے کارپرداز شخص کا حادثہ ہے، ان جیسی شخصیت کا نہ رہنا ملک وقوم کے لیے بڑا خسارہ ہے۔

مولانا سید شوکت علی نظیری رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۵۰ھ ۱۹۳۲ء تا ۱۴۳۶ھ ۲۰۱۵ء

مولانا سید شوکت علی نظیر رحمۃ اللہ علیہ کا ممبئ کے مشہور و مقبول علماء میں شمار ہوتا ہے، جنہوں نے وہاں کی جامع مسجد میں عرصۂ دراز تک امام وخطیب کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، اور اپنی عالمانہ شان ووقار اور بزرگانہ صفات وخصوصیات سے ارشاد وتربیت کا بھی کام انجام دیا، ان کو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ سے شرف تلمذ و استفادہ حاصل تھا، وہ رتنا گیری کے علاقہ رائے گڑھ مہندری میں ۲۶ر شعبان المعظم ۱۳۵۰ھ مطابق ۶ر جنوری ۱۹۳۲ء کو حسینی سادات کے خاندان میں پیدا ہوئے تھے، جامعہ حسینیہ راندیر سورت پھر مدرسہ انوار العلوم احمد آباد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے جہاں مسند تدریس پر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جلوہ افروز تھے، دورۂ حدیث میں ان سے صحیح بخاری اور علامہ ابراہیم بلیاوی، مولانا اعزاز علی امروہوی، مولانا فخر الحسن، مولانا محمد جلیل اور مولانا ظہور احمد رحہم اللہ سے حدیث شریف کی بقیہ کتابیں پڑھیں، اور امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کی، ان کو اپنے اساتذہ میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے خاص تعلق ہو گیا تھا، اور ان کی شفقتیں انھیں حاصل ہوتی رہیں، حضرت کئی بار ان کے گاؤں بھی تشریف لے گئے، دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ممبئ کی ایک مسجد میں امام وخطیب کی حیثیت سے ذمہ داری انجام دینی شروع کی تھی لیکن کچھ ہی مدت میں وہ گجرات کے معروف وممتاز تعلیمی ادارہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں تدریس کے لیے بلا لیے گئے، جہاں ملک کی ممتاز اہل علم شخصیتیں درس وتدریس کی خدمت انجام دے

چکی تھیں جس کی وجہ سے اس ادارہ کو اچھا نام اور مقام حاصل ہوا، وہاں انہوں نے تدریسی خدمت کے ساتھ طلبہ کا دینی مزاج بنانے کا کام بھی جاری رکھا، جس سے آپ کو بڑی عزت و مقام حاصل ہوا لیکن ممبئ کی تاریخی وقدیم جامع مسجد میں امام وخطیب کی ضرورت جب محسوس کی گئی اور اس میں شافعی المسلک امام کا تقرر ہوتا تھا، آپ کا تعلق کوکن کے علاقہ سے تھا جہاں شافعی المسلک لوگ آباد ہیں، آپ کی اس خصوصیت کے ساتھ تدین وتقویٰ اور استغنا کے مزاج اور عالمانہ وقار و مربیانہ صفت کو دیکھتے ہوئے اس منصب کے لیے مدعو کیا گیا، آپ نے اپنے بڑوں کے مشورہ سے اس ضرورت کو ترجیح دی، باوجودیکہ آپ کو جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں اہمیت اور اچھا مقام حاصل تھا، اور ۵۲/سال پورے عزت ووقار کے ساتھ یہ خدمت انجام دی، اور آخر میں وہ کمزوریٔ صحت کی وجہ سے زیادہ تر اپنے وطن رائے گڑھ (رتنا گری) میں رہنے لگے تھے، اور ان کے نائب کے طور پر یہ خدمت انہی کے ایک تربیت یافتہ نوجوان عالم دین انجام دینے لگے تھے جو اب اس تاریخی جامع مسجد کے باقاعدہ امام وخطیب ہیں، اس مسجد میں دوسری خصوصیات کے ساتھ تعلیم کا بھی نظام ہے اور ایک یادگار لائبریری بھی ہے جس میں اچھے نوادرات بھی ہیں، ان سب میں مولانا کی رہنمائی لی جاتی تھی، اور ان کو مسجد کے ارکان وذمہ داروں کا مکمل اعتماد حاصل تھا اور اسی کے ساتھ وہ مسجد کے مصلیوں اور مقتدیوں کے لیے مرکز محبت وعقیدت بھی تھے، اور وہ سب آپ سے دینی وعلمی رہنمائی لیتے تھے، اس طرح آپ نے اصلاح عقائد ورسوم وازالۂ بدعات ومنکرات کے کام کے ساتھ دینی تربیت وارشاد کا کام بھی اپنے جمعہ کے خطبوں اور مجلسی گفتگو کے ساتھ اپنے طرز عمل اور معیاری دینی کردار سے انجام دیا، جس کی خوشبو صاف محسوس ہوتی تھی۔

ان کے اپنے وطن میں قیام اور ضعف وعلالت کی وجہ سے امامت وخطابت سے معذوری کی وجہ سے ملاقات کا موقع بہت دنوں سے نہیں ملا تھا، جنوری ۲۰۱۲ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے تعاون سے حضرت امام شافعی، ان کی فقہ اور اس کے اعلام وتصانیف سے متعلق جامعہ حسینیہ کے ایک اجلاس کے موقع پر شری وردھن جانا ہوا تھا جو ان کے وطن سے قریب تھا، انہوں نے اپنی تشریف آوری کے ذریعہ شرف ملاقات بخشا، یہ ان کے تعلق اور

وضعداری کی بات تھی کہ وہ ازخود تشریف لائے اور مجھے موقع نہیں دیا کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، ممبئی میں بھی انہیں معلوم ہوتا اوران کا ممبئی میں قیام ہوتا تو وہ ملاقات کی خواہش رکھتے، اور ایسا بھی ہوتا کہ وہ ازخود قیام گاہ تشریف لے آتے، وہ ہمارے ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے عرصہ سے رکن بھی تھے، اس کی مجلس انتظامی میں شرکت بھی فرمائی، اور خال معظم مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے بڑا تعلق رکھتے تھے، اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ان سے ان کے مخلصانہ تعلق اوران کی بزرگوں سے نسبت اوران کے دینی اثر کی وجہ سے خاص تعلق تھا اور وہ ممبئی کے زمانۂ قیام میں اس کی خواہش رکھتے تھے کہ ان کی امامت میں نماز جمعہ کی ادائیگی کریں، اوراس کے لیے جامع مسجد جاتے۔

کوکن کے علاقہ شری وردھن میں جامعہ حسینیہ کا قیام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ایما پر عمل میں آیا تھا، جس کی آخر تک انہوں نے سرپرستی فرمائی، اوراس تعلق کی وجہ سے یہ ادارہ انہیں بڑا عزیز رہا، اوراس کی نسبت بھی انہوں نے اپنے شفیق مربی وشیخ کی طرف کی، ان کو ان کے خلیفہ اور آسام کے مشہور داعی و مصلح مولانا احمد علی باسکنڈی مرحوم سے اجازت وخلافت حاصل تھی، قبل ازیں حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ان کو اجازت حاصل ہوئی تھی جن سے ان کا ارادت کا تعلق تھا لیکن وہ اپنی خصوصیت کو ظاہر نہ ہونے دیتے تھے، اور خاص تعلق والوں کو ہی یہ بات معلوم تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو باطنی خصوصیات وامتیازات کے ساتھ ظاہری اوصاف وکمالات سے بھی نوازا تھا، وہ ایک خوبرو، پرکشش، وجیہ وشکیل اور بارعب شخصیت کے طور پر دیکھے جاتے تھے اور لوگوں میں مستجاب الدعوات بزرگ کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے تھے۔

افسوس کہ رشد وہدایت، علم وعمل، اور للّٰہیت وربانیت کی حامل محترم شخصیت ہمارے درمیان نہ رہی، اور اپنے وطن رائے گڑھ (مہاراشٹر) میں ۲۵/ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۱۰/اکتوبر ۲۰۱۵ء کو وفات پا کر ہم سے جدا ہوگئی: للّٰه ما أخذ وله ما أعطی وكل شئ عنده بأجل مسمّی، غفرالله له ورحمه رحمة واسعة وأنزل عليه شآبيب رحمته۔

مولانا شاہ سید صبغت اللہ بختیاری رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء تا ۱۴۱۴ھ ۱۹۹۳ء

مولانا شاہ سید صبغت اللہ بختیاری ۱۱ رمئی کو انتقال فرما گئے۔ مولانا صبغت اللہ صاحب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تعلیمی ساتھیوں میں سے تھے اپنے علاقہ کے صاحب مسند وارشاد بزرگ اور عالم دین تھے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے محبت وتعلق رکھتے تھے اوران کے فکرو پیغام سے دلچسپی رکھتے تھے وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے۔ فکر ندوۃ العلماء کے بڑے قدرداں تھے اس لیے اپنے فرزندوں اور پوتوں کو یہیں تعلیم دلائی، ادھر کئی سال سے ضعف پیری کے سبب دارلعلوم نہ آسکے تھے لیکن حضرت مولانا سے خط وکتابت کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا وہ اپنے علاقہ کے لیے خیرو برکت کا جاری چشمہ تھے جس سے عوام وخواص سبھی فائدہ اٹھاتے تھے، صبر وتحمل مروت ورواداری محبت ودلداری کے پیکر تھے جن حضرات سے فکری اختلاف ہوتا ان کے ساتھ بھی محبت واکرام کا معاملہ فرماتے تھے، فکری اختلاف رکھنے والوں کے استخفاف وتحقیر سے بہت بچتے تھے، یہ وہ صفات ہیں جن کی قرآن وحدیث میں تعلیم دی گئی ہے کہ امت میں انتشار نہ پیدا ہو، فکری اختلاف کے باوجود ربط باہم قائم رہے اوراصلاح وتربیت کا کام پرسکون واطمینان بخش ماحول میں چلتا رہے اس فضا کے قائم رہنے سے ہوائے نفسانی اوروساوس شیطانی کو اپنا کام کرنے کا موقع نہیں ملتا، بھول چوک ہوجاتی ہے تو احساس ہوتے ہی بھول چوک والا سنبھل جاتا ہے۔

(مولانا کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں رائے چوٹی، ضلع کڈپہ آندھرا پردیش کے ایک علمی ودینی گھرانے میں ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، اس کے بعد جامعہ نظامیہ حیدر آباد میں داخلہ لے کر چھ سال تک پوری یکسوئی اور دلچسپی کے ساتھ ممتاز طالب علم کی حیثیت سے عالمیت تک پڑھا، پھر دیوبند جاکر دورۂ حدیث سے فارغ التحصیل ہوئے، وہاں امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی اور شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی کے افکار وخیالات سے بہت متاثر ہوئے، دیوبند سے فراغت کے بعد اپنے وطن میں مولانا حکیم سید شاہ علیم اللہ بختیاری کی صحبت بابرکت میں رہے، اور شہر کی جامع مسجد میں درس قرآن اور درس حدیث دیتے رہے، اس کے بعد اپنے چچا کی خواہش پر جامعہ دارالسلام عمر آباد میں استاذ تفسیر کی حیثیت سے تقرری ہوئی، اور وہاں تقریباً بارہ سال تدریس کی خدمت انجام دی، وہ طلباء میں فکر اعتدال کی دعوت پیش کرتے تھے، وہاں انہوں نے جماعت اسلامی سے متاثر ہوکر جماعت میں شمولیت اختیار کر کے اس کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ان دنوں مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا امین احسن اصلاحی کا بھی جماعت سے گہرا تعلق تھا، مولانا مودودی کے پاکستان چلے جانے کے بعد بعض وجوہ کی بناء پر مولانا بھی جماعت سے الگ ہوگئے، اور اپنے آبائی وطن رائے چوٹی میں حضرت مدنی کی سرپرستی میں اصلاح وارشاد کے کاموں میں لگ گئے، ۱۹۶۲ء میں مدرسہ باقیات الصالحات ویلور جاکر تدریسی خدمات انجام دی، وہاں ایک عرصہ تک قیام کر کے اخیر میں علالت کی وجہ سے سبکدوشی اختیار کرلی، ڈیڑھ سال تک اس بیماری کو جھیلتے رہے اور اخیر کار وقت موعود پر ۱۱ مئی ۱۹۹۳ء داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا کے کلام میں ندرت، بیان میں لطافت، اور ٹھوس دلائل کے ساتھ لبریز گفتگو ہوتی تھی کہ سننے والا گھنٹوں ہمہ تن گوش ہوکر سنتا رہتا، آپ ایک صاحب حال سالک تھے، خاکساری سے بھرپور اور عشق الٰہی سے مخمور تھے، طبیعت میں سادگی، پاک طینت، پاک باز، بلند صفات والے تھے، اسماء الرجال وحسب ونسب میں ید طولیٰ حاصل تھا، مختلف

مکاتب فکر کے لوگوں سے آپ کا تعلق تھا، اور یہ آپ کی وسعت قلبی اور اعلیٰ ظرفی کی دلیل تھی، علامہ سید سلیمان ندوی، اور مولانا ابوالکلام آزاد کے علم اور وسعت نگاہ و تحقیقی شان کے مداح تھے، اسی طرح مولانا سید مناظر احسن گیلانی، امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی، اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے بہت معترف تھے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ذہانت و وذکاوت کو خوب سراہتے تھے، اور ان کی تین کتابیں ''سود'' ''پردہ'' اور ''الجہاد فی الاسلام'' کو بالاستیعاب پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے۔

اسی طرح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی مورخانہ نگاہ اور تبحر علمی کو بہت سراہتے تھے، ان کی تمام تصانیف کی طرف خصوصی توجہ دلاتے اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے نامور، مخلص، عالم دین، داعئ اسلام کے ساتھ رہنا اور پڑھنا نصیب فرمایا، اور فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا علی میاں ندوی نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عربی اور اسلامی ملکوں میں ایک نادر روزگار مفکر اسلام کی حیثیت سے روشناس ہیں، فرمایا کرتے تھے کہ مولانا علی میاں میری نگاہ میں دست قدرت کا ایک گلدستہ ہیں، جس میں مولانا شبلی نعمانی کی تاریخ دانی وانشاء پردازی، علامہ سید سلیمان ندوی کی متکلمانہ تحقیقات اور اسلامی تاریخ کا مواد موجود ہے (مرتب)۔

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ

۱۳۴۱ھ ۱۹۲۳ء تا ۱۴۱۸ھ ۱۹۹۷ء

معروف عالم دین اور ربانی بزرگ مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ کی وفات ۲۳/ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ۔ مطابق ۲۸/اگست ۱۹۹۷ء میں ہوئی، برصغیر ہندو پاک کے بڑے عالم دین اور مرشد دینی کی شخصیت کے حامل تھے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ۷۳ سال کی عمر پائی جو انھوں نے دین وعلم دین کی خدمت میں نہایت تندہی اور زہد واخلاص کے ساتھ گذاری، اسی کے ساتھ ساتھ مخلوق خدا کے دکھ درد کا خیال کرنے اور اپنے علم وتقویٰ کے ذریعہ ان کی مدد کرنے کو اپنا وطیرہ بنایا، وہ ایک طرف حدیث شریف ودیگر علوم کا درس دیتے تھے، دوسری طرف وعظ ونصیحت واصلاح دینی کے جلسوں اور پروگراموں میں شرکت کرکے اپنے خطاب سے فائدہ پہونچاتے تھے، تیسری طرف قرآن مجید اور دعا واذکار لکھ کر مخلوق خدا کی مدد کرتے تھے، انھوں نے ایک طرف علوم دینیہ کی تعلیم کے میدان میں نمایاں مقام حاصل کیا اس سلسلے میں انھوں نے ایک بڑی درس گاہ کی بنیاد ڈالی، جو ان کی فکر ومحنت کا نتیجہ تھی ان کی توجہ وفکر مندی سے اس درس گاہ نے ان کی زندگی میں ہی بڑی ترقی حاصل کی، اور علوم دینیہ کے استفادہ کا ایک بڑا مرکز بنی، بالکل ایک دیہات میں جہاں تمدن کی کوئی سہولت اور ذریعہ نہ ہو ایک بڑی درس گاہ قائم کردینا ایک بڑا کارنامہ ہے جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے انجام دیا۔

اس درس گاہ میں جو مولانا کے وطن، ہتھورا ضلع باندہ میں واقع ہے حفظ قرآن وتجوید وتلاوت کی خصوصی تعلیم کا بندوبست ہے، اس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ خود بھی بڑی توجہ

سے حدیث شریف اور دیگر اسباق پڑھاتے تھے، اور باوجود اپنے کثیر اسفار کے اپنے اسباق کو پورا کرتے اور ان کا حق ادا کرتے تھے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دینی ترقی کے لیے جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں تعلیم کے دوران ہی وہاں کے مقتدر استاد و عالم ربانی مولانا شاہ اسعد اللہ صاحبؒ سہارنپوری خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے تعلق قائم کیا تھا پھر اس میں ترقی کر کے خلافت سے سرفراز ہوئے، ان کی دینداری، تقویٰ اور زندگی کی کم سے کم مادی سہولتوں پر قناعت کو دیکھتے ہوئے ہر شخص ہی ان کو اللہ والے اور ربانی بزرگ سمجھتا تھا، خواص علماء ومشائخ بھی ان کو محبت وقدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور عامۃ المسلمین میں جس کو ان سے واسطہ پڑتا ان کا معتقد ہو جاتا، ان کی طرف عوام کا بڑا رجوع تھا جس کا ایک اظہار ان کے جنازے میں ہزاروں ہزار آدمیوں کا سفر کی مشقت برداشت کر کے پہونچنے سے ہوا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے عامۃ المسلمین کے دکھ درد میں مدد وتعاون کی یہ شکل کہ ان کے بیماروں، پریشاں حال لوگوں کو قرآن وحدیث پر مبنی تعویذ دیئے جائیں خاص طور پر اپنائی تھی اس کی وجہ سے ان پر اس ضرورت کے لوگوں کا بڑا ہجوم ہوتا تھا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے اس تعاون کی بنیاد پر ان کو نیکی کی تلقین بھی کرتے اور ان کی صلاح واصلاح کا ذریعہ بنتے، اس طریقہ سے ایک تعداد کی دینی اصلاح کا ذریعہ بنے، اور متعدد لوگوں کی زندگیاں برائی سے نیکی کی طرف پوری طرح پلٹ گئیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نرم خو، متواضع، منکسر المزاج اور ہمہ وقت دینداری وعلم دین میں مشغول رہنے والے شخص تھے اپنے زمانہ کے تمام بزرگوں سے ربط رکھتے تھے، اور ان کی قدر ومحبت کے مستحق بنتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی جو اہم خصوصیات تھی جو اس زمانہ میں کم لوگوں میں ہوتی ہے وہ باوجود علم وفضل ودینداری کے منکسر المزاجی اور سادہ وزاہدانہ زندگی پر قناعت تھی، نام ونمود سے دور رہتے، ہر ایک کی ہمدردی وخیر خواہی ان کا شعار تھا، اور ہر وقت اس کے لئے

تیار رہتے تھے، اپنی ان خصوصیات کی بنا پر ساری زندگی سفروں کی مشقت اور نجی زندگی میں ایسے مجاہدہ میں گذاری جس سے اسلاف قدیم کے مجاہدوں کو نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا قاری صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے، اور ان کی برکات کو قائم و دائم رکھے آمین۔

حضرت مولانا سید نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۴۶ھ ۱۹۲۷ء تا ۱۴۳۷ھ ۲۰۱۵ء

حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ کی شخصیت سے مجھے واقفیت آج سے نصف صدی قبل ہوئی تھی، وہ اس وقت امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے مرکزی دفتر پھلواری شریف کے ذمہ دار تھے، میں ایک تقریب میں جو مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کے گھر کی تھی، پھلواری شریف گیا تھا، اس موقع سے امارت شرعیہ بھی جانا ہوا، وہاں مولانا سے ملاقات ہوئی، امارت شرعیہ کے کاموں کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے میں نے ان کی اہمیت کا اندازہ کیا، بعد میں عرصہ تک براہ راست ملاقات کا موقع نہیں ملا، لیکن ان کی مؤقر حیثیت ان کے کام ومقام کے لحاظ سے ذہن میں رہی، پھر جب آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے کاموں کے سلسلہ میں ان کے متعلق معلومات حاصل ہوتی رہیں، اور بورڈ کے اس وقت کے جنرل سکریٹری حضرت مولانا شاہ سید منت اللہ رحمانیؒ نے ان کو تحفظ شریعت کے کاموں میں شریک کار بنایا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے صدر ہونے کی وجہ سے بورڈ کی مشاورتی نشستیں لکھنو میں اور خصوصا ندوۃ العلماء میں بھی ہوتیں، وہ ان میں تشریف لاتے اس طرح مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بھی ان کا تعلق بڑھا، دونوں کے درمیان قدردانی کا تعلق قائم ہوا، ملی مسائل کے سلسلہ میں مشارکت سے اس تعلق میں اضافہ ہوا، اور ملت کے قابل فکر معاملات میں تبادلۂ خیال ہوا، اور دین وملت کی خیر خواہی اور اخلاص عمل اور علم و فہم اور فکری و مزاجی ہم آہنگی کے لحاظ سے دونوں کے درمیان ربط بڑھا، اسی کا اثر تھا کہ

جب حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ کا سانحہ ارتحال پیش آیا، تو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ میں ان کے جانشین کی حیثیت سے مولانا سید نظام الدین صاحبؒ پر ان کی نگاہ پڑی، اور بورڈ کے ارکان عاملہ کے مشورہ سے ان کو بورڈ کا جنرل سکریٹری نامزد فرمادیا، جس کی پھر انتخابی اجلاس میں ارکان بورڈ نے توثیق وتصدیق کی۔

انہوں نے ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل میں جس طرح ہوشمندی، حکمت وتدبر، توازن واعتدال کے ساتھ مشورے دیئے، اور رہنمائی کی اس سے ان کو بہت جلد بلند مقام حاصل ہوگیا، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو بھی ان کے تعاون وحسن کارکردگی سے بڑی تقویت حاصل ہوئی، بورڈ کے کئی بڑے بڑے اجلاس ملک کے بڑے اور اہم شہروں میں منعقد ہوئے، جن کے تحت ضروری مشورہ وتجویز عمل کے سلسلہ میں مشارکت ہوئی، اور جے پور اجلاس میں دار القضاء کی تحریک اور اصلاح معاشرہ کو زیادہ قوت سے پیش کیا گیا۔

احمد آباد کے اجلاس میں ان کے مشورے کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بڑی اہمیت دی، جس میں انہوں نے ندوۃ العلماء سے بعض کارگزار افراد کو اس اجلاس کے کامیاب اور مؤثر بنانے کے لیے مانگا تھا، چنانچہ مولانا سید محمد مرتضیٰ مظاہری اور نوجوان اساتذہ میں عزیزان مولوی سلمان حسینی، مولوی خالد ندوی غازیپوری اور مولوی محمد رضوان ندوی وغیرہ کو بھیجا، اور بڑا کامیاب جلسہ احمد آباد میں منعقد ہوا، جس میں مقامی لوگوں میں مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری، مولانا غلام محمد وستانوی، اور ظفر سریش والا وغیرہ نے بڑا حصہ لیا تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنی زندگی کے آخری اجلاس میں جو ممبئی میں منعقد ہوا تھا، صحت کی کمزوری کی بناء پر خود تشریف نہ لے جاسکے تھے، باقی ہر اجلاس میں انہوں نے شرکت فرمائی تھی یہاں ان کا خطبہ صدارت ان کی نمائندگی کرتے ہوئے مولانا عبداللہ عباس ندویؒ نے پیش کیا تھا، مولانا سید نظام الدین صاحبؒ اراکین کے انتخاب، اور حکومت سے رابطہ اور میڈیا سے گفتگو وغیرہ کے امور میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی منشاء تک کا لحاظ کرتے، اور جو قدم بھی وہ اٹھاتے اس میں ان کی فکر ورائے کا پورا احترام ولحاظ

کرتے، اس میں بورڈ کے دوسرے عہدہ داران اور ارکان میں وہ زیادہ ممتاز نظر آتے تھے۔

وہ حضرت مولاناؒ سے صرف انتظامی تعلق نہیں رکھتے تھے، بلکہ وہ تعلق رکھتے تھے جو ایک مسترشد کا اپنے مرشد کے ساتھ، شاگرد کا اپنے استاد کے ساتھ، اور مرید کا اپنے پیر کے ساتھ ہوتا ہے، وہ اپنی ہر ملاقات میں دینی استفادہ کو ملحوظ رکھتے تھے اور ان کے رائے و مشورے کو عمل میں لانے کے لیے بڑی مستعدی سے کام لیتے تھے، ان کے اندر سعادت و شرافت کی یہ باتیں زمانہ طالب علمی سے موجود تھی، جب وہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کررہے تھے، اور اسی زمانے سے ان کو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق خاطر تھا، حدیث کی تعلیم انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں جن اساتذہ سے حاصل کی، ان میں ان کو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے زیادہ تعلق تھا، حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث کے ساتھ صدر المدرسین کے منصب پر بھی فائز تھے، اور ان سے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کو بھی پڑھنے کا شرف اور عقیدت کا تعلق تھا، دونوں کے زمانہ تعلیم میں خاصہ فرق تھا، جو پندرہ سال کا تفاوت رکھتا ہے، سن ۴۶، ۴۷ کا سال مولانا نظام الدینؒ کے دورہ حدیث کا سال تھا، اور ۴۶ء میں میرا بھی دیوبند میں بحیثیت طالب علم قیام تھا، مگر طلباء کی کثرت کی وجہ سے میرا ان سے تعارف نہ ہوسکا تھا وہ دیوبند سے تعلیم مکمل کر کے اپنے وطن بہار آگئے تھے، اور تدریس اختیار کرلی، ان کو تدریس سے امارت شرعیہ آنے کی امیر شریعت مولانا شاہ منت اللہ رحمانی نے دعوت دی تھی، لیکن مدرسہ والوں نے ان کو مجبور کیا کہ وہ ابھی نہ جائیں ان کے فوری طور پر جانے سے مدرسے کا ناقابل تلافی نقصان ہوگا، سن ۱۹۶۵ء میں وہ امارت شریعہ آگئے اور اس طرح انہوں نے پورے پچاس سال امارت شریعہ کی خدمت انجام دی، اور وہیں سے ان کو سفر آخرت کے لیے الوداع کہا گیا، اور پھلواری شریف کے ایک قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

مولانا سید نظام الدین صاحبؒ سے حضرت مولانا علی میاںؒ کو جو مناسبت تھی اور ان کے فہم و بصیرت اور علم و آگہی کی انہیں جو قدر تھی اس کا اعتراف انہوں نے ان کو ندوۃ

العلماء کی مجلس انتظامی کا رکن بنا کر کیا، اور ان کے امیر شریعت کے انتخاب میں بھی دلچسپی لی۔ مولانا نظام الدین صاحبؒ نے علمی وملی خدمت اور اس میں ایک منصب ومقام حاصل کرنے کے باوجود دینی ترقی میں قناعت کو اختیار نہ کیا، بلکہ برابر تعلق مع اللہ اور دینی ترقی میں مؤثر صفات واخلاق کو اختیار کرنے میں لگے رہے، دینی شخصیات سے استرشاد اور استفادہ کا تعلق جاری رکھا، ان کا یہ تعلق دار العلوم دیوبند میں اپنی طالب علمی کے اختتامی زمانے میں اپنے استاد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے ہوا تھا، اور اس کے چند سال بعد ۱۹۵۲ء میں وہ ان سے ان کے ایک سفر بہار میں بیعت ہو گئے تھے، اور اس موقع پر ان کو حضرت مدنی نے جو نصیحتیں فرمائی تھی ان پر وہ تاعمر عمل پیرا رہے، اور ان وظائف واوراد کی بھی ہمیشہ پابندی کی، جو ان کو حضرت مدنی نے تلقین فرمائی تھی، ان کو وہ نصیحتیں ہمیشہ انہی الفاظ میں یاد رہیں، جنہیں وہ اسی طرح دہرا دیتے تھے، جیسا کہ مولانا نے خود بتایا کہ دیر تک کلمات تلقین فرمائے، پہلا دوسرا کلمہ پڑھایا، اور عہد لیا کہ جھوٹ نہیں بولو گے، اذیت نہیں پہونچاؤ گے، اور شرک کی کوئی بات نہیں کروگے، مخلوق کی خدمت کروگے، سنت کی پیروی کروگے، حلال کی رغبت رکھوگے، حرام سے بچوگے، اور بھی دیر تک نصیحتیں فرمائیں، مولاناؒ فرماتے تھے میں نے سر سے ٹوپی اتاری، حضرت نے سر پر ہاتھ پھیرا، سنت کی اتباع اور استغناء عن الخلق اور حق پر قائم رہنے پر زور دیا، اور فرمایا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے، اس کی کوشش کرو کہ اللہ راضی ہو جائے، چنانچہ مولانا نے پوری زندگی اس وصیت کو پیش نظر رکھا، اور تمام اعمال میں رضائے الٰہی کو مقصد حیات بنایا۔

حضرت مدنیؒ کے بعد باضابطہ انہوں نے کسی سے بیعت نہ کی، اس لیے کہ حضرت مدنی کا جو مقام اور رتبہ تھا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس وقت کے مشائخ ان کے مریدین کو باضابطہ بیعت نہیں کرتے تھے اور اسی بیعت پر قائم رکھتے ہوئے سرپرستی فرماتے تھے، بہار کے مشائخ نے حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے خلیفہ مولانا عبد الرشید رانی ساگریؒ

اور صاحبزادے مولانا شاہ منت اللہ رحمانیؒ دونوں بزرگوں سے انہیں عقیدت و محبت تھی، بعد میں یہ تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بھی ہوگیا تھا، حضرت مولاناؒ سے انہیں جو عقیدت کا تعلق ہوا اس میں دو اہم باتوں کو انہوں نے اپنے بعض احباب سے ذکر کیا، ایک تو یہ کہ ان کی مجلس میں کسی کی غیبت کا گذر نہیں ہے، اور ایک بات اور جس نے ان کو متاثر کیا کہ ان کی زندگی میں حیا بہت وسیع مفہوم میں اور مختلف نوعیت سے جلوہ گر تھی، اور ایک بڑے جلسہ میں اس وصف کو بھی بیان کیا، جو انہوں نے ان کے اندر داعیانہ کردار اور عالمانہ وقار کا بڑی بلندی سے دیکھا تھا، انہیں حضرت مولانا کے سلسلہ میں خلافت بھی حاصل ہوئی، اور بعض طالبین کو ان کے اصرار پر بیعت میں بھی داخل کیا، جب کہ عمومی طور پر اخفاء سے ہی کام لیا، اور پوری زندگی میں سادگی وقناعت وتواضع واخلاق واعتدال، توازن انفرادی واجتماعی بہی خواہی، ہمدردی تحمل، صبر و برداشت، شکر کے مواقع پر شکر اور جذبہ احسان مندی کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔

حضرت مولاناؒ کی زندگی میں ہی اور وفات کے بعد میرا اور ان کا باہمی ربط خاص طور پر بڑی اپنائیت کا اور شفقت کا بڑھ گیا تھا اور وہ ایک چاہنے والے بھائی کی طرح پیش آتے تھے، ندوۃ العلماء کے مسائل میں بھی وہ بڑے خیر خواہانہ اور مفید مشوروں سے نوازتے اور تقویت پہونچاتے تھے، اعذار کے باوجود ندوۃ العلماء کی مجلسوں میں شرکت کا اہتمام فرماتے۔

بورڈ کے کاموں اور مسائل میں ان کے ساتھ بڑی فکری ہم آہنگی رہی، اور جب کبھی کوئی ایسی بات بعض مصلحتوں سے کہنی پڑی، جس میں ان کی رائے مختلف ہوئی، تو بھی عموماً میری رائے کو نظر انداز نہیں کیا، بورڈ کی عاملہ کے آخری جلسہ میں جو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا، وہ اپنی صحت کی خرابی اور اعذار کی وجہ سے دست برداری کی بات کہہ رہے تھے، میں نے ان کو ایسا نہ کرنے کی درخواست کی، اور ان کے سکریٹریوں میں ایک اہم سکریٹری حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے صاحبزادے مولانا شاہ سید ولی رحمانی کو کارگذار سکریٹری جنرل

کے طور پر اضافے کی بات رکھی، اور عاملہ نے بھی اس کو قبول کیا، اور یہ بڑی اچھی شکل سامنے آئی، مجھے ان سے بڑی اپنائیت معلوم ہوتی تھی اور ان کو جو اپنائیت کا تعلق تھا اس میں حضرت مولانا علی میاںؒ کے رشتے کو بڑا دخل تھا، کہ وہ میرے ماموں تھے، مولانا علی میاںؒ سے ان کو جو ربط و تعلق تھا وہ اس کا اظہار بھی کرتے تھے، اور اپنے خاندان کے بزرگوں کا ان کے خاندانی بزرگ حضرت سید احمد شہیدؒ سے تعلق کا ذکر کرتے تھے، کہ ان کے اجداد میں بعض حضرات حضرت شہیدؒ کے قافلہ میں شامل تھے، اور ان کے جد امجد سید صادق علی جو بذات خود حضرت سید صاحبؒ کے ساتھ سفر ہجرت و جہاد میں نہیں گئے تھے، لیکن ان کو افراد و سامان رسد مہیا کرانے کا کام جاری رکھے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے مخلصانہ تعلق کی برکات ہمیں بھی عطا فرمائے اور ان کے درجات کو بلند کرے، آمین۔

مولانا سید نفیس اکبر حسینی ہنسوی

۱۳۴۹ھ ۱۹۳۰ء تا ۱۴۳۶ھ ۲۰۱۴ء

دینی حلقوں میں یہ خبر بڑے رنج وافسوس کے ساتھ سنی گئی، کہ حدیث شریف اور علوم دینیہ عالیہ کی تدریس سے طویل المدت وابستہ رہنے والی مؤقر شخصیت مولانا سید نفیس اکبر اویس ہنسوی نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔ مولانا سید نفیس اکبر صاحب کا تعلق ہنسوہ ضلع فتح پور کے سادات گھرانے سے تھا، اسی کے قریب محلّہ درگاہ میں مقیم سادات کا ایک اور خاندان بھی آباد ہے جن سے ہمارے خاندان کی رشتہ داری ہے، اس طرح وہاں سے واقفیت اور تعلقات رہے ہیں۔

مولانا سید نفیس اکبر صاحب بڑے عالم دین و مدرس حدیث کی حیثیت سے معروف ہوئے، اور ہتھوڑہ ضلع باندہ میں حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحبؒ کے قائم کردہ دارالعلوم میں درس حدیث کے اعلیٰ منصب اور صدر مدرس کے عہدہ پر تاحیات فائز رہے، اس درمیان انہوں نے طویل عرصہ تدریس حدیث شریف کی خدمت انجام دی، اور جامعہ عربیہ ہتھوڑہ میں صحیح بخاری کی ایک جلد کا درس آپ کے پاس تھا، اور ایک جلد حضرت مولانا قاری صدیق صاحب باندوی پڑھاتے تھے، ان کے تلامذہ میں جو علماء وفضلاء نکلے، ان میں بعض بعض ہندوستان کے علاوہ افریقہ یورپ میں بھی جاکر خدمت علم و دین کا کام انجام دے رہے ہیں، مولانا کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے یکسوئی سے یہ خدمت انجام دی اور یہاں وابستہ ہوکر انہوں نے پھر کہیں اور نظر نہیں ڈالی، جب کہ تنگئ معیشت سے بھی وہ دوچار ہوئے، اور ان کے سامنے یہ مواقع بھی آئے کہ وہ باہر جاسکتے تھے۔

حضرت مولانا قاری صدیق باندوی جو اس درسگاہ کے بانی اور تاحیات وہاں تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے تھے، ملک کے معروف عالم دین اور بزرگ شخصیت کے حامل تھے، ان کی بزرگی و برتری سے ایک طرف ہتھوڑہ باندہ کی اس دینی درسگاہ کو اہمیت حاصل ہوئی تھی، اس کے قیام کی شروعات انہوں نے مکتب سے کی تھی، ترقی کر کے اس نے اعلیٰ تعلیم کی درسگاہ کی حیثیت اختیار کر لی، دوسری طرف مولانا سید نفیس اکبر صاحب صدر مدرس کی حیثیت سے درسگاہ کو حاصل ہوئے اور شیخ الحدیث ہوئے، اس سے درسگاہ کو مزید اہمیت حاصل ہوئی، ان کی تعلیم دارالعلوم دیوبند کی تھی، جہاں ان کو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا تھا، دارالعلوم دیوبند میں داخلہ سے پہلے حضرت مولانا قاری صدیق باندوی سے بھی انہوں نے علمی استفادہ کیا تھا اور اس وقت ان کا جو تعلق حضرت مولانا قاری صدیق صاحب سے قائم ہوا تھا وہ آخر تک قائم رہا۔

دارالعلوم دیوبند میں ان کے رفقاء میں مولانا محمد شوکت صاحب امام وخطیب جامع مسجد ممبئی اور قاضی مجاہد الاسلام قاسمی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں مصر کی اہم علمی شخصیت ڈاکٹر عبدالمنعم النمر تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، ان سے بھی مولانا نفیس اکبر صاحب کو استفادہ کا موقع ملا، مولانا کی عمر چھیاسی ۸۶ سال ہوئی، اور لگ بھگ ساٹھ سال انہوں نے جامعہ عربیہ ہتھورہ میں تدریس کی خدمت انجام دی، ان کے صاحبزادگان میں مولانا محمد طلحہ صاحب، مفتی حذیفہ صاحب، حافظ محمد طہ، اور مولانا محمد سعد اور چار صاحبزادیاں ہیں، ان میں مولانا طلحہ صاحب کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ وہ اپنا نمایاں دینی مقام رکھتے ہیں، اور مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی دام ظلہ کے مجاز بیعت بھی ہیں، معلوم ہوا کہ ابھی دو سال قبل مولانا نفیس اکبر صاحب کو بھی حضرت پیر ذوالفقار صاحب نے ان کے دینی مقام کو دیکھتے ہوئے اجازت وخلافت سے سرفراز کیا تھا، مولانا مرحوم کی وفات سے علم اور درس وتدریس کا جو خسارہ ہوا، وہ بہت محسوس کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کی تلافی کی صورت پیدا فرمائے، اور مرحوم کو اپنی رحمت ومغفرت سے اور رفع درجات سے شاد کرے۔

حکیم صیانت اللہ صدیقیؒ

۱۳۳۹ھ ۱۹۲۱ء تا ۱۴۱۴ھ ۱۹۹۳ء

حکیم صیانت اللہ صدیقی ۲۴؍مئی ۱۹۹۳ء کو صبح ۸:۳۰ ؍بجے انتقال فرما گئے، حکیم صاحب اپنے فن میں کمال ومہارت کے ساتھ بڑی خلیق ودیندار شخصیت کے مالک تھے، اپنے علاقہ کے مقامی مدرسہ جامعہ حسینیہ دارالعلوم اسلامیہ عربیہ کے مہتمم وسرپرست تھے، چنانچہ اسی مدرسہ میں آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور وہیں اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے، حکیم صاحب ہردلعزیز وپسندیدہ شخصیت کے مالک تھے، جس کا اندازہ ان کے جنازہ میں بلاتفریق مذہب وملت ہرطبقہ کے ہزاروں افراد کی شرکت سے ہوتا ہے۔

حکیم صاحب پڑھنے لکھنے اور مضمون نگاری کا بھی بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے، خصوصاً فن طب پر بڑے معرکۃ الآراء مضامین لکھے، ان کے مطب میں مریضوں کا ہجوم رہتا تھا، مرحوم بڑی گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے، غریبوں کا خاص خیال رکھتے تھے، اللہ نے آپ کے ہاتھ میں بہت شفا رکھی تھی، اور بہت پرانے امراض کا علاج بھی آپ اپنے مخصوص طریقہ سے کرتے تھے، جس سے مریض کو فائدہ ہوتا تھا۔

حکیم صاحب ندوۃ العلماء کے رکن انتظامی بھی تھے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بیعت کا تعلق تھا اور ان سے مجاز بھی تھے، مولاناؒ کی تحریروں کا مطالعہ بڑے ذوق وشوق سے کرتے تھے، تعمیر حیات سے انھیں بڑا تعلق تھا اور اس کی افادیت کے بہت قائل تھے، جب مجلس انتظامی کے جلسے میں شرکت کے لیے دارالعلوم آتے تو ایک بڑی رقم

تعمیر حیات کو باصرار عنایت فرماتے جب کہ تعمیر حیات ہر ممبر کو اعزازی بھیجا جاتا ہے۔ حکیم صاحب کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین فرزند حکیم شعیب، جمشید اختر، جنید اختر اور دو صاحبزادیاں ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، حکیم صاحب کے انتقال کی اطلاع تاخیر سے ملی، اطلاع ملتے ہی اسی دن دارالعلوم کی مسجد میں ایک تعزیتی نشست ہوئی جس میں تعزیتی کلمات کے بعد حاضرین سے دعائے مغفرت کی درخواست کی گئی۔

مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی مرحوم

۱۳۱۹ھ ۱۹۰۱ء تا ۱۳۹۱ھ ۱۹۷۱ء

استاذ محترم مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور ماہر لغت ممتاز عالم دین تھے، پھرانہوں نے مدرسہ مصباح العلوم بریلی میں تدریسی خدمت انجام دی، مدرسہ نورالعلوم بہرائچ میں کچھ مدت رہے، پھر دارالعلوم دیوبند تشریف لے آئے، اور مولانا محمد منظور نعمانی کی تحریک پر جس کے وہ بریلی کے قیام میں شریک کار رہے تھے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاد مقرر ہو گئے، اور یہاں ادب عربی کے اونچے اسباق کے ساتھ حدیث وفقہ کی بھی کتابوں کا درس دیا۔اور ۲۳ برس تک ان کی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تاریخی وابستگی رہی، وہ فنافی العلم استاد ومصنف تھے، علم میں ان کا استغراق اشتغال کلی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، وہ طلبہ کے لیے بڑے شفیق اور مہربان استاد تھے، اور ذوق منتقل کرنے کی ان میں اعلیٰ درجہ کی صلاحیت تھی اور انکساری وتواضع ان کی طبیعت میں پوری داخل تھی، مزاج میں سادگی اور جفاکشی نے ان کو اور محبوب ومقبول استاد بنا دیا تھا۔ ماہ جمادی الثانی ۱۳۹۱ھ کے شروع میں انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، ان کی وفات سے صرف ندوۃ العلماء میں ہی نہیں علمی ودینی تمام حلقوں میں بڑا خلا پیدا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو پُر فرمائے، ان کی اہم یادگار عربی سے اردو لغت مصباح اللغات ہے جس کے نام میں انہوں نے اپنے اس مدرسہ کا خیال رکھا جہاں انہوں نے اس اہم علمی کام کا آغاز کیا تھا۔

ان کو اپنے اساتذہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت میاں سید اصغر حسین دیوبندی رحمۃ

اللہ علیہ سے مناسبت تھی، اور وہ ان کی تربیت میں رہے تھے اس کا یہ اثر تھا کہ میاں اصغر حسین صاحب اس سے جوان کا مقروض ہوتا کام نہ لیتے کہ کہیں سود کی بُو نہ آجائے اسی لیے مولانا عبدالحفیظ بلیاوی مرحوم نے بھی اس کا تاعمر خیال رکھا کہ کسی مقروض سے کام نہ لیں، یوں بھی مولانا مرحوم اپنا کام خود کرنے کے عادی تھے، اور بڑی مشکل سے کوئی دوسرا ان کا کام کر پاتا، خود اپنا کھانا پکاتے، اور کھلانے میں دوسروں کو شریک کرتے اس طرح کوئی نہ کوئی ان کے دسترخوان پر مدعو رہتا اور پڑوس کے لوگوں کو بھی وہ سامان بھیج کر شریک کر لیتے۔

مولانا مرحوم اتباع سنت کا پورا خیال فرماتے، اور اس کے ساتھ خوش اوقات اور اوراد و وظائف کے پابند عالم دین تھے، بیعت و استرشاد کا تعلق مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری سے الہ آباد جا کر قائم کیا، اور پھر ان کی خدمت میں متعدد بار الہ آباد اصلاح نفس کے لیے گئے، اور کئی کئی دن قیام فرمایا علم و عمل کی جامعیت کے ساتھ انہوں نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ وہ اصلاح و استفادہ سے مستغنی ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کی ذمہ داری پوری یکسوئی اور پابندی اوقات کے ساتھ انجام دی، جب بہت مجبور ہو جاتے تو تبھی وہ رخصت لیتے اور کتابوں کے ردوبدل پر بھی اپنی رائے اور خواہش کا اظہار نہ فرماتے، اور یہ کہتے کہ ذمہ داران دارالعلوم جو کام بھی ہم سے لینا چاہیں وہ کام کرنا ہم پر لازم ہے، غیبت، تنقید و تنقیص سے وہ بہت دور اور ان کی مجلس اس سے خالی ہوتی۔

مولانا نے ستر سال کی عمر پائی، دو برس سے وہ گھٹنوں کی تکلیف میں تھے جو کم و زیادہ ہوتی رہتی بالآخر ۲۶ رجولائی ۱۹۷۱ء کو دوشنبہ کے دن گیارہ بجے دن کو انہوں نے جان جان آفریں کے سپرد کی۔

پسماندگان میں بڑے بیٹے حکیم صغیر احمد ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل ہیں اس سے چھوٹے صاحبزادگان میں افتخار جمیل صاحب تجارت کرتے ہیں اور مولوی محسن بلیاوی ایک مدرسہ میں پڑھاتے ہیں، مولانا مرحوم نے مصباح اللغات کے علاوہ اردو،

عربی لغت بھی تیار کی تھی اور ایک کتاب ''صلات'' پر اور ایک کتاب ''فروق'' پر تیار کی تھی، ان سب کا تعلق عربی لغت سے ہی ہے، اس طرح وہ تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ تصنیفی مشاغل میں مصروف رہے، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی مختارات پر بھی انہوں نے تعلیق کی تھی، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی ان علمی خدمات کو اور سبھی حسنات کو قبول فرما کر ان کے لیے آخرت میں بڑا ذخیرہ بنائے اور دنیا میں بھی لوگوں کو خوب منتفع فرمائے۔ اور ان کے تدریسی و تصنیفی فیض کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین۔

قاضی عبدالحمید اندوری

۱۳۳۷ھ ۱۹۱۹ء تا ۱۴۲۵ھ ۲۰۰۴ء

قاضی عبدالحمید اندوری مرحوم عصری علوم کے تعلیم یافتہ ایک فاضل شخص تھے، جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کو دین کے کاموں میں لگا کر امت اور انسانیت کو نفع پہنچایا، وہ اچھی انگریزی جانتے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کرکے ان کی تحریک پیام انسانیت میں پوری سرگرمی سے شامل ہوئے، اور اس کے لئے حضرت مولانا کی بعض تقریروں اور تحریروں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا، وہ اندور سے وقتاً فوقتاً حضرت مولانا کی خدمت میں آتے اور ان کی صحبت سے فیض اٹھاتے، لکھنؤ اور رائے بریلی دونوں جگہ قیام کرتے، اور پیام انسانیت کے سفروں میں رفاقت سفر سے بھی فائدہ اٹھاتے اور پہنچاتے۔ چونکہ حضرت مولانا کا رمضان میں قیام رائے بریلی میں ہوتا تھا وہ اس ماہ مبارک کی برکتوں سے فیض ہونے کے لئے ساتھ قیام کرنے کا بھی معمول رکھتے تھے۔

وہ اندور میں ایک اہم عہدہ پر تھے، جس کی بنا پر اندور میں ان کو وقیع نظر سے دیکھا جاتا تھا، وہ اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں کے ساتھ علمی، ادبی کاموں سے دلچسپی رکھتے تھے، اور دینی زمین رکھنے کی وجہ سے وہاں کی دینی شخصیت مولانا معین اللہ ندوی اندوری سے اچھا ربط رکھتے تھے، اور ان کے ہم عمر بھی تھے، اور ان کے توسط سے ان کا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق مستحکم ہوا تھا۔

قاضی صاحب مرحوم کی پیدائش ۴؍اپریل ۱۹۱۹ء کی تھی اور ان کا سانحۂ وفات مئی

۲۰۰۴ء کو اندور میں پیش آیا، اس طرح ان کی عمر ۸۵ سال ہوئی، ان کی وفات سے تحریک پیام انسانیت کو بڑا خسارہ ہوا ہے، اور ہم لوگ ان کی جدائیگی سے ایک مخلص اور سچے محبت کرنے والے کی جدائیگی کا غم محسوس کرتے ہوئے ان کے رفع درجات کے لئے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں۔

صوفی عبدالرحمٰن محمد عمر ممبئی

۱۳۴۰ھ ۱۹۲۱ء تا ۱۴۲۵ھ ۲۰۰۴ء

بمبئی کا شہر ہندوستان کے ان شہروں میں ہے جس کو مادی ترقی اور کاروبار کے سلسلے میں ہندوستان کے دوسرے شہروں پر برتری حاصل رہی ہے، وہاں کے کاروبار اور تجارت کرنے والوں میں مسلمانوں کی بھی ایک خاصی تعداد شامل ہے، یہاں زیادہ تر گجرات علاقے کے لوگ ہیں۔ گجرات کو عرصے سے یہ خصوصیت حاصل رہی ہے کہ وہاں دین اور علم دین سے شغف کے اچھے اور امید افزا نمونے سامنے آتے رہے ہیں، اور وہ خاص طور پر بمبئی میں کاروبار کرنے والے گجراتیوں کی تعداد میں زیادہ ملتے ہیں۔

شروع میں بمبئی کے لوگوں میں جو دین سے قریب ہوتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، ان میں بے دینی اور غلط عقائد کے لوگ غالب تھے، لیکن جب دارالعلوم دیوبند کی بعض عظیم شخصیتوں نے بمبئی کی طرف توجہ کی، جن میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کو اولیت حاصل ہے، تو بمبئی کے لوگوں میں صحیح عقیدہ اور عمل بالسنۃ کے ساتھ دینداری کا سلسلہ شروع ہوا جو بتدریج بڑھا، اور اس کو نمایاں حیثیت حاصل ہوئی، جن لوگوں نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ سے شروع ہی میں فیض اٹھایا، ان میں جناب محمد عمر صاحب کے فرزند جناب عبدالرحمٰن صاحب کا نام نمایاں ہے۔

انہوں نے تعلیم تو عصری حاصل کی تھی اور نوجوانی میں ماڈرن طریقہ پر تھے، اور کاروبار کے لحاظ سے اپنی کمپنی میں باا ثر حیثیت رکھتے تھے، لیکن حضرات علماء کرام اور خاص

طور پر حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ سے ایسے متاثر ہوئے کہ ان کی زندگی میں ایسا انقلاب آیا کہ سیرت وصورت دونوں میں بزرگ صفت عالم دین نظر آنے لگے، اور اپنی دینداری پر پختگی سے قائم رہے بلکہ مزید ترقی کی، اور جلد ہی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز اور خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے ایک طرف کاروبار میں اپنی امتیازی حیثیت برقرار رکھی اور دوسری طرف شیخ ومرشد کے درجہ تک پہنچے۔

انہوں نے اپنی حسن سیرت اور اصلاح وارشاد کے عمل کے ذریعہ دوسروں کو بھی متاثر کیا، اور دینداری اور شریعت پر عمل کرنے کی تلقین کے داعی بن گئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ صلحاء امت اور علماء دین حق کے بمبئی آنے پر ان کے میزبان بننے اور ان کو آرام پہنچانے اور ان کے افادۂ دینی کو دوسروں تک عام کرنے کی فکر بھی کرنے لگے۔ طبیعت میں صلاح کے ساتھ ساتھ خوش خلقی، محبت اور تواضع، دینی ماحول بنانے کا جذبہ تھا اور اپنے اس جذبہ دینی اور اپنے نیک طرز عمل اور ذوق وجذبہ سے علماء دین کی نظر میں ان کو قدردانی حاصل ہوئی۔

اپنی دینی خصوصیت کے لحاظ سے ان کا سلسلہ حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق سے شروع ہوا تھا، پھر دیگر بزرگ شخصیتوں سے بھی ان کا تعلق ہو گیا تھا، مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ان کا خصوصی ربط قائم ہو گیا تھا اور وہ آخر تک رہا۔

علماء دین اور صلحاء امت سے ان کے قریبی ربط ہونے کے نتیجے میں وقت کے اکثر بزرگ جب بمبئی جاتے تو وہ ان کے قیام وآرام کے سلسلے میں پیش قدمی کرتے۔ وہ اپنی دینداری کی وجہ سے ''صوفی'' کے خطاب سے بھی معروف ہو گئے تھے، اور ان کی یہ عرفیت اتنی بڑھی کہ ''صوفی'' کا لفظ استعمال ہونے پر وہی مراد لئے جاتے تھے، صوفی عبدالرحمٰن ان کا نام بن گیا تھا۔

پھر ان کی دینداری اور صلاح وتقویٰ ان کی ذات تک محدود نہیں رہا تھا، بلکہ ان کی کوشش اور فکر سے ان کے اہل تعلق میں بھی پیدا ہوا اور خود ان کی اولاد میں اس کا ایسا

اثر ظاہر ہوا کہ ان میں سے ہر ایک صوفی صاحب کی شکل وہیئت میں اور ان کے انداز سیرت میں دیکھا جاتا ہے جس کا سلسلہ تا حال باقی وجاری ہے۔ اور ان کے صاحبزادگان جن میں عالم دین بھی ہیں، اور جدید علوم کے تعلیم یافتہ بھی، کاروبار کو سنبھالنے اور دیکھنے والے بھی ہیں لیکن ہر ایک دیندار ومولوی اور صوفی صافی معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان کی طرف سے اپنی اولاد کی دینی اصلاح وفکر اور تربیت کا نتیجہ ہے، اور یہ اس حد تک کہ متعدد بہت سے دیندار خاندانوں میں بھی اتنی وسیع حد تک نہ ملے گی۔

صوفی صاحب نے اصلاح وارشاد کے دائرہ میں تصنیف وتالیف کا کام بھی کیا ہے، ان کے کئی رسالے ہیں جن میں انہوں نے شریعت کے احکام پر عمل کرنے اور سنت نبوی کی پابندی کرنے کی تلقین کی ہے، اور انہیں طبع کرا کے تقسیم کیا ہے، وہ آخر عمر میں حج اور عمرہ کے لیے کثرت سے جانے لگے تھے، اور مدینہ منورہ میں موجود اپنے بیٹے کے تعلق سے طویل قیام کرنے لگے تھے، ان کے دو بیٹے عالم دین ہوئے اور اچھی علمی استعداد کے مالک ہوئے، ان میں ایک مولوی محمد ولی اللہ ندوی ہیں جو شریعہ کالج راس الخیمہ امارات عربیہ میں استاد ہیں، ان کے ایک دوسرے بیٹے مولوی رشید احمد ندوی جو بمبئی میں ہیں، اور ان کے دیگر بیٹے بعض ڈاکٹر ہیں، بعض انجینئر ہیں، اور بعض نے اپنے کو کاروبار کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے، اور متعدد سعودی عرب میں مختلف جگہوں پر ملازم یا کاروبار کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کو صالح بنایا، اور وہ اپنے والد ہی کے راستے پر ہیں۔

صوفی صاحب کا تعلق حضرت علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے ندوۃ العلماء سے بھی ہو گیا اور اسی تعلق کی بنا پر اپنے مذکورہ بالا دونوں بیٹوں کو اور اپنے نواسہ کو ندوہ میں تعلیم دلائی، اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی منتخب ہوئے اور ندوۃ العلماء کی تقویت اور ہمدردی میں پیش پیش رہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی نیکی اور دینداری کے جذبے کا صلہ اس صورت میں بھی عطا فرمایا کہ وہ وفات کے وقت مدینہ منورہ میں تھے، وہیں تدفین عمل میں آئی اور زندگی

جس دینی جذبے اور تقویٰ کے ساتھ گزاری اس کو اللہ تعالیٰ نے قبولیت کا درجہ اس طرح بھی عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے قرب وقبولیت کا مقام عطا فرمائے۔

میرے دل میں صوفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جو عزت ہے اور مجھ کو ان کی محبت سے جو واسطہ پڑتا رہا ہے، اس کی بنا پر میں اپنے لئے یہ سعادت کی بات سمجھتا ہوں کہ ان کے تذکرے میں اپنی قدردانی کے الفاظ کا اضافہ کروں۔ آخر میں ان کے صالح وفاضل فرزند مولوی ڈاکٹر ولی اللہ ندوی ازہری کے مضمون سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں جس سے ان کی زندگی کے کچھ مخفی پہلو سامنے آئیں گے جن میں دوسروں کے لیے سبق کا سامان ہے وہ لکھتے ہیں:

موصوف کی ولادت ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ شعور سنبھالا تو گھر اور باہر ہر طرف انگریزیت کی چھاپ دیکھی، زندگی کے ابتدائی ایام اسی تہذیب میں گزرے، وہی شعور، وہی لباس، وہی تعلیم، وہی طرز زندگی، وہی اہداف، وہی منزل۔ جوانی کے آغاز میں جب عمر کی بیسویں منزل ۱۹۴۱ء میں تھے کہ نظام تکوینی کے مطابق ایسے شاہین کے شکار بن گئے جس نے اپنی گرفت میں لیتے ہوئے موصوف کو مغربی تہذیب کی تنگ وتاریک اور پُر خطر وادی سے نکال کر روحانیت کی بلند وبالا چٹانوں اور للّٰہیت کی پُر سکون فضاؤں میں پہنچا دیا۔ بس پھر کیا تھا کہ زندگی کی رِیت بدل گئی، انانیت اور خود غرضی مات کھا گئی اور تاحیات اپنے شیخ حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے احسان مند اور گرویدہ ہو کر رہ گئے اور ایسے گرویدہ کہ جس میں ذرہ برابر بھی لچک ان کٹھن لمحات میں بھی نہیں آئی جن میں بہت سے اہل خیر کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔

زندگی کی یہ تبدیلی ایسی مبارک ثابت ہوئی کہ اس کے ذریعہ ہر چیز میں انقلاب آگیا، چنانچہ لباس، وضع قطع، طور طریقہ، دوست احباب کا حلقہ، رہن سہن، مشغولیت ومصروفیت سب کچھ بدل گیا۔

یہ تبدیلی اہل خاندان اور حلقہ احباب کے لیے غیر مانوس ہونے کی وجہ سے زندگی ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوگئی جہاں ایک طرف اگر بعض افراد نے پذیرائی کی تو دوسری

طرف اکثریت نے مخالفت اور تنقید کا نشانہ بھی بنایا۔ نتیجۃً کشمکش، اخذ و رد، تحمل و ابتلاء کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا مگر قبلہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی کوشش اس مرحلہ میں یہی رہی کہ حکمت و محبت کے ساتھ اپنے مخالفوں کو مانوس کر کے اس راہ حق پر چلنے والا بنا دیں جس پر وہ خود بفضلہٖ تعالیٰ گامزن ہو چکے تھے۔ چنانچہ اپنی اس کوشش میں بہ توفیق الٰہی بہت کامیاب ہوئے اور اپنی قیام گاہ ممبئی، اپنے وطن کڈی، اور اپنے گرمائی مستقر لوناوالہ ہر جگہ اپنے ہم خیال لوگوں کا ایک بڑا حلقہ انہوں نے تیار کر لیا جو ان کے لیے اس میدان عمل میں بڑا معاون ثابت ہوا۔

دعوتی اور اصلاحی کام کے سلسلے میں قبلہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ اور اصول یہ رہا ہے کہ پہلے اپنی اصلاح کی فکر ہو، پھر اپنے اہل خانہ کی، پھر دوسروں کی اصلاح کی، بریں بنا انہوں نے پہلے خود کو شریعت کا اور خاص طور پر سنتوں کا پابند کیا، پھر اندرون خانہ یا بیرون خانہ جہاں کہیں کوئی خلل پایا یا خلاف شرع عمل دیکھا فوراً متنبہ کر دیا، اور اس سلسلہ میں وہ کسی کی طرف سے ملامت کی کوئی پرواہ نہ کرتے۔ چنانچہ اسی مزاج کی وجہ سے شہر ممبئی کی عام تقریبات نکاح وغیرہ میں شرکت نہیں کرتے تھے، اس ضمن میں اگر ضرورت پڑتی تو خود ہی ذمہ دار ادارہ (پرنسپل) سے مل کر استثنائی اجازت بھی حاصل کر لیتے۔

اتباع سنت کا یہ عالم تھا کہ عبادات کی سنتوں پر عمل تو ہوتا ہی تھا معاملات، معاشرت اور نجی زندگی میں سنتوں کا بھی خوب ہی اہتمام کرتے۔ سر پر تیل لگانے کی سنت، آنکھوں میں سرمہ لگانے کی سنت، تکیہ استعمال کرنے کی سنت، دوزانوں اور ہیئت جلوس میں اس کا خاص اہتمام کہ داہنا پیر بائیں پیر کے اوپر رہے۔ نیز یہ ساری سنتیں اور ان کے مراجع وماٗخذ معتبر کتابوں سے خوب مستحضر رکھتے اور سنتوں کا یہ اہتمام ساری عمر رہا یہاں تک کہ آخری لمحات میں جب کپڑے کے استعمال میں سہارے کی ضرورت پڑنے لگی تو تاکید کرتے کہ دیکھو داہنا قدم پہلے ڈالو اور اگر معاون نے کبھی غلطی سے بھی بائیں میں کپڑا پہلے ڈال دیا تو فوراً نکلواتے۔ ان کی اسی اتباع شریعت و تطبیق کا ثمرہ تھا کہ بارہا نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے خواب میں مشرف ہوئے اور گھر میں اس کا ذکر بھی فرمایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ اکثر مدینہ منورہ کی حاضری میں روزہ کا اہتمام کرتے، اور ضروریات کی خریداری میں اہل مدینہ سے کبھی بھاؤ تاؤ نہ کرتے، دوکان دار نے جو مانگ لیا پیش کر دیتے اور فرماتے کہ تاجدار مدینہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار کا یہ ادنی حق ہے۔ کئی بار مدینہ منورہ حاضری کے موقعہ پر زیارت جنت البقیع کے لیے ناچیز کا ان کے ساتھ جانا ہوا، جب بھی زیارت و دعا سے فارغ ہوتے تو بقیع کی مٹی ہاتھ میں لے کر حسرت سے کہتے کہ یہ سونا ہے سونا! یہ خوش نصیبوں ہی کو ملتا ہے، یہ کہہ کر آنکھیں اشک بار ہو جاتیں: اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ تمنا بھی پوری کر دی چنانچہ خود بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہو کر گروہ صالحین میں جا ملے۔ رحمه الله رحمةً واسعةً.

ایڈوکیٹ عبدالرحیم قریشی حیدرآبادی

۱۳۵۳ھ ۱۹۳۴ء تا ۱۴۳۷ھ ۲۰۱۶ء

اسسٹنٹ جنرل سکریٹری وترجمان آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت جناب عبدالرحیم قریشی کا ۳/ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۴/جنوری ۲۰۱۶ء کی صبح چند دنوں کی علالت کے بعد انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نماز جنازہ بعد نماز عصر حیدرآباد کی تاریخی مکہ مسجد میں ادا کی گئی اور تدفین نظام شاہی قبرستان میں ہوئی، جس میں بڑی تعداد میں اہل تعلق نے شرکت کی، پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ پانچ صاحبزادے اور چھ صاحبزادیاں ہیں۔

مرحوم سرکاری آڈیٹر تھے، لیکن بانی مجلس تعمیر ملت مولانا خلیل اللہ حسینیؒ کی ایماء پر انہوں نے سرکاری ملازمت ترک کردی اور ملت کے کاز کے لیے اپنے کو وقف کردیا، ۱۹۷۲ء میں جب آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا، تو اس کے روز اول سے سکریٹری کے منصب پر وہ فائز رہے، ان کی بڑی خصوصیت بے لوث کام کرنے کا جذبہ اور ملت کی سچی خیر خواہی تھی، اور دوسری بڑی خصوصیت ان کا گہرا اور وسیع مطالعہ، ملی معاملات اور ملکی قانون سے گہری واقفیت تھی، ان کی ان دونوں خصوصیتوں کے نہ صرف بورڈ کے ذمہ داران اور ارکان قائل ومعترف تھے، بلکہ عام حلقوں میں بھی ان کی شخصیت ایک بے داغ شخصیت کے طور پر دیکھی جاتی تھی، اور ان کی خصوصیات کی مقامی طور پر بھی بڑی قدر تھی، اور ''مجلس تعمیر ملت'' میں بھی ان کی خدمات بڑی لائق ستائش تھیں، چنانچہ انہوں نے

۱۹۹۳ء میں مجلس تعمیر ملت کے صدر کا عہدہ سنبھالا، مجلس کے ذریعہ انہوں نے ملی فلاح و بہبود کے کئی کام انجام دیے، اور اس کے ذریعہ مختلف دینی وملی موضوعات پر پروگرام منعقد کرکے دینی وملی بیداری کا کام بھی کرتے تھے، جس میں ماہ ربیع الاول کے موقع پر عظیم جلسۂ سیرت النبی کا انعقاد بھی تھا۔

بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کے امیر شریعت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے دوسرے جنرل سکریٹری حضرت مولانا سید نظام الدینؒ کے جنرل سکریٹری کے عہدہ پر ہونے کے دوران حیدرآباد کی محترم ملی شخصیت اور ممتاز قانون داں ایڈوکیٹ جناب عبدالرحیم قریشی بورڈ کے اسسٹنٹ سکریٹری جنرل کی حیثیت سے بورڈ کے کاموں میں بڑی تقویت کا ذریعہ بنے، اور جس کو انہوں نے بخوبی انجام دیا، وہ اپنی خدمات، قانونی معلومات، ملت کی قیادت کے تقاضے کو سمجھنے میں نمایاں رہے، اور بورڈ کے سلسلہ میں بڑے فہیم رکن تھے، اسسٹنٹ جنرل سکریٹری کے منصب پر فائز ہوئے اور بورڈ کے ترجمان کی حیثیت سے بھی متعارف ہوئے، مجھے ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کی حسن کارکردگی سے واقف ہونے پر اندازہ ہوا کہ وہ بڑی اعلیٰ صلاحیت کے حامل اور ملت کے بڑے ہمدرد اور مخلص قائد ہیں، وہ ملت کے معاملات کو، اس کے عملی تقاضوں کو سمجھنے کی بڑی اچھی صلاحیت رکھتے تھے اور اپنی اس صلاحیت سے وہ بورڈ کے قانونی مسائل اور انتظامی معاملات میں اچھی تقویت کا ذریعہ بنتے تھے، مقدر کی بات کہ جنرل سکریٹری جناب مولانا سید نظام الدین کی وفات کو دو ماہ سے کم عرصہ گزرا تھا کہ ان کے معاون خاص دنیائے فانی سے عالم باقی کی طرف رخصت ہوگئے، یہ بورڈ کے اور پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے بڑے خسارہ کی بات سمجھی گئی اور اس سانحہ کو ایک بڑے خلا کے طور پر دیکھا گیا، اللہ تعالیٰ انہیں ان کی مخلصانہ کوششوں کا بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

بورڈ میں ان دو حضرات کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ پورا فرمائے، بورڈ کے مسائل میں بورڈ کو ان سے بڑی مدد ملتی تھی اور ان کے قیمتی وصائب مشوروں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا تھا، خاص طور پر قانونی مسائل میں بورڈ کو ان کے

مفید مشوروں سے بڑا فائدہ پہونچا، ان کی رائے کو بورڈ کے دیگرارکان بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور بورڈ کے دفتر دہلی کے لیے جب بورڈ نے ان کی خدمات حاصل کیں تو وہ حیدرآباد سے اس کے لیے سفر کر کے آتے اور دہلی میں کچھ وقت گزارتے تھے، اور یہ سب کچھ وہ بےلوث کرتے تھےاور سادہ زندگی گزارتے تھے۔

جناب عبدالرحیم قریشی مرحوم ایک اچھے مصنف اور علم وتحقیق رکھنے والے اعلیٰ سطح کے قانون داں تھے،ان کی یہ خصوصیت خاص طور پر ان کے قلم سے نکلی آخری کتاب ''ایودھیا تنازعہ، رام جنم بھومی ،فسانہ ہے حقیقت نہیں'' میں ظاہر ہوتی ہے،جس میں انہوں نے اس مسئلہ کو بڑے حقائق اور علمی انداز سے پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ اس جگہ سے رام چندر کا کوئی تعلق نہیں تھا،اور یہ پیش کیا ہے کہ اس مسئلہ کو مذہبی جذبات کی بنیاد پر اپنی پسند کا مسئلہ بنا کر جھگڑے کا مسئلہ بنادیا گیا،اور ملک کے پرامن مزاج کو بگاڑ کر اس کومختلف مذاہب والے ملک میں آپسی ٹکراؤ کا ذریعہ بنادیا گیا،ان کی یہ کتاب تاریخی وتحقیقی انداز میں تیار کرنے پر بابری مسجد کے تعلق سے ایک دستاویز کی حیثیت کی حامل ہوگئی، انہوں نے اس مسئلہ کی تاریخ پوری احتیاط کے ساتھ اور بڑے علمی انداز میں پیش کی ہے، حالانکہ یہ مسئلہ مسلمانوں کے لیے بھی ایک جذباتی مسئلہ بن گیا تھا،وفات سے ایک دوماہ قبل انہوں نے دہلی میں ایک پروگروم اپنی مذکورہ کتاب کے اجراء کا رکھا تھا،بورڈ کی طرف سے ہی اس کی اشاعت بھی ہوئی تھی۔

قریشی صاحب بڑی گوناگوں صلاحیتوں اور اعلیٰ کردار وصفات کے حامل ملت کے ایک فرد ہی نہیں بلکہ اس کے قائد ورہنما تھے،اللہ تعالیٰ ان کی ملی خدمات اور فکرامت کا بہترین صلہ عطافرمائے اوراجرعطا کرے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ

ایک عظیم مصلح اور شیخ طریقت

۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء تا ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء

شیخ طریقت ورہبر دین واخلاق عارف باللہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری نے لوگوں کی تربیت اور تزکیہ کا وسیع اور غیر معمولی فریضہ انجام دے کر مورخہ ۱۳ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ (۱۶ اگست ۱۹۶۲ء) کو اس جہان فانی سے رحلت کی اور لاکھوں افراد کو سوگوار چھوڑ گئے، ان کا سانحۂ ارتحال لاہور (پاکستان) میں پیش آیا اور تدفین ان کے آبائی وطن ڈھڈھیاں ضلع سرگودھا (پاکستان) میں ہوئی، تربیت وتزکیہ کے میدان میں یہ ایک ایسا خسارہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا گویا ملت یتیم ہوگئی، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ خصوصی رحم وکرم اور انعام کا معاملہ فرمائے، اور ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

حضرت رائے پوری احسان وسلوک میں ممتاز اور بزرگوں کے سلسلے کی اہم یادگار تسلیم کئے جاتے تھے، ان کے اس امتیاز اور اس خصوصیت کو ان کے عہد کے ممتاز شیوخ طریقت تسلیم کرتے تھے، اور ان سے لاکھوں نے فیض اٹھایا، جن میں ملت کے مختلف طبقات اور مختلف سطح کے لوگ تھے، جن کا تعلق الگ الگ میدان فکر وعمل سے تھا، مگر یہ ایسا مرکز تھا جہاں سب جمع ہوتے تھے، اور اس چشمۂ فیض سے اپنی تشنگی بجھاتے تھے۔

مجھے زندگی کا جب شعور حاصل ہوا، تو اس وقت ہندوستان میں برطانوی سامراج سے گلوخلاصی کی کوششوں کا چرچا تھا، اور مسلمانوں کی عمومی زندگی میں اقتصادی بدحالی اور اخلاقی

و دینی بے اعتنائی کا بھی دور دورہ تھا، اسی کے ساتھ ساتھ دینی زبوں حالی کو دور کرنے اور مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح کا کام بھی جگہ جگہ انجام دیا جارہا تھا، اور اس سلسلے میں جن بڑے ربانی علماء اور شیوخِ طریقت کا تذکرہ میں اپنے بڑوں سے سنتا تھا، ان میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، حضرت مولانا احمد علی لاہوری نمایاں حضرات تھے، ان میں سے سبھی کو دیکھنے کا موقع بھی ملا، اور ان میں سے متعدد حضرات کی خدمت میں بار بار حاضری اور ان کے وعظ و نصیحت سننے کی سعادت حاصل ہوئی، خاص طور پر حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کہ جن کو تزکیۂ باطن کے طالبین کے مرجع کی حیثیت حاصل تھی، وہ شہری علاقے سے الگ قصبہ ''رائے پور'' کے بیرونی حصہ میں جہاں راحت اور شہری زندگی کی سہولتوں کا کوئی انتظام نہیں تھا، جنوبی سمت کے ایک باغ میں جو باغ رحیمی کہلاتا تھا، اپنے شیخ، شیخ زمانہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہ کے جانشین کی حیثیت سے مقیم تھے(۱)، اور وہ جگہ باوجود آبادی سے الگ ہونے کے ان کی خدمت میں طالبین ارشاد و تربیت کی کثرت آمد سے ایک آباد اور متحرک زندگی کی جگہ معلوم

---

(۱) رائے پور کی بستی اور خانقاہ کے درمیان نہر حائل ہے، بستی سے جانب غرب نہر کے کنارے کچھ فاصلہ پر وہ کوٹھی ہے جس میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہ العزیز کا قیام تھا، اس سے جانب غرب مسجد اور مدرسہ کی پختہ عمارت ہے، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی حیات تک یہی خانقاہ اور اسی کے گرد و پیش طالبین خدا کا قیام تھا، جب حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے لیے چودھری محمد صدیق صاحب نے اپنے باغ میں جو مسجد سے مغربی جانب واقع ہے، نئی قیام گاہ تعمیر کرادی، تو نئی خانقاہ وہیں منتقل ہوگئی، اس کے سامنے چند چھپر ڈال دیئے گئے سانپوں کی کثرت کی وجہ سے چارپائیوں کا خاص اہتمام کیا گیا، حضرت کی ہمیشہ تاکید ہوا کرتی تھی کہ رات کو لوگ چارپائیوں ہی پر آرام کریں، اور نوافل بھی حتی الامکان کسی بلند جگہ پر پڑھیں، جانب شمال ٹین کا ایک لمبا سائبان تھا، اور ایک بڑا دالان اور برآمدہ اس طرح کثیر التعداد کے لیے رہائش اور بقدر ضرورت آسائش کا سامان تھا، گرمیوں میں چھپروں میں رات بڑی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی، وفات سے تقریبا ڈیڑھ سال پیشتر پھر آپ کا قیام حضرت کی سابقہ کوٹھی میں ہوگیا، اور مقیمین خانقاہ کی بڑی تعداد اس کے آس پاس مقیم ہوگئی، حضرت دس روپے ماہوار کے حساب سے اس کا کرایہ مدرسہ کو ادا فرماتے تھے۔

ہوتی تھی، یہ متحرک زندگی شہری ہماہمی کی نہیں تھی، یہ ذکر وعبادت کی ہماہمی کی زندگی تھی۔

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری جن کے نام کے ساتھ رائے پوری کی نسبت ان کے نام کی صفت بن گئی تھی اصلاً رائے پور کے رہنے والے نہ تھے، وہ پنجاب کے ضلع سرگودھا (جواب پاکستان میں ہے) کے ایک قصبہ ڈھڈھیاں کے رہنے والے تھے، لیکن اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کی خدمت میں اتنی دراز مدت تک رہے اور ان سے فیض اٹھانے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کی اس منزل تک پہنچے کہ ان کے جانشین ہوئے، اور انھیں کی جگہ پر اس طرح ہر طرف سے منھ موڑ کر بیٹھ گئے کہ وہیں کے سمجھے جانے لگے، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کو شہرت اور ناموری اور دنیاوی فکر وراحت سے ایسی بے نیازی حاصل تھی کہ رائے پور کا رہائشی نظام ایسا بن گیا تھا کہ ان کی خدمت میں جانے والوں کو اپنی عادت میں داخل سہولتوں سے وہاں جا کر دست کش ہونا پڑتا تھا، اور ان کی خانقاہ میں ذکر اور عبادت کی یکسوئی کو اختیار کرنا پڑتا تھا، اور یہ ان کی تربیت اور دین کی طرف یکسو کرنے کے لیے ایک مؤثر ذریعہ ہوتا تھا، حضرت مولانا نے خود اپنے شیخ کی خدمت میں ایسی بے نفسی اور گم نامی کے انداز سے وقت گزارا تھا، کہ ان کے شیخ کو تو ان کے حال کی خوبی خوب معلوم تھی، لیکن دوسروں کو ان کی کسی اہمیت کا پتہ نہیں چلتا تھا، اور خدمت شیخ میں ان کو بعض وقت ایسی زحمتوں سے گزرنا ہوتا تھا، جو عام دین دار آدمی کے لیے مشکل ہوتا ہے، اسی لیے جب وہ اپنے شیخ کے بعد ان کے جانشین ہوئے تب لوگوں کو ان کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔

حضرت کی بے نفسی انتہائی بڑی ہوئی تھی اپنے معتقدین اور مسترشدین کے سامنے ایسی باتیں کرنے کا تقریباً موقع ہی ہاتھ نہیں آتا تھا، کہ جن سے ان کی شخصیت کی عظمت کا احساس ہوتا، سیدھے سادے انداز میں اور عام تجرباتی زندگی کے حوالہ سے دوررس باتیں فرماتے، اور خاموش انداز میں اپنے مسترشدین کی تربیت فرماتے، خانقاہ رائے پور میں ہمہ وقت لا الہ الا اللہ، اور اللہ، اللہ کے ذکر کی گونج ملتی، بے نفسی اور دنیا کے معاملات سے بے نیازی کو دیکھ کر آدمی یہ سمجھتا، کہ ان کو دنیا کی حقیقتوں اور ضرورتوں کا علم نہیں ہے، لیکن امت کے

کسی بھی اہم مسئلہ میں ان سے رائے حاصل کی جاتی تو بصیرت اور دوراندیشی کا اندازہ ہوتا، ان سے ملنے والے اور ان کے دیکھنے والے ان کے رہن سہن کے انداز اور بے نفسی سے متاثر تھے چنانچہ اور ایک خاموش انداز سے دلوں میں ان سے عقیدت پیدا ہوتی گئی، بتدریج ان کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی اور اس ملک سے اس ملک تک یہ مقبولیت پھیلتی گئی، تقسیم ہند کے بعد ان کا اپنا وطن پاکستان کا حصہ بن گیا تھا اور ان کے معتقدین ومسترشدین بھی بڑی تعداد میں پاکستان کے ہی شہری بن گئے تھے، اس لیے ان کو بار بار پاکستان بھی جانا پڑتا، جہاں خاصا وقت لاہور میں گزارنا ہوتا، وہاں ان کے ایک مسترشد بڑے عہدہ پر تھے، اور ان کا تعلق ایسا تھا، کہ ان کے مسترشدین کو ان کے یہاں استفادہ کی سہولت زیادہ حاصل ہوتی، حضرت جب پاکستان میں قیام فرما ہوتے تو ان سے استفادے کے لیے ہندوستان سے لوگ وہاں کا سفر کرتے، ان لوگوں میں میرے ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بھی تھے، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو حضرت سے استفادہ کا تعلق ہو گیا تھا اور یہ تعلق بتدریج بڑھتا چلا گیا، جو خصوصی اعتماد اور گہرے ربط کی حد تک پہنچ گیا، اور اس کی بنا پر وہ بار بار رائے پور جانے کا موقع نکالتے تھے، اور اس تعلق کے اثر سے مجھ خوردوں کو بھی حضرت کی خدمت میں حاضری کی سعادت ملنے لگی، اور اپنی آنکھوں سے ان کی شخصیت کو دلنواز اور مؤثر شخصیت محسوس کرنے کا موقع ملا، اس کے ساتھ ان کی شفقت سے اس عقیدت کو تقویت حاصل ہوتی رہی، میرے اور میرے ماموں کے وطن رائے بریلی اور عملی مستقر لکھنؤ میں حضرت کو کئی بار دعوت دی گئی، اور وہ تشریف لائے جن کی وجہ سے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اور ہم جیسے خوردوں کو شفقت کا رویہ بھی حاصل ہوا، حضرت کی دلنواز شخصیت نے سب کو متاثر کیا، اور خاندان کے متعدد افراد نے حضرت سے بیعت وسلوک کا تعلق قائم کیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی حضرت کا قیام رہا اور دارالعلوم کے بعض اساتذہ وکارکنان اور بعض طلبہ بھی ان سے روحانی طور پر وابستہ ہوئے اور لکھنؤ ورائے بریلی اور قریب کے اضلاع کے لوگوں نے بھی یہ تعلق قائم کیا اور دینی وباطنی اصلاح کی فکر کی۔

۱۹۵۰ھ میں حضرت نے سفر حج کا ارادہ فرمایا اور اس میں خال معظم مولانا سید

ابوالحسن علی ندویؒ کو بھی اپنے ساتھ رہنے کا موقع عنایت فرمایا، اس موقع سے خال معظم نے اپنے کئی شاگردوں اور عزیزوں کو جن میں یہ کاتب سطور بھی ہے شریک سفر ہونے کا موقع عطا کیا، اس سفر میں جہاں حجاز مقدس کی برکات اور حرمین شریفین کی مبارک فضا سے دلوں کو جو تسکین ملتی ہے اس کے ساتھ ساتھ حضرت کے سربراہ سفر ہونے سے مزید برکت اور دلوں کو تقویت ملی، حضرت کا تواضع اور بے نفسی کا انداز ایسا تھا کہ اگر لوگوں کا ان کے ساتھ قدر واحترام کا رویہ نہ دیکھتے تو ان کی شخصیت کو کوئی ممتاز شخصیت سمجھنے کا احساس نہ ہوتا، وہ اپنی سادگی کے اسی انداز میں متوجہ الی اللہ رہتے اور اندر سے ذکر ومعرفت الٰہی کی جو کیفیت ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی تھی، اس کا کچھ اندازہ دوسرے لوگ ان کی گفتگو کی جو دینی گہرائی ہوتی اس سے کر سکتے تھے، باقی اسلوب کلام یا انداز خطابت کی کوئی بات نہیں ہوتی تھی، خال معظم کا جو گہرا تعلق قائم ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے ان کو حضرت کی دینی رہنمائی کے ساتھ دین وملت کی نصرت اور قوت وترقی کے کاموں میں قیمتی مشورے حاصل ہوتے، ان سے حضرت کی صرف دینی بصیرت ہی کا نہیں بلکہ ملکی اور قومی بصیرت کا اظہار ہوتا تھا، اور ہم لوگوں کو خال معظم کے اس تعلق سے حضرت سے قریب ہونے کا موقع ملتا اور شفقت حاصل ہوتی تھی، یہ شفقت ایک خاموش تربیت اور توجہ دہانی کا کام کرتی تھی، حضرت کی مجلسوں میں جو بڑی حد تک خاموشی کی صفت رکھتی تھیں، اور اس خاموشی کو کسی حد تک کسی دینی کتاب کے پڑھنے سے پُر کیا جاتا تھا، اسی خاموشی اور کتاب کے پڑھنے سے اس مجلس کے شرکاء کو ایک خاموش فائدہ حاصل ہوتا تھا، اور وہ مختلف اوقات میں اردگرد ذکر کی آوازوں سے ایک سماں سا بندھ جاتا تھا، اور اس ماحول اور کیفیت میں وہ کشش تھی جو دور دور سے لوگوں کو کھینچ لاتی تھی۔

یہ ایک روشن چراغ تھا جو دور وقریب عرصہ تک روشنی پھیلانے کے بعد اپنے مسترشدین کو غمگین کر کے بجھ گیا، لیکن جن کو اس نے روشنی پہنچائی ان سے دوسروں کو فیض پہنچنے کا سلسلہ قائم ہوا اور یہ چراغ بہت سے چراغ روشن کر گیا، اللہ تعالیٰ حضرت کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، اور ان کے نورانی کاموں کا عظیم سے عظیم اجر عطا فرمائے۔

حضرت مولانا شاہ مفتی عبد القیوم رائے پوری

۱۳۵۲ھ ۱۹۳۳ء تا ۱۴۳۹ھ ۲۰۱۸ء

ہندوستان میں جب مسلمانوں کی دعوتی وتربیتی مقصد سے آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو اس ملک کو دینی واخلاقی رہنمائی ملنے کا سلسلہ شروع ہوا اور بتدریج یہ ملک عالم اسلام کے ایک اہم ملک کے لحاظ سے مسلمانوں کے مذہبی مرکز کا حامل ملک بھی بن گیا، جہاں امت مسلمہ کے غیر معمولی صلاحیت وتاثیر کی شخصیتیں نمایاں ہوئیں، اور انہوں نے تجدیدی کام انجام دیئے، یہ ملک اگرچہ مسلمانوں کا اکثریتی آبادی کا ملک نہ بن سکا، اور زبان بھی اسلامی زبان عربی رائج نہ ہوسکی، لیکن نصرت دینی کے لحاظ سے یہ مسلمانوں کے اکثریتی ملک کا ہم پلہ رہا، حتی کہ یہاں کی مذہبی اثر انگیزی اور رہنمایانہ کارگزاری کا اثر متعدد ملکوں تک پہونچا، ایک طرف ممتاز جید علماء پیدا ہوئے، اور انہوں نے علم دین کی خدمت مجددانہ انداز سے انجام دی، جس کو ان کی بیش بہا علمی وفکری تصنیفات سے سمجھا جاسکتا ہے، پھر ان کے اثر سے مسلسل نمایاں علمی مقام کے علماء وداعیان دین تیار ہوتے رہے، اور ان کے درس وافادہ سے اس ملک کے مسلمانوں کو برابر دینی روشنی ملتی رہی، اور ان کے تیار کردہ افراد اپنے اپنے علاقوں میں تعلیم ودعوت کا عمل انجام دیتے رہے، اور وہ سلسلہ الحمدللہ تاحال قائم ہے، اور اس کے ذریعہ اس ملک کو مسلم اقلیتی ملک ہوتے ہوئے علوم دینیہ کی ضرورت میں دیگر قوموں تک کو فائدہ پہونچا، علوم دینیہ اور علماء واعلام کے علاوہ دینی زندگی کے تقویٰ و طہارت باطن کے لحاظ سے بھی ملک کے علماء واتقیاء کی تربیت دینی اور ارشاد باطنی کا نمایاں

نمونہ ملتا ہے، اور اس میں ارشاد و تربیت باطنی کا عمل بڑے اچھے انداز میں ہوا، ملک کے مختلف علاقوں میں اس کے مراکز خانقاہوں کی صورت میں قائم ہوئے اور ملک کی مختلف جگہوں پر یہ خدمت انجام دی جانے لگی، جہاں دین و دنیا کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ تعلق مع اللہ کی دولت حاصل کرنے کے لیے آتے، اور قیام کرتے۔

ان میں سہارنپور میں رائے پور کی خانقاہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی، جہاں ہر طرف سے اپنی اصلاح و تربیت باطنی کے لیے لوگ جمع ہو کر اللہ کے تقرب کی راہ طے کرتے وہاں کے بزرگ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہ بڑے بزرگوں میں تھے، جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے خلفاء میں اونچا مقام رکھتے تھے، اور ان کے بعد دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور جیسی عظیم درسگاہوں اور تعلیمی اداروں کے سرپرست ہوئے تھے، سہارنپور کے ہی آبادی کے شور و غل سے دور قصبہ رائے پور میں جو ان کا وطن تھا، ذکر و عبادت کے ساتھ ارشاد خلق اور تربیت باطنی کے کام میں مشغول ہوئے، جہاں وہ اللہ کا نام لیتے، اور دوسروں کو اللہ کا نام سکھاتے، اس جگہ ان کے بعد ان کے خاص خادم و رفیق اور خلیفہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ بیٹھے اور لوگ ہر طرف سے استفادہ باطنی کے لیے ٹوٹ پڑے، ان کی اور اس جگہ کی خصوصیت کثرت ذکر اور فنائیت تھی، مرجع خلائق ہونے کے باوجود کہیں سے بھی بڑائی محسوس نہیں کی جاسکتی تھی، چنانچہ دور دور تک یہاں کا فیض پہونچا، اور ان کے اور ان کے خلفاء کے ذریعہ دوسروں تک صحیح دینی فکر و مزاج منتقل ہوا، ان کے جانشین شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ کے پاکستان میں مستقل قیام اختیار کر لینے اور پھر اہم خادم و خلیفہ حافظ عبدالرشید رائے پوریؒ کی وفات کے بعد آخر میں اسی قصبہ رائے پور کے ایک محترم عالم و بزرگ مولانا شاہ مفتی عبدالقیوم رائے پوریؒ مسند نشین ہوئے، جو حافظ عبدالرشید رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے اور داماد ہونے کے ساتھ بیعت و ارشاد میں مجاز و خلیفہ بھی تھے، ان کی طرف بھی رجوع ہوا، اور ان کا روحانی فیض بھی عام ہوا، ان کی زندگی شروع سے تقویٰ و للّٰہیت کی حامل زندگی تھی، اور اس کے

ساتھ وہ ایک پختہ عالم دین اور مفتی بھی تھے، مظاہر علوم میں باکمال اور مخلص وشفیق اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہیں تدریس کا سلسلہ بھی قائم رکھا تھا، اور انہیں اپنے اساتذہ ومشائخ کی اچھی توجہ وسر پرستی حاصل تھی، رائے پور میں مستقل قیام کے بعد ان کو یہ محبوبیت حاصل تھی جو برابر بڑھتی گئی وہ ایک بے ضرر اور بلند صفات کے حامل انسان نظر آتے تھے، جسے ان سے ملنے والے سبھی لوگ محسوس کرتے تھے۔

رائے پور کے سفروں میں میرے ساتھ بھی وہ محبت کا معاملہ فرماتے تھے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زندگی میں وہ رائے بریلی اور لکھنو کا سفر کرتے، تو بھی ان کی تواضع اور فنائیت کی صفت نظر آتی، نزاعی باتوں سے انہوں نے ہمیشہ گریز کیا، اور دینی تعلیمات ومعمولات پر سختی سے کاربند رہے(۱)،اور خانقاہ رائے پور کے اس مزاج کو بھی قائم رکھا، جو اس کے شیخ اول حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب بنا گئے تھے،اور جس کو اس کے شیخ ثانی حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری نے فروغ دیا تھا،اور اس کے ذریعہ تعلق مع اللہ کی دولت حاصل کرنے کا جذبہ عام ہوا تھا، ہزاروں نفوس کی اصلاح وتربیت اس جگہ ہوئی تھی، جس کے در و بام سے ہر وقت ذکر اللہ کی آواز گونجتی تھی،اور وسیع پیمانے پر اصلاح و تربیت اور تعلیم ودعوت کا کام انجام پایا تھا۔

---

(۱) کچھ عرصے سے حضرت مفتی صاحب پر ذہول ونسیان کی کیفیت غالب ہوتی گئی اور پھر وہ مستغرق فی اللہ اور دنیا ومافیھا سے بظاہر بے خبر و بے تعلق ہو گئے ،ایک زمانہ تک اللہ اللہ زبان پر جاری رہا مگر ادھر چند سالوں سے بالکل خاموش رہتے تھے جس زمانہ میں استغراق کی کیفیت میں زبان پر اللہ اللہ جاری رہتا تھا اس زمانہ میں اگر کوئی بڑی شخصیت آتی تو اس شخصیت کے ساتھ ایسے انداز سے پیش آتے ،گویا کہ اس کا احترام کر رہے ہیں،ان کو غذا مشروب کی شکل میں پائپ کے ذریعہ دی جاتی تھی، مفتی صاحب کی پیدائش یکم جنوری ۱۹۳۲ء میں ہوئی، مظاہر علوم میں تعلیم مکمل کی ،اور کچھ دنوں تک مدرسہ خادم العلوم باغوں والی ضلع مظفر نگر میں پڑھایا، پھر اکابر کے مشورہ سے مظاہر علوم میں تشریف لے آئے ،اور ۲۲ سال تک تدریسی فرائض انجام دیئے،مظاہر سے یکسو ہونے کے بعد خانقاہ رائے پور کو آباد کیا،طویل عرصہ تک امت مسلمہ کو فیضیاب کرتے رہے، یہاں تک کہ اپنے مالک حقیقی سے ۱۳ فروری ۲۰۱۸ء بروز منگل صبح کو جا ملے

اسی طرح مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب رائے پوری کا حادثہ وفات ایک محسوس کیا جانے والا حادثہ اور دینی خسارہ کے طور پر سمجھا جانے والا سانحہ ہے، افسوس کے جب اس سانحہ وفات کی اطلاع ملی، تو ہم جنوبی ہند کے ایک سفر میں تھے، اور جنازہ میں شرکت کے حال میں نہ تھے، انہوں نے ۸۶ سال کی عمر پائی، اور اس اچھی عمر کو انہوں نے خالص دینی کام میں لگا کر بڑی مقبولیت پائی، جو ان کے جنازہ میں شرکت کرنے والے مجمع سے کیا جاسکتا ہے، کہ تھوڑے وقت میں ہر طرف سے لوگ اس سعادت کے حصول کے لیے ٹوٹ پڑے تھے اللہ تعالیٰ علیین میں ان کو جگہ عطا فرمائے، اور ان کی برکات کو قائم و دائم رکھے، آمین۔

مولانا مفتی عبداللہ پھولپوری

۱۳۷۹ھ ۱۹۶۰ء تا ۱۴۳۹ھ ۲۰۱۷ء

اعظم گڑھ مئو، غازی پور اور اس کے مضافات علماء و مشائخ اور دینی مراکز کا گڑھ رہے ہیں، اور یہاں کے علماء و مشائخ اور دینی مراکز سے دور دور تک فائدہ پہنچتا رہا ہے، انہی دینی مراکز میں سرائے میر کے دو بڑے دینی تعلیمی و تربیتی ادارے ہیں، ایک مدرسۃ الاصلاح جس کو علامہ شبلی نعمانی اور حمید الدین فراہی سے خاص نسبت ہے، اور یہ ادارہ ندوۃ العلماء سے قریب سمجھا جاتا رہا ہے، وہاں کے فارغین دار العلوم ندوۃ العلماء آکر عربی زبان و ادب کی تعلیم کی تکمیل بھی کرتے رہے ہیں، اور ان میں کئی بڑے ممتاز بھی ہوئے، وہاں کے ذمہ داروں میں کئی کا اصلاحی تعلق ہمارے خاندانی بزرگ حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی (۱)

---

(۱) مولانا سید امین نصیر آبادی جناب محمد طٰہ کے صاحبزادہ تھے ۹/ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ کو نصیر آباد میں پیدا ہوئے، ۴۰/دن کے ہوئے تو والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ابتدائی تعلیم مولانا محمد احسن نصیر آبادی سے حاصل کی اور حافظ جان محمد سے جو حسن قرات میں مشہور تھے حفظ قرآن ۹/سال کی عمر میں مکمل کرلیا اور فارسی میں دستگاہ حاصل کرلی، عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے عم بزرگوار امولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی سے حاصل کی اس کے بعد جونپور جاکر مولانا عبداللہ چھپروی سے صرف ونحو پڑھی اور مولانا محمد شبلی بن حضرت مولانا سخاوت علی جونپوری (خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ) سے ہدایہ تک کی تعلیم حاصل کی، پھر لکھنؤ میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے ۲۰ سال کی عمر میں درسیات کی تکمیل کی، اور دہلی وسہارنپور تشریف لے جاکر مولانا نذیر حسین محدث دہلوی سہارنپوری سے حدیث پڑھی، حدیث پڑھنے کے بعد اپنے وطن نصیر آباد واپس ہوئے اور کچھ دنوں وہاں قیام کیا، پھر رائے بریلی میں دائرہ شاہ علم اللہ تشریف لاکر حضرت سید شاہ ضیاء النبی کی خدمت میں رہے اور سلوک کی تکمیل کی، اس کے بعد ۱۳۰۲ھ میں حجاز تشریف لے گئے حج وزیارت سے مشرف ہوئے اور حدیث شریف کی سند مختلف مشائخ سے=

سے رہا، اوران کے وہاں کے دعوتی واصلاحی سفر بھی ہوتے تھے، دوسرا ادارہ بیت العلوم ہے، یہ ادارہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی سرپرستی میں ان کے ممتاز خلفاء میں شمار کئے جانے والے بزرگ و عالم جلیل حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری نے قائم کیا تھا ، جو دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل تھے، اوران کا حضرت تھانوی سے تعلق سے پہلے ہمارے خاندانی بزرگوں ہمارے والدین ماجدین کے حقیقی نانا حضرت شاہ ضیاء النبی حسنی

=حاصل کی، خصوصاً شیخ الاسلام سید احمد مفتی حرمین شریفین سے چند کتابیں تبرکاً پڑھیں، پھر ہندوستان واپس ہوئے اور طب کی تعلیم حکیم مظفر حسین سے حاصل کی اور درس وتدریس، وعظ ونصیحت، تبلیغ وارشاد کا کام شروع کیا اور ہر جمعہ کو ہزاروں آدمیوں کے سامنے وعظ کہنے لگے۔

> اسی طرح پرتابگڈھ، سلطانپور، اعظم گڈھ، جونپور اوران کے دیہاتوں میں تبلیغ وارشاد کا کام کرنے لگے، مولانا سے بے شمار مخلوق نے فائدہ اٹھایا ان کے وعظ وتذکیر سے ہزاروں کی زندگیاں بدل گئیں اورانہوں نے شرک وبدعت اوررسوم جاہلیت اورغیراسلامی شعائر سے توبہ کی، نماز روزہ کے پابند ہوگئے، حرام کاموں سے بچنے لگے، خصوصاً سود، حرام مال کھانے اورتعزیہ داری، محرم کے سیوم، قبرپرستی کی اطراف وجوانب میں بیخ کنی ہوگئی، مولانا بڑے غیور باحمیت، برائیوں سے نفور تھے، وہ کسی ایسے گھر میں قدم نہ رکھتے جہاں شرک ہوتا ہو، نہ کسی ایسے شخص سے بات کرتے جو حرام کاموں کا مرتکب ہو، وہ عدالتوں میں جانے اورانگریز حکام کا سامنا کرنے کے مخالف تھے۔

۱۳۳۱ھ میں برما تشریف لے گئے اور وہاں بھی امر بالمعروف والنہی عن المنکر کا کام کیا اور شرک وبدعت کے خلاف آواز اٹھائی، برما سے واپسی پر نصیرآباد میں مستقل قیام کیا اورعوت وارشار کا کام کیا مولانا سے اس زمانہ کے علماء ومشائخ خصوصاً ان کے اساتذہ کو بڑا تعلق تھا۔

مولانا اپنے مسلک اظہار حق میں بڑے سخت تھے اس لئے ہر اجتماع میں شرکت نہ فرماتے، صرف اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر لوگوں سے ملتے اور سفر کرتے، مختلف مقامات کے دورے کرتے اور اصلاح باطن کا کام کرتے، آخری دورہ اعظم گڈھ کا کیا اور "الیوم اکملت لکم دینکم" پر موثر وعظ فرمایا، ۲؍جمادی الاخری ۱۳۴۹ھ کی صبح بال بنوائے اورعطر منگایا اور بعد عصر اپنی اہلیہ محترمہ کو صبر کی تلقین کی، قرآن کی تلاوت کے بعد نماز مغرب خود پڑھائی اور پھر مراقبہ میں بیٹھے اور وظیفہ پڑھا اورعشاء ہوتے ہوتے جان جان آفریں کے سپرد کی۔ دوسرے دن عیدگاہ کے میدان میں تین بار نماز ہوئی، جنازہ میں اتنا بڑا ازدحام کبھی نہیں دیکھا گیا۔

اور ان کے خلیفہ اعظم حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی سے رہا تھا، ہمارے ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے تھے کہ ہم سے خود حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ نے بتایا کہ ہم نے آپ کے نانا حضرت شاہ ضیاء النبی حسنی سے اچھی نماز پڑھتے کسی کو نہیں دیکھا، اس طرح ہم لوگوں کا سرائے میر کے ان دونوں مدرسوں سے تعلق رہا، اور اپنے اپنے دائرہ میں ان دونوں اداروں سے بڑا فیض پہونچا۔

حضرت مولانا شاہ عبداللہ پھولپوری انہی حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری کے حقیقی پوتے تھے، اگر چہ وہ اپنے دادا کی وفات کے وقت کم سن تھے، لیکن ان کی برکات و دعائیں و توجہات حاصل کیں، جس کو انہوں نے ان کے خاص تربیت یافتہ بزرگ اور ان کے شیخ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے سب سے کم عمر خلیفہ محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقیؒ سے تعلق قائم کر کے بڑھایا، اور ان کی طرف سے تربیت وارشاد میں مجاز وخلیفہ ہوئے، اور پھر خود ان کا فیض بھی جاری ہوا، اور ان علاقوں میں ان کی آمد و رفت رہی جو ان کے عظیم المرتبت دادا حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری سے وابستہ رہے تھے، لوگ ان کی طرف کشش محسوس کرتے تھے اور ان کو دعوت دیتے تھے، لیکن اپنے شیخ و مربی حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقی کے علاقہ میں آتے، تو وہ اس سے بچتے تھے کہ اپنی مجلس لگائیں یا جلسہ میں جائیں اور اپنی تقریر کریں۔

مجھے ان کے زیر نظامت تعلیمی ادارے مدرسہ بیت العلوم میں چند سال پہلے حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، جو ان کی خواہش و دعوت پر تھی، اور انہوں نے تعلق ومحبت کا اظہار کیا، اور بیان بھی کرایا، کم عمری میں ان کو جو مقبولیت حاصل ہوئی تھی کہ خیال ہوتا تھا کہ آگے چل کر وہ بڑے مشائخ و مربیوں میں ہوں گے، مگر وہ بیمار ہوئے اور اپنے عمرے کے ایک سفر میں مکہ مکرمہ میں وفات پا گئے اور جنت المعلاۃ میں ان کی تدفین عمل میں آئی، یہ ایک طرح سے ان کے اعمال کی قبولیت کی دنیا میں بشارت تھی جو ظاہر ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کے فیض کو ان کے خلفاء ومتوسلین اور صاحبزادگان اور شاگردوں کے ذریعہ جاری رکھے اور زیادہ سے زیادہ عام فرمائے۔

مولانا عبداللہ کاپودرویؒ

۱۳۵۲ھ ۱۹۳۳ء تا ۱۴۳۹ھ ۲۰۱۸ء

ہندوستان کو دنیا بھر کے ملکوں کے درمیان تہذیب، نسل اور مذہب کے اعتبار سے جو تنوع حاصل ہے اور حاصل رہا ہے اس میں اس کو ایک انفرادیت حاصل ہے اس انفرادیت کی خصوصیت نے دنیا میں امتیازی حیثیت عطا کی جس سے یہاں کے باشندوں نے انسانی قیادت کے مختلف شعبوں میں اپنی کارکردگی سے اہم حصہ لیا، اور ملکی سطح پر یکجہتی کا بھی ثبوت دیا۔

ہندوستان کے مغربی کنارہ کے پڑوسی ممالک نے مشرق وسطیٰ کے علم و ثقافت کے جو اثرات یہاں کے ساحلی علاقوں پر ڈالے وہ کیرالہ اور گجرات کے ساحلی علاقوں میں دیکھے جاسکتے ہیں اور ہندوستان کے مغربی ساحلی مقامات میں اس سے جدا اثر ملتا ہے، ہندوستان کے مشرقی حصے تہذیب اور انداز زندگی میں الگ پہچان رکھتے ہیں، مسلمانوں کو تجارت و سیاحت کی غرض سے آنا ہوا تو وہ عموماً شرق اوسط سے آئے، اس لیے وہ اپنی سوغات لائے اور انہوں نے اس ملک کو جو دیا اس نے یہاں کی تہذیب و مذہب دونوں پر اثر ڈالا، اور یہ اثر صرف سادہ سا اور رواروی ک اثر نہیں رہا، بلکہ یہاں کی زبانوں کو متاثر کیا، مذہب کے دائرہ میں توحید کو کارفرما بتانے کا کام بھی انجام دیا، اسی کے ساتھ ساتھ مزید یہ اہم کام انجام دیا کہ قرآن مجید نے علم کو انسانی زندگی کے لیے جو اہم ضرورت بتایا،

اس نے بتدریج علم کی فضا بنادی ، اور جلد ہی علمی شخصیتیں اور علمی مراکز ملک کے مختلف حصوں میں قائم ہوئے اورانہوں نے علم کا چرچا بڑھادیا جس کی جھلکیاں ہم ہندوستان کے مغربی ساحل میں دیکھتے ہیں، اس میں گجرات کا بڑا حصہ رہاہے اور وہاں کی بعض شخصیتوں نے وہ علمی مقام حاصل کیا جس کے ذریعہ ان کا نام تاریخی اور زندہ جاوید بن گیا وہ تو نہیں رہے لیکن ان کے علمی کاموں کی چمک قائم ہے۔

گجرات کا علاقہ علمی ، ادبی اور دینی لحاظ سے نہ صرف یہ کہ زرخیز علاقہ ہے بلکہ مسلمانوں کی اس برصغیر میں آمد کا دروازہ بھی بنا، جیسا کہ ذکر کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں بلکہ عربوں کا اس برصغیر سے تعلق اسی سرزمین سے شروع ہوا اور مسلمانوں کی پہلی کھیپ یہیں کے ساحلوں پر پہونچی جس کی طرف قرون اولیٰ سے مسلمانوں کی توجہ رہی اور اسی سرزمین سے ہندوستان کا عربوں سے بلکہ حجاز مقدس سے تعلق کا نقطہ آغاز ہوا، یہاں ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے حدیث شریف کو موضوع بنایا اور علم حدیث کی اشاعت وترویج میں اپنی زندگیاں گزرادیں ،صوفیائے کرام ، دعاۃ ومبلغین ،فقہاء ومحدثین کی آمد ہوئی ، اوران کے ذریعہ اسلام اوراسلامی علوم کا تعارف اس ملک میں ہوا، اور حکمرانوں نے بھی اس ملک کواپنا میدان عمل بنایا اور سلاطین گجرات نے خصوصیت کے ساتھ بڑی علمی وادبی سرپرستی کی ،اہل قلب مشائخ وصوفیاء کی جدوجہد اوران کے انفاس قدسیہ سے گجرات میں ایمان کی باد بہاری چلی اوراس کے طفیل سے ایسے مواقع پیدا ہوئے کہ بڑی علمی ودینی شخصیتیں پیدا ہوئیں اورانہوں نے علمی ودینی سطح پر غیر معمولی خدمات انجام دیں۔

گجرات میں اس کا سلسلہ برابر جاری وساری ہے اس کی مایہ ناز شخصیتوں میں قصبہ کاپوردا کے مولانا عبداللہ کاپودرویؒ نے علم وادب کی لائن میں اپنے حسن ذوق اور کارگزار عمل کا اچھا ثبوت دیا اور علمی ودینی راہوں میں اپنی خصوصیات کا اچھا نمونہ پیش کر کے اس دنیا سے آخرت کی طرف منتقل ہوئے۔

مولانا عبداللہ کاپودروی نے مصادر علوم دینیہ کے ساتھ علم وادب کے قابل توجہ شعبوں سے بھی شروع سے ہی دلچسپی رکھی، اس خصوصی دلچسپی کے ذریعہ انہوں نے اسلامی تعلیمی لائنوں میں اپنی شرکت ومشغولیت کا ثبوت دیااور اس طرح اپنے علمی وادبی ذوق و عمل کو پروان چڑھایا، مولانا کو مطالعہ کا بڑااچھاذوق وشوق تھا، اس کا اثر مولانا کے ہر خطبہ اور تحریر میں صاف نظر آتا ہے، اسی ذوق وشوق کی آبیاری کے لیے کتب خانوں، تعلیمی اداروں اور ریسرچ سنٹروں کا سفر کیا، حالات حاضرہ کے گہرے مطالعہ نے امت اسلامیہ کی بدحالی اور دشمنان اسلام کی سازشوں سے پردہ اٹھانے پر مجبور کیا، مولانا کے خطبات کے مجموعہ کے مطالعہ سے ان باتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اسی طرح ان کی تصنیفات و تالیفات کا سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاف دل اور دل پسند اسلوب اور وسعت قلبی کے حامل تھے، مولانا کے خطبات علم ومعرفت، فکر ونظر اور اصلاح وتربیت پر مشتمل ہیں، ''صدائے دل'' کے عنوان سے چار جلدوں میں شائع ہوکر مقبول عام ہوچکے ہیں ان خطبات میں اسلوب کی سادگی، ادب کی چاشنی، علمی لطائف، سوز دروں، حالات کی نباضی علم دوستی اور ادب نوازی، کتب خانوں اور تعلیمی اداروں کی دلچسپ داستان، انتظام و انصرام کے کامیاب گر، عمر کے طویل تجربات کا نچوڑ، معاشرے کی خرابیوں کی نشاندہی اور ان کا علاج، حسن اخلاق کے میٹھے پھل، دعوت کی گہری بصیرت اور یورپ کی اخلاقی انارکی کے ساتھ ساتھ اس کے عروج کے اسباب وعوامل جیسے دسیوں کا ذکر جابجا ملے گا۔

ہندوستان میں آج سے سوا سو سال قبل جب وقت کی ضرورت اور حالات کے تقاضہ پر نظر رکھنے والے علمائے امت نے بیرونی وکافر تہذیب وفکر کو تعلیمی ذریعہ سے ملک پر چھاجانے کی کوشش کا اثر عام ہوتے دیکھااور تعلیمی ذریعہ سے مسلمانوں کی نئی نسلوں کو خطرہ میں جاتے دیکھا تو مہم چلائی جو ندوۃ العلماء کے نام سے چلی لیکن متعدد دشواریوں کی بناء پر اس کے اثرات شروع میں کمزور رہے، کیوں کہ جامع تعلیم کے نظریہ کو مشکل اور کم مفید بھی سمجھا گیا، لیکن پھر بھی ہر عصر میں ایسے افراد سامنے آتے رہے جنہوں نے اس نقطہ نظر کو

اختیار کیا، ہمارے ہر دور میں ایسے لوگوں میں مولانا عبداللہ کاپودروی کا نام نمایاں ملتا ہے، ان کا تعلق دیوبند اور ندوہ سے یکساں ملتا ہے، ان کی سرپرستی دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر کو حاصل رہی اس کے اثر سے فلاح دارین کا ندوہ سے خاصا قرب ہے۔

مولانا عبداللہ کاپودروی نے دیوبند میں تعلیم حاصل کیا اور ندوۃ العلماء سے بھی ربط و تعلق کو استوار رکھا، وہ اس کے منہج فکر و دعوت اور نظام تعلیم و تربیت کے بڑے قدرداں تھے، اکثر ملاقاتوں میں اس کا اظہار بھی کرتے تھے، انہوں نے مولانا علی میاں کے بھتیجہ محمد الحسنی سے شروع سے رابطہ بنالیا تھا، جس کا سلسلہ تاحال ان کے عزیزوں سے رہا اور وہاں کے متعدد پروگراموں میں شریک رہے، مجھ سے بھی اچھا ربط قائم تھا اور ملاقات پر ہم دونوں کو ایک دوسرے سے مل کر خوشی ہوتی تھی، ابھی قبل رمضان گجرات کے سفر میں ان کے یہاں جانے کا موقع ملا، وہ مرض کے باوجود ایسی بشاشت سے ملے جیسے کوئی مرض ہی نہ ہو۔

مولانا کافی عرصہ سے صاحب فراش تھے، لیکن اس کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلد ہم سے جدا ہو جائیں گے، ان سے تعلق کی بناء پر ایسا محسوس ہوا کہ مولانا بہت جلد چلے گئے، اللہ سے دعا ہے کہ اللہ ان کی خدمات جلیلہ کا شایان شان بدلہ عطا کرے، اور امت کو ان کا نعم البدل نصیب ہو۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

۱۳۰۹ھ ۱۸۹۲ء تا ۱۳۹۸ھ ۱۹۷۷ء

گزشتہ صدی عیسوی کا آغاز ہندوستان کے ان حالات میں ہوا کہ انگریزی اقتدار ہندوستان میں پوری طرح جما ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی انقلابی کوشش کی ناکامی پر انگریزی اقتدار نے ملک کے عوام پر ایسی سختی کی اور ظلم کی شکلیں استعمال کیں جن سے انقلابی کوشش کا خیال اور ہمت ختم ہوجائے اور انگریزی اقتدار کی بقا مضبوط رہے، اس مقصد کے لیے اس میں دوطرفہ طریقہ اختیار کیا، ایک تو وہ جن میں باہری اقتدار کے خلاف کوشش کرنے کی صلاحیت ہو ان کو بے ہمت بنادیا جائے، اور اس میں مسلمانوں کو زیادہ پیش نظر رکھا گیا اور دوسرے یہ کہ تعلیم کے ذریعے سے ایسی ذہن سازی کی جائے کہ انگریزوں کو زیادہ مثالی اور بہتر صلاحیت کا حامل سمجھا جائے، لیکن بیرونی اقتدار کے نقصانات کو محسوس کرنے والوں نے اس بات کے خطرناک پہلوؤں کو محسوس کیا اور قابل عمل کوششیں اختیار کیں، اور اس میں ہندو اور مسلم دونوں نے اتحاد کا ثبوت دیا، اور مسلمانوں نے ترکی خلافت کے ختم ہونے پر پورے عالم اسلام کی اہمیت کو جو دھچکا پہنچا تھا اس کو محسوس کرتے ہوئے خلافت کے کام پر تحریک شروع کی اور اس کا اصلاً مقصد ہندوستان سے بیرونی طاقت کو ہٹانے کی کوشش کا جذبہ تھا، اور بیرونی طاقت کو ہندوستان سے ہٹانے کی ضرورت کو ہندو دانشوروں نے بھی محسوس کیا اور مسلمانوں کے ساتھ اس کوشش میں شریک ہوئے اور دونوں نے مل کر عوام کی ذہن سازی کو موضوع بنایا اور ذرائع ابلاغ اور پُر امن

سیاسی کوششوں کو اختیار کیا، ذہن سازی کے کام میں مسلمانوں کا وہ علمی حلقہ بھی شریک ہوا جس نے اپنے کو صرف علمی دائرہ میں رکھنا مناسب سمجھا جس میں علامہ شبلی نعمانی، اکبرالٰہ آبادی، الطاف حسین حالی خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔

انگریزوں کے جاری کردہ نصاب تعلیم اور مستشرقین کے لٹریچر نے بہت سے مسلم نوجوانوں کو ایسا متاثر کیا تھا کہ ان میں مسلمان ہوتے ہوئے الحادی فکر کا غلبہ تھا، ان میں ایک نمایاں نام مولانا عبدالماجد دریابادی کا بھی آتا ہے، لیکن ان کو علامہ شبلی اور اکبرالٰہ آبادی سے ربط کا موقع مل گیا اور ان کے اثر سے یہ بہ تدریج ان کے ہمنوا بن گئے اور پھر اس لائن میں وہ بڑھتے چلے گئے، پھر انہوں نے علم وادب کے دائرہ ہی میں محدود رہتے ہوئے یہ کام انجام دیا اور علامہ شبلی نعمانی، لسان العصر اکبرالٰہ آبادی کے انتقال کر جانے کے بعد بھی وہ اس میدان میں کام کرتے رہے، اس میں ان کو علامہ شبلی کے شاگردوں اور ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ اہم افراد کی رفاقت حاصل رہی، مولانا دریابادی نے اس لائن پر ایسی فکرمندی اور محنت کا ثبوت دیا کہ جیسے دل کی گہرائی میں یہ مقصد اتر گیا تھا، اور اس کام کے لیے انہوں نے اپنے کو وقف کر دیا، عصری علوم میں ان کو مہارت شروع ہی میں حاصل ہوگئی تھی اس لیے وہ نصرت حق اور دینی اہمیت کے کام میں اپنی اس صلاحیت کو اختیار کرتے تھے، جس سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں پر اچھا اثر پڑتا تھا اور مولانا دریابادی نے ادب کی لائن میں بھی صلاحیت پیدا کی تھی، اس لیے ادب کے میدان میں الحادزدہ لوگوں کے غلبہ کو وہ بخوبی چیلنج کرتے تھے اور ان کے اثر کو کم کرنے میں ان کو کامیابی حاصل ہوتی تھی، انہوں نے ہفتہ وار اخبار بھی نکالا تھا اس کا نام سچ تھا پھر وہ صدق کے نام سے برابر نکلتا رہا، اس میں مولانا الحادزدہ شخصیتوں کی غلط کاریوں کو موضوع بناتے، اور اس کو اپنی پُراثر تحریروں سے بے اثر بناتے تھے، کہیں کہیں خوبصورت انداز کا طنز اختیار کرتے اور کہیں کہیں اپنے فقروں سے ان کی اہمیت کو گراتے تھے۔ ‍ ‌ِی ادبی خصوصیات کے ساتھ ان کے مزاج میں دینی عنصر بڑھتا گیا اور انہوں نے قرآن .. ‍ ‍ترجمہ وتفسیر کو اپنا اہم موضوع بنا لیا اسی کے ساتھ ہندوستان کی جو تصوف کی

حامل اہم شخصیتیں تھیں ان سے بھی استفادہ کا رابطہ قائم کیا اس سلسلہ میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے ان کا ربط قائم ہوا، اور حکیم الامت تھانوی سے باقاعدہ اصلاحی واسترشادی تعلق قائم ہوا، چنانچہ اپنے تفسیری کام میں احتیاطی پہلو سے حضرت تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کو اپنے زیر نظر رکھا تاکہ ان کے قلم سے کوئی ایسی بات نہ نکلے جو اجماع امت یا مستند مفسرین کی رائے سے ٹکراتی ہو، چونکہ مولانا کو انگریزی زبان پر بھی اچھا عبور حاصل تھا لہٰذا انہوں نے تفسیر انگریزی میں بھی تیار کی اور اردو میں بھی تیار کی اور دونوں زبانوں میں مستند تفسیر کا کام انہوں نے انجام دیا، ان کی تفسیر کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ توریت اور توریت کے تعلق سے لکھی گئی معلومات کا مطالعہ اس ضرورت کے لئے بھی کیا کہ توریت اور قرآن مجید میں جو مطابقت ہے اس کو دکھاتے ہوئے قرآن مجید کی مقدس خصوصیات کی تصدیق اور اس کا ثبوت سامنے آسکے، اور انگریزی زبان میں وہ لٹریچر جو بنی اسرائیل کے تعلق رکھنے والے نبوی واقعات یا دینی واقعات جن میں قرآن مجید کے واقعات کی مطابقت ہے، ان کے حوالے پیش کیے اس طرح جدید تعلیم یافتہ ذہنوں کے لئے اسلام کی حقانیت کا بڑا سامان انہوں نے مہیا کر دیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی بتدریج عصر جدید میں اسلام کی حقانیت کو سمجھنے کا تقاضہ رکھنے والوں کے لیے ایک موقر سند و مرجع کی حیثیت اختیار کر گئے تھے اور اس طریقہ سے انہوں نے اسلامی ذہن سازی کا بیش بہا کام انجام دیا، انہوں نے ایک سادہ طرز کی زندگی کے ساتھ وقت کی بہت پابندی اور حد استطاعت تک علمی مشغولیت آخر تک قائم رکھی، اور اہل علم کے لیے بہت اچھا مواد اکٹھا کیا، ان کو مولانا شبلی اور ان کے شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر رفقاء جو ندوہ سے تعلق رکھتے تھے ان سے تعلق کی بنا پر ان کو ندوہ سے بہت تعلق ہو گیا تھا اور وہ اپنے کو ایک طرح سے ندوی ہی سمجھتے تھے، اور ان کو ندوہ کی طرف سے اعزازی سند بھی دی گئی تھی اور وہ اپنی فکر کو ندوی فکر کے مطابق سمجھتے تھے، ان کے انتقال سے اس فکر کے بڑے حامل مسلمان سے محروم ہو گئے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور قبولیت عطا فرمائے۔

میرے خال محترم ڈاکٹر سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بحیثیت معاصر ان کو جو ربط تھا اور دوسرے خال محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے چھوٹے ہونے کی بنا پر ان سے شاگردانہ قسم کا معاملہ رکھتے تھے اور اپنی علمی کوششوں میں جہاں جدید علوم کے تعلق کا معاملہ ہوتا تو اس میں مراجعت بھی کرتے تھے، اس تعلق کی بنا پر مجھے بھی کسی حد تک استفادہ کا موقع ملا، خاص طور سے میری کتاب جغرافیہ ''جزيرة العرب'' میں ان کے بعض مشورے شامل ہوئے، انہوں نے اپنی تفسیر (اردو، انگریزی) ہماری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کو اشاعت کے لیے اس کے پورے حق کے ساتھ دی، مجلس سے ذمہ دارانہ تعلق ہونے کی بنا پر اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ ونظامت کے وہ مؤقر رکن تھے اور ان کی صدارت میں اس کی نشستیں ہوتی تھیں، ان سے استفادہ کے مواقع ملتے تھے، آج ان کے نہ رہنے سے ہم سب کو بڑا خلا محسوس ہوتا ہے، ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کو سنبھالنے اور آگے بڑھانے والے ان کے برادرزادگان میں حکیم عبدالقوی دریابادی، حبیب احمد ندوی صاحب مرحوم، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی اور عبدالعلیم قدوائی صاحب ہیں اور یہ چاروں اسی ترتیب سے ان کے داماد بھی ہیں، اور ان کے نواسوں نے بھی تحریر وتحقیق کی صلاحیت اپنے نانا سے قدرتی طور پر پائی، بارك الله فيهم.

عشرت علی صدیقی مرحوم

۱۳۳۶ھ ۱۹۱۸ء تا ۱۴۳۵ھ ۲۰۱۴ء

لکھنؤ میں آزادیٔ ہند سے پہلے ہی صحافتی اور ثقافتی میدان میں عشرت علی صدیقی کی شخصیت جانی پہچانی شخصیت بن چکی تھی، ان کا تعلق کانگریس سے نظریاتی طور پر تھا جو انہوں نے اپنی زندگی میں آخر تک قائم رکھا، اور جب ۱۹۴۵ء میں کانگریس کا ترجمان ''قومی آواز'' پنڈت جواہر لال نہرو اور رفیع احمد قدوائی مرحوم کی کوششوں سے لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا تو وہ اس کے اسٹاف میں وقیع انداز میں شامل ہوئے، اس وقت حیات اللہ انصاری مرحوم اس کے چیف ایڈیٹر اور عشرت علی صدیقی مرحوم اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اور پھر بتدریج اس کے چیف ایڈیٹر منتخب ہوئے، انہوں نے ''قومی آواز'' کو آزادانہ اور بے قید صحافت کے انداز سے الگ رکھا، اور اس کو اصولی اور نظریاتی بنیاد پر ایک معیاری صحافت کا انداز دینے کی کوشش کی، اس وقت لکھنؤ سے اردو روزنامے بہت ہی کم نکلتے تھے، ''قومی آواز'' نے اپنی جو سطح بنائی، اس سے وہ دوسرے اخبارات سے ممتاز رہا، اس میں عشرت علی صدیقی مرحوم کا بڑا دخل رہا۔

روزنامہ ''قومی آوز'' سے پہلے بطور صحافی انہوں نے جدوجہد آزادی میں حصہ لیتے ہوئے قید وبند کی صعوبتیں اٹھائیں تھیں، اور لکھنؤ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے ہفتہ وار اخبار ''ہندوستان'' سے وابستہ تھے، اور حیات اللہ انصاری مرحوم کے ساتھ کام کرتے تھے، اس وقت اخبار اور پریس کو انگریز حکومت نے ضبط کرلیا تھا، اور اس سے وابستہ افراد کو

لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا، اس وقت عشرت صاحب مرحوم انگریزوں کے تسلط سے آزاد ریاست حیدرآباد چلے گئے اور وہاں قاضی عبدالغفار کے اردو روزنامہ "پیام" سے وابستہ ہو گئے، جن کے صحافتی تجربات سے انہوں نے بڑا فائدہ اٹھایا، پھر "قومی آواز" کی اشاعت کے وقت لکھنؤ واپس آئے، اور ریٹائر ہونے تک اس سے وابستہ رہے، وہ ایک جرأت مند، بے باک صحافی تھے، اور خبروں کی اشاعت اور الفاظ کے استعمال میں توازن کا بڑا خیال رکھتے تھے، ان کی جرأت کا اس بات سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ملک میں ایمرجنسی میں کانگریس کی پالیسیوں کے خلاف باوجود کانگریسی اخبار کے ایڈیٹر ہونے کے مفاد عامہ کو ترجیح دیتے رہے، آزاد ہندوستان کی صحافت میں شاید وہ پہلے صحافی تھے جنہوں نے ایمرجنسی میں بھی پریس پر پابندی قبول نہیں کی، بلکہ اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے سادہ اخبار چھاپا، ایمرجنسی میں ضلع مجسٹریٹ نے کسی خبر کی اشاعت کے لیے منع کیا جسے انہوں نے ماننے سے انکار کیا، اس پر ضلع مجسٹریٹ نے ڈائریکٹر انفارمیشن کو "قومی آواز" کے دفتر بھیج دیا کہ وہ متعلقہ خبر کو شائع ہونے سے روکیں، جب ڈائریکٹر انفارمیشن زیادہ مصر ہوا اور دھمکی دی کہ اخبار نہیں چھپنے دیں گے، تو عشرت علی صدیقی نے کہا اخبار تو شائع ہو کر رہے گا، اور انہوں نے اخبار شائع کیا اور متعلقہ خبر کو ہٹا کر وہ صفحہ سادہ شائع کر دیا۔

ان کی صحافتی وقومی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند نے ۱۹۸۰ء میں انہیں "پدم شری" کے اعزاز سے نوازا اور پھر انہیں مزید اعزاز دیتے ہوئے دوسرے پریس کمیشن کا رکن بھی نامزد کیا گیا، اس کے علاوہ وہ یوپی ورکنگ جرنلسٹ یونین اور یوپی پریس کلب کے صدر اور انڈین فیڈریشن آف ورکنگ جرنلسٹ (AFWJ) کے قومی کونسلر بھی رہے تھے۔

عشرت صاحب مرحوم اخبار کے ذریعہ عوام میں مشہور اور پڑھے لکھے حلقہ میں مقبول ومعروف صحافی تھے، اور ذہنی لحاظ سے ممتاز طبقہ میں عشرت علی صدیقی مرحوم کا کام بھی نمایاں تھا، ان کو ندوۃ العلماء سے اور خاص طور پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ایک ربط ومناسبت ہو گئی تھی، وہ اہتمام سے ندوہ آتے، اور جب حضرت مولاناؒ ندوہ میں تشریف

فرماہوتے تو بلاناغہ آتے، مولاناؒ کو بھی ان کا انتظار رہتا تھا، وہ مولاناؒ سے تعلق کا برابر اظہار کرتے، اور یہ تعلق و مناسبت جو دونوں میں پیدا ہو گئی تھی وہ آخر تک قائم رہی۔

وہ اپنے نظریاتی اور صحافتی کاموں میں بااصول طریقہ پر کاربند تھے، اور ملک کے حالات میں نشیب و فراز کو سنجیدہ، اور صحت مندانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے، اور اسی کے مطابق اظہار رائے کرتے تھے، وہ گاندھی جی سے ملے تھے، اور ان کے قومی نظریہ سے اتفاق رکھتے تھے اور اس کی بنیاد پر ان کو کانگریس سے تعلق تھا، انہوں نے اسی نقطۂ نظر کے مطابق ملک کی ترقی اور بہتری کے لیے اپنی صلاحیت کو استعمال کیا، جو زیادہ تر صحافتی اور فکری میدان میں رہا۔

''قومی آواز'' نے صحت زبان کا اتنا خیال رکھا کہ جامعات کے اساتذہ طلباء سے کہا کرتے تھے کہ زبان سیکھنے کے لیے ''قومی آواز'' پڑھا کرو، یہ اخبار اہل دانش اور علمی طبقہ میں یکساں مقبول تھا کہ اس نے صحافت کا مثبت اور تعمیری رخ پیش کیا، اس جذباتیت سے نکالا جس کی تجارت اس وقت کے بعض صحافی کر رہے تھے، عشرت علی صدیقی جس ''قومی آواز'' سے وابستہ تھے وہ بنیادی طور پر کانگریس کے نظریات و افکار کا ترجمان تھا، مگر اخبار میں دوسری سیاسی جماعتوں کے بیانات اور خبریں بھی چھپتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ مخالف حلقے میں بھی اخبار بہت مقبول تھا، ''قومی آواز'' کا اجرا مسلم لیگ کے ترجمان چودھری خلیق الزماں کے اخبار روزنامہ ''تنویر'' کے اثر کے ازالہ کے لیے کیا گیا تھا، مگر اس کا بنیادی مقصد دو قومی نظریہ کی مخالفت اور ہندو مسلم اتحاد تھا، اور اپنے اس نظریہ کی اشاعت اور فروغ میں یہ اخبار کامیاب رہا۔

عشرت علی صدیقی گاندھیائی اصولوں پر ہمیشہ گامزن رہے کہ ان کا مہاتما گاندھی سے گہرا جذباتی لگاؤ تھا، انہوں نے ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی کے لیے اردو اخبارات کے رجحانات پر ہفتہ وار رپورٹ لکھنے کا بھی کام کیا، ایک بڑے اخبار سے وابستگی کے باوجود انہوں نے اسے اپنی شہرت یا اپنی شخصیت کو نکھارنے کے لیے استعمال نہیں کیا، یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر تقریبات میں شرکت سے گریز کرتے تھے اور زیادہ ارتکاز ان خبروں پر ہوتا تھا جن کا تعلق عوامی فلاح و بہبود یا

مسائل سے ہوتا تھا، انہیں مادی منفعت سے زیادہ ملکی وملی، قومی مفادات عزیز تھے۔

عمر کے آخری حصہ میں صحت کی کمزوری کی وجہ سے وہ اس سطح کا کام نہیں کر سکتے تھے، جس سطح پر وہ اپنی صحت مندانہ زندگی میں کرتے تھے، لیکن ملاقاتوں اور گفتگو میں ان کے خیالات اور ملک کے لیے فکرمندی کا پورا اندازہ ہوتا تھا۔

ان کی ان خصوصیات اور ان کو جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، ندوۃ العلماء اور ملی و دینی اداروں سے تعلق تھا، اس سے مجھے ان سے تعلق خاطر محسوس ہوتا تھا اور قدرتی طور پر حضرت مولاناؒ کے انتقال کے بعد انہوں نے ہم چھوٹوں کے ساتھ اپنی بزرگانہ شفقت قائم رکھی جس کا وہ ندوہ آکر بھی اظہار کرتے اور رمضان المبارک میں رائے بریلی آکر اس تعلق کو تازہ کرتے، جہاں وہ اپنے مشہور معالج ڈاکٹر نظر احمد صاحب کے ساتھ آتے، اپنی وفات سے چند دن پہلے ہی وہ ندوہ تشریف لائے اور ملاقات کا شرف بخشا، عمر کے ضعف کے علاوہ کہیں سے یہ آثار نہیں لگ رہے تھے کہ وہ اتنی جلدی جدا ہو جائیں گے کہ ایک دن معلوم ہوا کہ وہ کسی خاص بیماری میں نہیں بلکہ گر جانے کی وجہ سے ایسی چوٹ سے دوچار ہوئے جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور دنیا سے رخصت ہو گئے، ان کے انتقال کو شہر کے سنجیدہ اور تعلیم یافتہ طبقہ نے بہت محسوس کیا، اور ان کے جنازہ میں شہر کا ممتاز طبقہ اور اچھی تعداد میں ان کو رخصت کرنے کے لیے ندوہ میں نماز جنازہ میں شریک رہا اور پھر صدر قبرستان جا کر سپرد خاک کیا۔

وہ اصلاً سندیلہ ضلع ہردوئی کے رہنے والے تھے، جہاں وہ ۱۰/اکتوبر ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے تھے، لیکن ان کی نشو ونما لکھنؤ میں ہوئی جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی چنانچہ پہچان لکھنؤ سے ہوئی اور لکھنؤ کی ہی مٹی نے ان کو اپنی آغوش میں لیا، عمر کی ۹۵ منزلیں طے کرکے دنیائے فانی سے ۲/جنوری ۲۰۱۴ء/ ۲۹/صفر ۱۴۳۵ھ کو جدا ہوئے، اور دار بقا کو کوچ کیا، پسماندگان میں ایک صاحبزادہ اور ایک صاحبزادی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے، اور اس تعلق کو جو انہوں نے دین سے اور دین والوں سے قائم رکھا تھا، ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

حضرت مولانا عمار احمد الہ آبادی

۱۳۶۰ھ ۱۹۴۱ء تا ۱۴۴۰ھ ۲۰۱۸ء

الہ آباد میں گزشتہ قریبی مدت میں کئی شخصیتوں نے جن سے دینی واسلامی لحاظ سے استفادہ وافادہ کا اچھا سلسلہ قائم تھا، اس دنیائے فانی سے دنیائے باقی کی طرف انتقال کیا، اور دینی وعلمی استفادہ کے میدان میں ایک خلا چھوڑ گئے، وہاں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بڑے خلیفہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوریؒ کا فیض پھیل رہا تھا جو اپنے وطن فتح پور تال نرجا اعظم گڑھ سے الہ آباد آئے تھے، ان کی وفات سے جو جگہ خالی ہوئی تھی اس کو ان کے مریدین وخلفاء نے اچھے انداز میں پورا کیا، ان میں مولانا قاری محمد مبین الہ آبادی، مولانا قمر الزماں الہ آبادی اور مولانا عمار احمد صاحب نمایاں ہوئے، جو ان کے شاگرد بھی تھے اور مرید بھی، اور شاہ صاحب کے خلفاء کے علاوہ دوسرے سلسلے کے بھی الہ آباد میں بزرگ تھے، جن میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھیؒ کی شخصیت زیادہ ممتاز اور مرجع خلائق بنی، جو اپنے وطن پھولپور، پرتاپ گڑھ، شہر پرتاپ گڑھ اور الہ آباد میں قیام سے لوگوں کو فائدہ پہونچا رہے تھے۔

حضرت شاہ وصی اللہ الہ آبادیؒ کی وفات کے بعد الہ آباد میں ان کی طرف زیادہ رجوع ہوا، وہ سراپا محبت والی شخصیت کے طور پر معروف تھے، حضرت شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادی کے خاص لوگوں میں مولانا محمد قمر الزماں صاحب الہ آبادی اور مولانا عمار احمد صاحب الہ آبادی ان سے منسلک ہوئے، اور ان دونوں کو ہی ان سے اجازت وخلافت

حاصل ہوئی، مولانا عمار احمد صاحب کا تعلق اعظم گڑھ کے ہی ایک علاقہ گھوسی سے تھا، اور جس کے افراد حضرت سیدنا ابوبکر صدیق کی طرف اپنا خاندانی انتساب کرتے تھے، ان کے خاندان کے کئی افراد علمی حیثیت سے بھی ممتاز ہوئے جن میں ان کے بھتیجہ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جنہوں نے ان کی تربیت میں رہ کر ترقی کی، مولانا عمار احمد صاحب نے حضرت شاہ وصی اللہ صاحب سے تعلیم وتربیت حاصل کی تھی، اور ان کی طرف سے حدیث میں روایت کرتے اور اجازت حدیث چاہنے والوں کو ان کی طرف سے علامہ انور شاہ کشمیری کی سند دیا کرتے تھے۔

شاہ وصی اللہ صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اہل تعلق کو اپنے پاس رکھ کر تعلیم دیتے تھے، اور ابتدائی تعلیم سے منتہی تعلیم کی کتابوں کا درس دیتے، مولانا عمار احمد صاحب نے بعد میں تعلیم وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، اور مدرسہ بیت المعارف میں استاد ہوئے، جہاں وہ مولانا قمر الزماں صاحب الہ آبادی کے ساتھ اس مدرسہ کی ترقی میں حصہ لے رہے تھے، پھر انہوں نے مستقل ایک بڑے مدرسہ کی داغ بیل ڈالی، اور جو زمین ان کے پاس تھی اس کو اس کے لیے وقف کیا، یہ تعلیمی ادارہ مدرسہ افضل المعارف کے نام سے معروف ہے، اور ہمیں بھی وہاں جانے کا موقع ملا ہے، اس کے سالانہ جلسوں میں اہم شخصیات شریک ہوتی رہی ہیں، خاص طور پر مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے ناظم مولانا ھشیم عثمانی صاحب بھی اس میں شرکت کے لیے تشریف لانے کا معمول رکھتے تھے، اب مولانا کی وفات کے بعد ان کے فاضل صاحبزادے مولانا افضال احمد قاسمی صاحب اسے دیکھ رہے ہیں۔

مولانا ادبی وشعری ذوق بھی رکھتے تھے، ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، جو انہوں نے اپریل ۱۹۹۸ء میں تھانہ بھون میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے متعلق سیمینار کے موقع پر سدائے بے نشاں کے عنوان سے کہے تھے۔

زمین اشرفی پر آج یہ تذکار روحانی　　فلک بھی رشک کرتا ہے یہ وہ مجلس ہے عرفانی
بہ فیض مولوی معنوی تھانوی ہر سو　　ہوئی انوار کی بارش بنا عالم یہ نورانی

مجددین کے تھے اس صدی میں حضرت اشرف   محقق اور مدقق حامل اسرار قرآنی
حکیم امت و نباض فطرت غوث دوراں تھے   مسیحائے زمانہ ماہر امراض نفسانی

یہ ایک قصیدے کے نمونہ کے طور پر اشعار تھے جو پیش کئے گئے۔

ادھر ہفتہ دو ہفتہ سے یہ خبر برابر مل رہی تھی کہ مولانا عمار صاحب کی طبیعت بہت ناساز چل رہی ہے، خیال ہوتا تھا کہ الہ آباد کا سفر ان کی عیادت کے لیے کرنا چاہئے، اتنے میں معلوم ہوا کہ وہ قومہ میں ہیں اور پی جی آئی لکھنولائے گئے ہیں، پھر جمعرات ۱۸/ اکتوبر کی صبح کوان کے ایک متعلق نے آکر خبر دی کہ آج رات وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، اور الہ آباد ان کا جنازہ لے جایا جارہا ہے جہاں تدفین عمل میں آئے گی، افسوس کہ ہم اپنی صحت کی کمزوری کی وجہ سے تدفین میں شرکت کے لیے سفر سے عاجز رہے، اور یہیں رہ کر دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کیا، اللہ تعالیٰ ان کے مراتب بلند فرمائے، اور ان کی خدمات و حسنات کو قبول فرمائے۔

الحاج غلام محمد بھائی پٹنی مرحوم

۱۳۴۶ھ ۱۹۲۷ء تا ۱۴۳۵ھ ۲۰۱۳ء

ممبئی شہر کو بین الاقوامی دنیا میں امتیازی حیثیت ہونے کی بنا پر اس شہر میں مختلف صوبہ کے لوگوں کی آمد ورفت اور موجودگی ہوتی رہی ہے، خاص طور پر صوبہ گجرات کے لوگوں کی جو اس سے متصل ہونے کی بنا پر خاصی نمائندگی ہے، گجرات کے لوگوں میں تاجرانہ خصوصیات دوسرے صوبوں کے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ پائی جاتی ہیں، اس لئے وہاں کے لوگوں کی ممبئی شہر کے کاموں اور مناصب میں موجودگی نمایاں ملتی ہے، اور اس کی بنا پر ممبئی کے بڑے کاروباری اداروں میں گجرات کے لوگ نمایاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے مزاج میں عام طور پر عملی خصوصیت پائی جاتی ہے، ان میں مسلمان حضرات میں دین وملت کے معاملات میں دلچسپی نظر آتی ہے، ان کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بھی خاصی تعداد میں وہاں گئے اور وہاں ان کو کام ملا، وہاں کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ممبئی جانے والوں میں علمی ودینی شخصیتیں بھی اچھے مقصد سے ممبئی گئیں، اور وہاں اثر انداز ہوئیں، ان کے اثر سے وہاں نمایاں طور پر دینی تعلق پیدا ہونے والی خصوصیات بھی پیدا ہوئیں، دین وشریعت کے حامل علماء جو وہاں گئے، ان کے اثر سے وہاں کے لوگوں کی زندگیوں میں اصلاح کی صورت بھی ظاہر ہوئی، اور دنیاوی وجاہت رکھنے والے متعدد حضرات دینی حیثیت سے بھی ممتاز ہوئے، انہی میں ممبئی آندھرا ٹرانسپورٹ کے مالک الحاج غلام محمد بھائی پٹنی صاحب نے جو وطن کے لحاظ سے گجراتی تھے، انہوں نے ممبئی کو اپنا مستقر بنایا، ان کو بزرگوں اور علماء

سے تعلق تھا اور خاص طور پر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند سے گہرا تعلق رہا، اور ان سے بیعت واصلاح کا تعلق قائم کیا، دیگر علماء میں ان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے تعلق ہوا اور وہ تا حیات قائم رہا، اور حضرت مولانا کو بھی ان سے مناسبت ہوئی، حضرت مولانا کو کبھی ممبئی جانے کا اتفاق ہوتا تو مولانا صوفی عبدالرحمٰن کے قیام گاہ پر پھر محمد بھائی کی قیام گاہ پر قیام کرتے۔ اور یہ تعلق برابر بڑھتا گیا یہاں تک کہ حضرت مولانا اپنے بعض تصنیفی کاموں میں یکسوئی کے لئے ان کے مستقر میں قیام فرماتے اور یہ قیام موسم کے لحاظ سے سال میں بعض مرتبہ ہفتہ ہفتہ کا ہوتا، اس طرح مولانا کی کئی کتابوں کی تصنیف میں وہاں کے قیام کا خاصا حصہ رہا، کتابوں کے مقدموں میں ان کی رہائش گاہ ''سہاگ پیلس'' مدن پورہ کا ذکر ہے۔

غلام محمد بھائی گجرات کے قصبہ ویراول میں ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے اور محنت ومشقت سے زندگی گزاری، پھر اللہ نے کاروبار میں برکت دی اور مہاراشٹر وآندھرا میں آپ کے ٹرانسپورٹ کو بڑا اعتبار حاصل ہوا۔ ممبئی آندھرا ٹرانسپورٹ کمپنی (ممبئی) کے مالک تھے جس کے آفس ملک کے تقریباً تمام بڑے شہروں میں قائم ہیں، مرحوم کا ملک کے بڑے تاجروں میں شمار تھا، دینی اداروں کی مدد اور بزرگوں اور اہل دین کا بڑا احترام واکرام کرتے تھے۔

ممبئی میں ان کا گھر علماء کی قیام گاہ تھا، مرحوم اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ جب بھی کوئی بزرگ ممبئی آئیں، تو ان ہی کے مکان پر قیام کرے، چنانچہ حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، حضرت مولانا عبدالحلیم جونپوریؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، قاری صدیق احمد باندویؒ اور حضرت مولانا شاہ ابرارالحق حقیؒ جب بھی ممبئی تشریف لے جاتے محمد بھائی ہی کے مکان پر قیام فرماتے، مرحوم ان سب کی بڑی قدردانی کرتے تھے، مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی سے خصوصی تعلق تھا، قیام ممبئی کے دوران حضرت مولانا کو ہر طرح کا آرام پہنچاتے، مولانا کو بھی ان سے بڑی محبت تھی، مرحوم بڑے مخیّر تھے، ممبئی اور بنگلور میں ندوہ کے لیے مالی وسائل کی فراہمی میں کلیدی کردار ادا کیا، مرحوم متعدد تعلیمی

اور ملی اداروں اور تنظیموں کی انتظامیہ کے رکن تھے، ندوہ کے انتظامی امور میں مرحوم کی انتظامی صلاحیت سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔

مرحوم اپنی دینی اور ملی خدمات کی وجہ سے یاد کیے جاتے رہیں گے، بڑے کشادہ قلب، ملنسار، علم اور علماء دین کے قدرداں، صاحب خیر اور عمدہ اخلاق کے حامل تھے، وہ قدیم وجدید دونوں مکتبہ فکر سے واقف تھے اسی لیے ان کی ممتاز صفت جامعیت تھی، ان کی ایک اور ممتاز صفت ہر حال میں خوشی کا اظہار اور اللہ کی خوشنودی کا حصول تھی، سب سے خندہ پیشانی سے ملتے، ادھر کئی برسوں سے بیمار چل رہے تھے، چلنے پھرنے سے معذور تھے، اخیر عمر میں بیماری اتنی بڑھی کہ علاج مشکل ہو گیا اور علاج نہ ہونے کی صورت میں قلب کے متاثر ہونے کا خطرہ تھا، چنانچہ ڈاکٹروں کے مشورہ سے بایاں پیر کاٹ دیا گیا، اس حال میں بھی شاکر وراضی تھے، رات میں زبان پر اللہ اکبر، اللہ اکبر، الحمد للہ، الحمد للہ کی تسبیح جاری رہتی تھی یہ خود میرا مشاہدہ ہے۔

وہ مولانا علی میاں کے دیگر متعلقین کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے اور یہ ہدایت تھی کہ جب بھی ممبئی، اورنگ آباد، حیدرآباد اور پونہ کا سفر ہو تو ان ہی کے مکان میں قیام ہو، مرحوم کے جانشین بھی اسی راستہ پر گامزن ہیں اور علماء دین کا احترام واکرام کرتے ہیں۔

حضرت مولانا کے ممبئی کے قیام میں ان کے خاص اہل تعلق جو ممبئی یا اس کے اطراف میں ہوتے ملاقات کے لئے آنا چاہتے اور اس طرح ایک اچھا مجموعہ بن جاتا، ناگپور سے مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب، اورنگ آباد سے ڈاکٹر سید قمرالدین صاحب، پونہ سے انیس چشتی صاحب وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بمبئی کے لوگوں میں بھائی اسماعیل منصوری صاحب اور محمد بھائی کے دوسرے احباب ان کے یہاں اس موقع پر جمع ہو جاتے اور ان کی عمارت میں رہنے والے حضرات کے علاوہ صوفی عبدالرحمٰن صاحب، حاجی عبدالکریم صاحب، ڈاکٹر داؤد صاحب وغیرہ بھی آتے، اور اچھی مجلسیں ہوتیں۔ محمد بھائی مرحوم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے علاوہ دوسرے بزرگوں کو بھی اپنا مہمان بناتے،

اور بالائی منزل ان کے لئے مخصوص کر دیتے، مولانا کے علاوہ دیگر بزرگوں کو بھی ممبئی آمد پر اسی جگہ قیام کراتے، مثلاً ان میں شاہ عبدالحلیم صاحب جونپوری، حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب کا م نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، جنھوں نے اپنی علالت کے زمانہ میں خاصا وقت گزارا، اوراس کے ساتھ ان کی اصلاحی مجلسوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے محمد بھائی کو جو تعلق خاطر تھا وہ تعلق ان سے نسبت رکھنے والے اداروں اور افراد وشخصیات سے بھی متعدی ہوگیا تھا اور ندوۃ العلماء سے ان کا تعلق اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ اس کے تعلق سے جو پروگرام ہوتے وہ اس میں تقویت کا ذریعہ بنتے، اور کوئی پروگرام ممبئی کے علاوہ ان شہروں میں ہوتا جہاں ان کے خاندان کے افراد کا قیام ہوتا تو وہاں پہنچ کر وہ حضرت مولانا کو اپنی میزبانی میں لیتے اور ان پروگراموں کو تقویت پہنچاتے، چنانچہ انھوں نے حیدرآباد، اورنگ آباد، پونا وغیرہ کے رابطہ ادب اسلامی کے سمیناروں کو وہاں اپنے قیام سے تقویت پہنچائی، اورنگ آباد میں کئی سیمینار ان کی سرپرستی ہی میں ہوئے اور وہاں وہ جامعہ کاشف العلوم کی سرپرستی کرتے تھے جو ندوۃ العلماء سے متعلق ادارہ ہے، اوراس کے جلسوں میں شرکت کا اہتمام کرتے تھے، اوراپنے مفید مشوروں اور تجربات سے فائدہ پہنچاتے تھے، ان کے بعد ان کے صاحبزادگان میں بھائی ابوالحسن پٹنی صاحب کو ان کی جگہ نمائندگی دی گئی ہے، ان میں بھی ان کے والد کی صفات وخصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اپنا مستقر حیدرآباد بنایا ہے۔

محمد بھائی دنیاوی لحاظ سے اہم مقام پر ہونے کے ساتھ ساتھ دینی لحاظ سے بھی بلند کردار کے حامل تھے اوراپنے دینی معمولات، اذکار واوراد، تلاوت اور تہجد نوافل وغیرہ کے بڑے پابند اور صابر وشاکر انسان تھے، ان کی یہ صفت خاص طور پر اس وقت ظاہر ہوئی جب وہ صاحب فراش ہوگئے تھے، لیکن تسلیم ورضا کے پیکر نظر آتے تھے اور کبھی تکلیفوں پر شکوہ کرتے نظر نہ آئے، اس کے ساتھ ان میں اخلاص عمل کے ساتھ خیر خواہانہ، ہمدردانہ مزاج اور محبت واپنائیت کا انداز پایا جاتا تھا جس کا مجھے بھی بارہا تجربہ ہوا، اور وہ ارشاد

وتربیت میں مجاز (حضرت مولانا رابع صاحب نے ان کو مجاز بنایا تھا) ہوکر دینی مقام کے بھی حامل بنے اور یہ خصوصیت ان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے سلسلہ میں حاصل ہوئی جن سے ان کا تجدید بیعت واصلاح کا تعلق قائم ہوا تھا۔

محمد بھائی مرحوم میں متعدد خصوصیات ایسی تھیں جو کم جمع ہو پاتی ہیں، دینی خصوصیات کے ساتھ دنیوی فہم وبصیرت بھی ان کو اچھی حاصل تھی، اور دنیوی معاملات میں بھی ایک محترم شخصیت کے طور پر وہ متعارف تھے، ان کا کاروبار ٹرانسپورٹ کا تھا، اور اپنے صاحبزادگان کو بھی انہوں نے اس میں شریک کیا، اس میں بھی انہوں نے ہمیشہ احتیاط کا پہلو ملحوظ رکھا، اور اپنے کاروبار کو شبہات سے بھی پاک رکھنے کی کوشش کی، اور اس کی بھی اپنے لئے فکر کی کہ یہ کاروبار ان کی دینی معمولات پر اثر انداز نہ ہو اور اپنے صاحبزادگان کا بھی یہ مزاج بنایا، اور اپنے زیر تربیت پوتوں کا بھی یہ مزاج بنایا، چنانچہ ان کے سبھی صاحبزادگان دینی ودنیوی صفات وخصوصیات کے جامع ہیں، جن میں سب سے بڑے احمد بھائی اورنگ آباد میں مقیم ہوئے اور دوسرے صاحبزادے عبدالرشید بھائی کے صاحبزادگان نے احمد آباد گجرات کا نظام سنبھالا، یہ سطریں انہی کے مکان پر لکھی جارہی ہیں، تیسرے صاحبزادے عبدالمجید بھائی ممبئی میں مقیم ہیں، اور چوتھے صاحبزادے ابوالحسن بھائی حیدرآباد میں مقیم ہیں، اور وہاں وہ ہم لوگوں کے میزبان ہوتے ہیں۔ دیگر صاحبزادگان میں ابوسفیان، عبدالرحمٰن (یہ اپنے والد کے زمانے سے ہی آنے والے حضرات کا خیال رکھنے والوں میں تھے، اور وہی اب سارا نظام سنبھالتے ہیں،) ان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے عبدالحی اور احفاد میں محمد عامر، محمد واسع، عبدالعزیز، عبدالحفیظ اور دوسرے بھی وہی تعلق رکھتے ہیں جو انہوں نے اپنے بڑوں کا دیکھا۔ یہ محمد بھائی کے اخلاص ومحبت اور حسن تربیت کا اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو باقی رکھے، اور ان کو اعلیٰ مراتب سے نوازے۔

ایک طویل علالت کے بعد تقریباً ۸۶ سال کی عمر میں بدھ ۱۸ر ستمبر ۲۰۱۳ء کو ممبئی میں ان کا انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ماسٹر الحاج کلیم اللہ خان صاحب الہ آبادی

۱۳۴۷ھ ۱۹۲۸ء تا ۱۴۴۰ھ ۲۰۱۸ء

شاہ جہاں پور کے دینی فکر کے حامل، صاحب علم و دانش شخصیت بھائی الحاج کلیم اللہ خان صاحب سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لکھنو گذشتہ صدی کے وسط سے تبلیغ و دعوت اور تعلیم و تربیت کی فکر رکھنے والے بڑے کارگذار فرد تھے، ان کو آغاز جوانی کے وقت سے ہی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت ملی، اور ان کی خدمت دین وعلم کی کوششوں میں وہ شریک رہے، جیسے کوئی شاگرد اپنے استاد کے ساتھ علمی و دینی لحاظ سے وابستہ ہوتا ہے، اور ان کے والد لکھنو شہر میں گورنمنٹ کی ملازمت میں تھے، اس کی وجہ سے ان کو لکھنو میں قیام کا موقع ملا تھا، اور وہ ان دونوں بزرگوں کے کاموں میں شریک ہوئے تھے، یہ وہ وقت تھا جب ہندوستانی مسلمانوں کی دینی وفکری رہنمائی کی ضرورت تھی، جس کا احساس کر کے دونوں بزرگ شخصیتیں خدمت دین کی مؤثر کوشش انجام دے رہے تھے، خاص طور پر لکھنو میں دعوتی انداز سے اجتماعات منعقد کرتے تھے، جس میں فکر مند مسلمانوں کی رہنمائی ہوتی۔

یہ زمانہ تقریباً گذشتہ صدی کا چھٹی دہائی کا تھا، اسی دوران بھائی کلیم اللہ خاں صاحب مرحوم کو تعلیمی میدان میں اچھی جگہ ملی، وہ لکھنو کے مشہور تعلیمی ادارے امیر الدلہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل شخصیت ہوگئے، اس سے ان کو اپنی دعوتی وفکری کاموں کو بڑھانے اور ترقی دینے میں مزید مدد حاصل ہوئی، ان کو اپنے قریب العمر رفقاء بھی حاصل ہوئے جس

سے ان کا ایک حلقہ بن گیا، اس میں معروف عالم وادیب مولانا محمد میاں حسنی مرحوم جو عربی رسالہ ''البعث الاسلامی'' کے بانی ومدیر اور اسی طرح ''تعمیر حیات'' کے بانی ومدیر تھے، اور فوج کے ایک عہدہ پر فائز نوجوان کرنل ڈاکٹر محسن جلیل شمسی صاحب مرحوم اور سیتاپور کے نوجوان تعلیم یافتہ اور دعوتی ذہن رکھنے والے فرد اطہر حسین خالدی صاحب جو اسلامیہ کالج میں استاد بھی ہو گئے تھے اور پھر پرنسپل ہوئے اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی حال مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء اور مولانا محمد طاہر صاحب منصور پوری مرحوم اور یہ راقم سطور بھی شریک مجلس ہوتا، شہر میں خدمت علم و دین کی اچھی فضا بنی، بعد میں ماسٹر کلیم اللہ صاحب کی کالج کی خدمت لکھنو سے پیلی بھیت منتقل ہوئی، جہاں انہوں نے ایک مدت گذاری پھر الہ آباد آئے وہاں سے ریٹائر ہوئے لیکن وہیں رہائش اختیار کر لی، دعوتی وتبلیغی سرگرمیاں ان کی لکھنو سے ہی جاری تھی، جو یہاں بھی جاری رہی، اور تبلیغی جماعت کے سرگرم داعی کے طور پر معروف رہے، ان کی قدر ومنزلت ان کے احباب میں تھی۔

اپنے خاص احباب کے علاوہ ان کا ہم لوگوں سے بڑی اپنائیت کا تعلق تھا، اخیر میں وہ علیل رہنے لگے تھے مگر اپنا وہ مکان چھوڑنا نہیں پسند کیا، جو انہوں نے الہ آباد میں ایک ہندو سے خریدا تھا، اور اس نے مورتی ہٹاتے وقت یہ بات کہی تھی کہ اب یہاں تمہاری جگہ نہیں رہی، اب یہاں اللہ میاں آگئے ہیں، انہیں یہ بات ایسی لگی کہ انہوں نے تکلیف کے ساتھ یہاں رہنا گوارا کیا لیکن اللہ کی نسبت سے اس مکان کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا، بڑے ہمت صبر واستقامت اور صاحب صلاح وتقویٰ فرد تھے، عمر میں میری اور ان کی یکسانیت تھی اور مجھ کو ان سے بڑا انس وقرب محسوس ہوتا تھا، الہ آباد کے سفروں میں ان سے ملاقات کی بھی نیت ہوتی تھی، اور ملاقات پر وہ بڑی خوشی کا اور تعلق کا اظہار کرتے، وہ تعلق جو خاص بھائیوں کا ہوتا ہے۔

وہ بڑے جری اور حق کے معاملہ بے باک تھے، اور ان کا جذبہ تھا کہ نصرت دین اور فکر اسلامی کی تقویت کے لیے ہم جو کر سکتے ہوں، اس میں کوتاہی نہ کریں، اس میں اگر

ان کا کوئی ذاتی نقصان ہوتا تو وہ برداشت کرتے ،حوصلہ منداور صاف دل کے آدمی تھے، اس طرح انہوں نے اوران کے رفقاء نے اپنے ماحول پر اچھا اثر ڈالا،ان کا وہ دور ایسا تھا کہ ہندوستان کو آزاد ہوئے اور ملک کو تقسیم ہوئے دو چار سال ہی گذرے تھے اور ہندوستان میں مسلم اقلیت کو اپنی اقلیت کی مشکلات کا سامنا تھا، جس کو سمجھنے اور اس کا مداوا کرنے کی ضرورت تھی، اس وقت کے یہ نوجوان باحمیت لوگ، اپنی حوصلہ مندی اور خدمت دین کے جذبہ کے ساتھ کھڑے ہوئے، یہ بات بڑی لائق قدر تھی۔

بھائی کلیم اللہ خاں شاہ جہاں پوری کی خوبی یہ تھی کہ کہ انہوں نے اس جذبہ کو تاحیات قائم رکھا لیکن جو قابل عمل دائرہ تھا اس کے اندر رہتے ہوئے بالآخر اپنی پیرانہ سالی کے حدود میں بھی پہونچ کر اس سے کام لیتے رہے، اور آخر میں اپنی صحت کی معذوری کے اثر سے ایسا مرحلہ آیا کہ اب وہ اپنی سرگرمی اس طرح نہیں دکھا سکتے تھے تقریباً نوے سال کی عمر میں انہوں نے سفر آخرت اختیار کیا، جہاں ان کو اپنے مالک حقیقی سے اپنی حسنات و خدمات کا اجر حاصل ہوگا اور وہ سرخرو ہوں گے، ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ اضعافاً مضاعفہ ان کو اجر عطا فرمائے۔

مولانا محمد سالم قاسمیؒ

۱۳۴۵ھ ۱۹۲۶ء تا ۱۴۳۹ھ ۲۰۱۸ء

مولانا محمد سالم قاسمی صاحب خاندان نانوتہ کے جلیل القدر عالم دین حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ کے وارث علم وخاندان تھے اور انہوں نے اپنی علمی ودینی مصروفیات سے دین وملت کی رہنمائی قابل قدر انداز سے کی، انہوں نے اپنی مختلف علمی ودینی خصوصیات، اپنے عالی قدر خاندان سے وراثت میں پائی تھی، ان کے والد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور ذی وقار جانشین تھے، حضرت مولانا قاسم صاحبؒ کی دینی عظمت کے ساتھ ان کی علمی وفکری بلندی جو ان کا امتیاز رہی ہے، اس کا حصہ بھی حضرت قاری صاحب کو قدرت کی طرف سے ملا تھا، جو ان کی تقریر وتحریر میں محسوس کیا جاتا تھا، وہ اپنے عہد کے ممتاز علماء دین میں عظیم المرتبت مقام وقبولیت عامہ رکھتے تھے، ان کی ان خصوصیات کے ماحول میں ان کے خلف الرشید مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ کی نشو ونما اور تربیت ہوئی تھی، اور ان کی خصوصیات کا ان میں پرتو آیا تھا۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اپنے اسلاف کے سلسلہ میں دار العلوم دیوبند جیسی عظیم المرتبت درسگاہ میں جو دادا کی ہی قائم کردہ تھی، یعنی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی قائم کردہ درسگاہ میں اپنے خاندانی اور ان کے زیر نگرانی علمی اور تعلیمی ماحول میں رہ رہے تھے، اور اس کے نہج وانداز فکر کے حامل بنے تھے، اپنے عہد میں اسی انداز کی خدمت علم وملت کرتے

تھے، جس سے امت کے مختلف طبقات نے فائدہ اٹھایا اور فائدہ اٹھا رہے تھے، اس طرح ان کی وفات کا واقعہ خدمت دین وملت کے دائرہ میں ایک کمی پیدا ہونے کا باعث ہوا، مولانا محمد سالم قاسمیؒ کی عمر نوے سے اوپر تک پہونچی، اور اس طرح ان سے فائدہ پہونچنے کا سلسلہ بھی اچھا رہا، وہ طبیعت کے لحاظ سے بھی مرنجان مرنج اور انس وتعلق کی صفت رکھتے تھے، اس کی وجہ سے ان کو مقبولیت حاصل تھی، اور اپنے والد کے عہد میں ان کے دور اہتمام کے تعلق سے ان کے معاون کی حیثیت بھی ان کو حاصل تھی، جو دار العلوم دیوبند کے دو پہلو ہو جانے کی صورت میں وہ مہتمم کی حیثیت کے حامل ہوئے جو پہلو وقف کہلاتا ہے، اسی طریقہ سے تعلیمی دائرہ میں بھی ان کی سرپرستی ونگرانی کا سلسلہ جاری رہا، مولانا محمد سالم صاحبؒ نے اپنے مؤقر والد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی طبیعت ورجحان کے مطابق ملت کی دینی وتعلیمی تحریکوں سے بھی وابستگی رکھی، اسی ضمن میں دار العلوم ندوۃ العلماء سے بھی ان کا اچھا تعلق رہا، اور یہاں جب بھی ان کا تشریف لانا ہوتا، تو طلباء کو اپنے خطاب سے فائدہ بھی پہونچاتے۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا تعلق مولانا علی میاں سے بھی بہت انس و قربت کا تھا، اسی تسلسل میں مولانا محمد سالم صاحب کا مجھ کاتب سطور سے بھی تعلق تھا، اس تعلق میں اس بات کو بھی دخل تھا کہ میرے سرپرست حضرت مولانا علی میاں نے مجھے دار العلوم ندوۃ العلماء کے اکثر تعلیمی مرحلہ سے گذار کر مزید دینی وعلمی فائدہ کے لیے دار العلوم دیوبند دیکھنے اور اس سے استفادہ کرنے کے لیے بھیجا تھا، جو تقریبا ایک سالہ تعلیمی مدت یعنی ۴۷-۱۹۴۶ کا تھا، جہاں میں نے دورہ حدیث کی کتابیں پڑھیں، یہ حسن اتفاق کی بات تھی کہ جن دو اہم کتابوں میں باقاعدہ درجہ میں شرکت کی، جو تفسیر جلالین اور ہدایہ کی تھی، اس میں مولانا محمد سالم قاسمیؒ کی بھی رفاقت درس حاصل ہوئی، جو اپنے تعلیمی مرحلہ کے ساتھ اس میں شریک تھے۔

جہاں تک دار العلوم دیوبند اور خاندان قاسمی سے ربط وتعلق کی بات ہے وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے زمانہ سے ہے، جب ان کا دعوتی اصلاحی دورہ دوآبہ دیوبند، نانوتہ، تھانہ بھون،

کاندھلہ وغیرہ کا ہوا تھا، اور دارالعلوم دیوبند (۱) قائم ہونے پر ان کے ایک نواسے مولانا سید محمد عرفان ٹونکی (۲) نے وہاں تعلیم حاصل کی تھی، پھر جب ہمارے نانا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ

---

(۱) انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے ان پر ہر در بند کردیے، اور طرح طرح سے اسلام کی بیخ کنی میں مصروف ہوگئے، ایسے وقت میں چند اہل دل نے ۱۸۶۲ء میں دیوبند میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی، اس وقت سے ہر دور میں ہر طرح کے اسلام دشمن رجحانات وخیالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے وہاں مجاہدین صف شکن پیدا ہوتے رہے۔ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی نے بیعت وارشاد اور درس وتدریس کے ذریعہ فولادی عزم وارادے کی ایک جماعت تیار کردی جو بدعات وخرافات ومشرکانہ رسوم ورواج سے مسلم معاشرہ کو نجات دلاکر اسلام کی صاف اور سیدھی شاہراہ پر لانے کا حوصلہ رکھتی تھی، دیوبند کا قیام ہندوستان میں اسلامی تاریخ کا ایک نیا اور روشن باب ہے۔

(۲) مولانا سید محمد عرفان ٹونک میں ۱۲۶۵ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی کتب مولوی عبدالغفور اور شیخ عبدالمالک اور قاضی امام الدین سے پڑھیں، اس کے بعد دیوبند تشریف لے گئے اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ سے علم حاصل کیا، بھوپال جاکر شیخ عبدالحق کابلیؒ سے کسب علوم کیا، صحاح ستہ مولانا عبدالقیوم بن مولانا عبدالحی بڈھانوی سے پڑھی، مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلویؒ سے بھی حدیث پڑھی، قاضی حسین بن محسن الیمانی سے اجازت حدیث حاصل کی پھر سہارنپور جاکر مولانا فیض الحسنؒ سے ادب کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے، خاندان کے ایک بزرگ اور شیخ طریقت حضرت مولانا خواجہ سید احمد نصیر آبادی سے بیعت ہوئے۔ مولانا سید محمد عرفان کے زہد وورع، اتباع سنت، علم وعمل، ادب اور فصاحت وبلاغت پر اس زمانہ کے سارے علماء متفق تھے، ان کی صحبت اتنی موثر، اتنی جاذب وروح پرور اور یقین افروز ہوتی تھی کہ ذرا دیر کے لئے کوئی بھی بیٹھ جاتا تو اٹھتے وقت اپنے اندر خوف خدا کی کیفیت بدرجہ اتم پاتا، مولانا کی احتیاط، قناعت، خوش خلقی سے ہر ایک متاثر تھا، قرآن شریف نہایت خوش الحانی سے پڑھتے اور خوف خدا سے بادیدۂ گریاں رہتے، اکثر ایسا ہوتا کہ وہ مسجد یا گھر میں قرآن کی تلاوت کررہے ہیں کہ کوئی گلی سے گزرا، بے اختیار کھڑا ہوجاتا اور اس لحن داؤدی اور اس پر درد وسوز آواز کو چند لمحے مبہوت ہوکر سننے لگتا۔

آپ حضرت سید احمد شہیدؒ کے نواسہ تھے اور آپ ہی کے رنگ میں رنگے ہوئے، مسلکاً عامل بالحدیث تھے، اللہ تعالیٰ نے مولانا سید عرفان میں ایسے اوصاف جمع کردیئے تھے کہ کم ہی کسی میں جمع ہوتے ہیں، علم وعمل، شعر وادب، فصاحت وبلاغت، حسن صورت، زہد وورع، عبادت وریاضت، روایت میں احتیاط، کم سخنی اور ترک مالایعنی، تلاوت وذکر، اتباع سنت، عشق رسول ﷺ، محبت خداوندی، نرم گفتاری، راست بازی، وقار وتمکنت، اہل دل کے یہاں عزیز وباوقار، اہل حکومت کی نگاہ میں محترم ومعزز، نواب ابراہیم علی خاں والی ٹونک ان کے تقویٰ اور عمل بالسنہ اور خودداری سے بہت متاثر تھے اور ان کا بڑا احترام وادب کرتے تھے۔ اکثر عربی میں شعر کہتے، جمعہ ۲۳ رذی الحجہ ۱۳۲۳ھ کو ٹونک میں انتقال کیا۔

سابق ناظم ندوۃ العلماء نے اپنے تعلیمی مرحلہ کی تکمیل کے بعد مزید علمی و دینی استفادہ کے لیے دہلی اور دوآبے کا ایک دینی و علمی دورہ کیا تھا، جس میں ان کے ساتھ ہمارے دادا مولوی سید خلیل الدین حسنی مرحوم بھی شریک سفر تھے، اور وہاں کی بزرگ شخصیات حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے صاحبزادے مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، سب نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی نسبت سے ان کا بڑا خیال فرمایا تھا، جس کا تذکرہ مولانا عبدالحئی صاحب نے اپنی کتاب ''دہلی اور اس کے اطراف'' میں تفصیل سے کیا ہے، بعد میں مولانا عبدالحی حسنیؒ کے دونوں صاحبزادگان میرے دونوں ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ساتھ دارالعلوم دیوبند سے بھی استفادہ کیا، اور اسی تعلق سے مجھے بھی وہاں کچھ وقت کے لیے بھیجا، اور میں مظاہر العلوم میں ایک ماہ گزار کر دیوبند گیا اور ۸۔۹ ماہ کی مدت تعلیم کا وقت گزارا، یہی وہ زمانہ تھا کہ حضرت مولانا قاری طیب صاحب کا'' حجة الله البالغة ''(۱) کا درس مشہور تھا، اس میں بھی حاضری کا موقع ملا، اس طرح مختلف

(۱) یہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی دو جلدوں میں معرکۃ الآراء تصنیف ہے، جس میں اسرار شریعت کا بیان نہایت عمدہ طریقہ سے ہے، نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ علم اسرار دین پر یہ اولین کتاب ہے، اور عرب و عجم کے کسی عالم نے اس اہم موضوع پر اس پائے کی کتاب نہیں لکھی ہے، شاہ صاحب اس کو اسرار حدیث کی کتاب سمجھا کرتے تھے، چنانچہ ''السر المکتوم'' میں ان کی ایک تحریر یہ بھی ہے،'' و من أعظم منن الله تعالىٰ على هذا العبد أن وفقه تخريج أسرار الحديث اجمالا و تفصيلا، فدونها فى كتاب سماه حجة الله البالغة'' اس بندہ پر اللہ کے عظیم احسانات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے بندہ کو اسرار حدیث کی اجمالی اور تفصیلی تخریج کی توفیق بخشی، اور اس کو ایک کتاب میں مدون کر کے اس کا نام حجۃ اللہ البالغۃ رکھا۔ شاہ صاحب نے احکام شریعت کے اسرار و حکم اور مصالح واضح کرنے کے لیے ذخیرہ احادیث کو بنیاد بنایا ہے، اس میں آیات قرآنی سے بھی کثرت سے استشہاد و استنباط کیا گیا ہے، یہ کتاب اس زمانے کے قدیم مقفع و مسجع اسلوب سے ہٹ کر ایک نئے نہج اور نئے اسلوب تحریر میں پیش کی گئی، اور اس میں ایسے مضامین پیش کئے گئے کہ جن سے ہمارے اسلامی تاریخ کے کتب خانے پہلی بار روشناس ہوئے۔ حضرت مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تاریخ علوم اسلام میں حجۃ اللہ البالغۃ کو ایک عظیم کارنامہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں، یہ کتاب اپنے موضوع پر بالکل منفرد و یگانہ ہے اور عربی زبان اپنی وسعت کے باوجود اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے=

مناسبتوں سے مولانا محمد سالم قاسمی سے ایک اچھا تعلق بن گیا تھا اگر چہ وہ ہم سے عمر میں کچھ بڑے تھے، لیکن وہ مرنجاں مرنج طبیعت رکھتے تھے، اور مخلصانہ ومحبانہ انداز سے پیش آتے تھے، بعد میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن منتخب ہونے کے بعد وہ اس کے انتظامی جلسوں میں شرکت کا اہتمام بھی کرنے لگے تھے اور ہماری انتظامیہ کی بعض میٹینگیں ان کی صدارت میں بھی ہوئیں، اور پھر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے جلسوں میں ان سے ملاقاتوں کا ایک سلسلہ رہا جس سے وہ پرانا تعلق تازہ ہوتا رہا۔

جہاں تک آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا تعلق ہے، اس کے اول و مؤسس صدر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیو بند تھے، ان کی حیات مستعار ختم ہونے پر بورڈ میں ان کے جانشین کے طور پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ؒ کو صدر منتخب کیا گیا، جب ان کی بھی حیات مستعار ختم ہوئی اور انتخابی اجلاس دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قائم ہوا، تو عام طور پر ارکان بورڈ کی طرف سے تین نام زیر غور لائے گئے، جن میں مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحب جو بورڈ کے کاموں میں بہت نمایاں کردار انجام دے رہے تھے، اور مولانا محمد سالم صاحب قاسمی جو بورڈ کے پہلے صدر کے فرزند اور دارالعلوم دیو بند

= یہ کتاب بیان کی قوت اور زبان کی سلامت کا ایک ممتاز اور کامیاب نمونہ ہے، (ہندوستانی مسلمان)
الغرض شریعت اسلامیہ کے امکانات کی مصلحتیں حضرت شاہ صاحب نے جس پیرایہ میں بیان کی ہیں، جس کی وجہ سے حجۃ اللہ اپنے زمانہ تصنیف سے لے کر اب تک اپنی کشش برقرار رکھے ہوئے ہے، حضرت شاہ صاحب کے خلوص وللّٰہیت، تقویٰ خشیت اور ان کی مخلصانہ اصلاحی جدوجہد کی وجہ سے یہ کتاب مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، اور مختلف ممالک کے جامعات میں داخل نصاب ہے۔

ماہرین کے بقول اس کتاب کی تصنیف و تالیف میں تین سال صرف ہوئے، اور یہ حضرت شاہ صاحب کے سفر حرمین کے معا بعد کی تصنیف ہے، جس کی تالیف ۱۱۴۵ھ ۱۷۳۲ء کے اواخر یا اگلے برس کے اوائل میں شروع ہوئی، اور ۱۱۴۸ھ ۱۷۳۵ء کے وسط سے پہلے پہلے وہ مکمل و مرتب ہو کر مقبول خاص و عام ہوئی، اس کتاب کا سب سے معتبر اور اہم ترین نسخہ کراچی کی خالد اسحاق لائبریری کی زینت ہے، جس کو شاہ صاحب کے شاگرد و مسترشد کریم نے ۱۱۵۹ھ میں نقل کیا تھا اور اس کو ۱۱۶۲ھ میں آپ سے پڑھا بھی تھا۔

حجۃ اللہ کی شروح میں نعمة الله السابغة ، شموس الله البالغة ، آيات الله الكاملة اور رحمة الله الواسعة جیسی متعدد شرحیں ہیں۔

میں اپنی طویل خدمات رکھنے اور اس کے ترجمان کی حیثیت سے جانے جاتے اور بورڈ کے نائب صدر ہونے کی وجہ سے اہمیت رکھتے تھے۔

ان دونوں کے ساتھ اس ناچیز کا نام بھی تھا، اس ناچیز کو اس میں تردد تھا کہ اوروں سے کم تر ہوں اس لیے میرے نام کی ضرورت نہیں ہے، لیکن ان حضرات نے میرے نام کو بھی پیش نظر رکھا اور ہم تینوں کی ایک مجلس جلسہ گاہ سے ہٹ کر ایک حجرہ میں ہوئی اور اس میں صرف بورڈ کو ترقی دینے اور تعاون کرنے کی بات آئی، بالآخر باہمی مشورہ سے مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کا نام طے ہوا، اور یہ اچھا انتخاب ہوا، لیکن ڈیڑھ دو سال کی مدت ہی میں وہ بھی داغ مفارقت دے گئے، اور پھر حیدرآباد میں انتخابی اجلاس ہوا جس میں راقم السطور کی معذرت کے باوجود صدارت کی ذمہ داری اس پر ڈالی گئی، اس میں مولانا محمد سالم صاحب کی تائید بھی شامل تھی، ان کو نائب صدر کا منصب پہلے سے حاصل تھا وہ برقرار رہا، لیکن راقم السطور ان کو صدارت کے منصب کی حیثیت سے ہی محسوس کرتا رہا، اور ان کا تعلق بھی ہمیشہ تقویت کا بنا رہا، جو مختلف موقعوں پر ملاقاتوں سے بھی ظاہر ہوتا تھا، خاص طور پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد سے ان کا خیال بڑھ گیا تھا، جس سے ان کے تعلق کی بات بھی ظاہر ہوتی تھی اور ان کی کتابیں وہ شوق سے پڑھتے تھے۔

مولانا محمد سالم قاسمی اپنی مذکورہ صفات و خدمات کے ساتھ اپنی مقررہ عمر جو شمسی اعتبار سے ۹۲ سال ہوئی، پوری کر کے اس دنیا سے رخصت ہوئے، اور ادھر قریبی عرصہ میں ملت کی متعدد علمی اور تعلیمی شخصیات بھی دنیا سے رخصت ہوئیں، جس سے جلیل القدر نسبتوں کے حامل افراد کی کمی کا احساس بڑھا، اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو ان حضرات کا نعم البدل عطا فرمائے اور ان کا حشر اپنے مقبول اور برگزیدہ بندوں میں فرمائے۔ آمین۔

مولانا ابوالمحاسن سجاد

۱۳۰۱ھ ۱۸۸۳ء تا ۱۳۵۹ھ ۱۹۴۰ء

ہندوستان تقسیم سے قبل دنیا کے ملکوں میں اپنی بڑائی اور اپنے ملکی مسائل میں خود کفیل حیثیت کا ہونے کی بنا پر نمایاں مقام کا مالک رہا ہے اور اُس پر برطانوی اقتدار کے زمانے میں یہاں کا دانشور طبقہ ملک کی آزادی کے لیے ضروری جدو جہد کرتا رہا حتی کہ ملک آزاد ہوا لیکن تقسیم ملک کے ساتھ یہاں مسلمان اقلیت میں رہے' تاہم بڑی اقلیت ہونے کے ساتھ مسلمانوں کے طبقے میں علمائے دین اپنے وطنِ عزیز میں مسلمانوں کو اپنے دینی صفات و کردار کو بہتر بنانے کی کوششوں کے ساتھ باہری حکومت کے ظلم و ستم سے بچانے کے لیے کوشاں رہے، اُس میں ان کے پلیٹ فارم سے موثر اور مفید کوششیں سامنے آئیں، اُس کے لیے جیلوں میں جانا بھی گوارا کیا، اور قربانیاں پیش کیں، جس کے فائدے نمایاں طور پر ظاہر ہوئے' ایک تو یہ کہ انگریزوں کے استعماری دباؤ میں کمی آئی، اور آزادی ملنے کے بعد ملک میں اقلیت ہونے کے باوجود جدو جہد آزادی میں شرکت کے سبب اکثریتی طبقے کے برابر کے شریک سمجھے گئے۔ ان کی یہ شرکت جمعیت العلما کے ملی پلیٹ فارم کے تحت رہی' اس کی نمایاں شخصیتوں میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقا مولانا مفتی کفایت اللہؒ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ' مولانا شبیر احمد عثمانیؒ' مولانا ابوالمحاسن سجاد (بہاریؒ)' مولانا عزیر گلؒ مولانا احمد علی لاہوریؒ اور دوسری طرف حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ' اور ان کے تلامذہ و مسترشدین جن میں مولانا محمد علی جوہرؒ اور

مولانا شوکت علیؒ کے نام بہت نمایاں ہیں۔

جنگِ آزادی میں ان حضرات کی کوششوں کا اثر خاصا رہا اور ملک کی اکثریت کے رہنماؤں کے ساتھ شریکِ عمل رہے اور اسی کے ساتھ مخلصین علماءِ دین ہونے کے تعلق سے مسلمانوں کی دینی و اخلاقی رہنمائی بھی کرتے رہے اور ملت کی ترقی و اصلاح کی فکر بھی کرتے رہے، خاص طور پر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی شریکِ کار رہے، اور ان کی ہی سطح پر مسلمانوں کے دائرے میں رہتے ہوئے مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب کی ملی کارگزاریوں کو دیکھا گیا۔ مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب کو حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بڑی مناسبت اور فکری و عملی اتحاد کا تعلق تھا اور وہ اہم ملی مسائل میں ان سے مشورہ کرتے اور اس کے لیے دیوبند بار بار تشریف لے جاتے تھے۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت صوبہ بہار میں بہت نمایاں کارگزاری میں معروف ہوئی، وہ دینی و ملی کارگذاری کی بنا پر بڑی نمایاں شخصیت کے طور پر ملت کی محسن شخصیات میں شمار کی جانے والی اہم حیثیت رکھتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے امارتِ شرعیہ کے قیام کا عظیم کام لیا جسے انھوں نے اپنے صوبہ بہار کو سامنے رکھ کر قائم کیا اور منظّم کیا۔ جمعیۃ العلما کے سامنے ملکی سطح پر یہ کام تھا اور عملی طور پر انھوں نے جمعیت کے مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کا آغاز واقدام کیا جو بہت مستحسن اقدام تھا، جس کے سو (۱۰۰) سال پورے ہو رہے ہیں۔ جب کہ جمعیۃ العلماء کی تاسیس و قیام کو بھی سو (۱۰۰) سال ہجری اسلامی تقویم سے پورے ہو چکے ہیں۔ اور اس کی سو سالہ خدمات کا تعارف کرانے کا جمعیۃ العلماء نے یہ اچھا طریقۂ کار نکالا ہے کہ اس کے بانیوں اور معماروں کا تعارف نئی نسل کے سامنے کرایا جائے۔ اور ان کی خدمات و قربانیوں سے نئی نسل میں ہمت و حوصلہ اور جرأت و حمیتِ دینی کا وصف پیدا کرایا جائے۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاری رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی خصوصیت اور اپنے

معاصرین میں امتیازی بات یہ تھی کہ انھوں نے اپنے علمی ذوق و مزاج اور علمی شغل کے ساتھ میدانی کام بھی اختیار کیے اور ملی رہنمائی کا کام بھی اچھے انداز میں کیا۔ اس سلسلے میں امارت شرعیہ بہار کا قیام غیر معمولی عمل ہے جو دینی و ملی معاملات میں امت کے فرزندوں کی بڑی اور جامع رہنمائی انجام دے رہا ہے۔ اس کا امیر بہار کی بڑی علمی و دینی شخصیت ہوتا ہے' تا حال کئی امیر ہو چکے ہیں۔ موجودہ امیر مولانا محمد ولی رحمانی صاحب ہیں۔

ہمارے بعض بڑے علما نے بڑے درد اور رشک سے یہ بات بھی کہی جسے ہم بھی دہراتے ہیں کہ اگر مجھے ہندستان کے کسی صوبے پر رشک آتا ہے تو بہار پر آتا ہے' اور وہ امارتِ شرعیہ کی وجہ سے کہ وہاں کے مسلمان اس کی بدولت ایسی زندگی گزار رہے ہیں جو معتبر اسلامی زندگی سے قریب تر اور جاہلی و غیر اسلامی زندگی سے بعید تر ہے۔

جہاں تک مولانا کی شخصیت و کمالات اور امتیازات اور ان کی دینی حمیت' ملی غیرت' دلسوزی' حالات پر نظر اور مسلمانوں کی نئی نسل کے ایمان و عقیدے کی فکر کے ساتھ ان میں ملی سیاسی شعور پیدا کرنے کے جذبے کا تعلق ہے' حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد رحمۃ اللہ علیہ اس میں بہت ممتاز نظر آتے ہیں۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ جنھیں ان کو اپنے استاد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ دیوبند میں اور بعض مواقع پر لکھنؤ میں ساتھ دیکھنے اور ملکی و ملی مسائل میں تبادلۂ خیال کرتے دیکھا' ان کا اعتراف و شہادت اہمیت کا حامل ہے جو ان کی کتاب ''پرانے چراغ'' سے نقل کیا جاتا ہے' وہ لکھتے ہیں:

''انگریزوں کے عہدِ حکومت کے آخری دور میں جب تحریکِ خلافت نے مسلمانوں کے دینی و ملی شعور کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا' انتشار و پراگندگی کی زندگی اور اس کے بدترین نتائج ان کی آنکھوں کے سامنے آئے' مختلف بیرونی و اندرونی اسباب کی بنا پر اجتماعی زندگی کا جذبہ ان کے اندر بیدار ہوا' الغائے خلافت نے ان کے دلوں کو زخمی کر کے رکھ دیا تھا' انگریزی عدالتوں کے فیصلوں' غیر مسلموں کی تقلید' موروثی و عرفی قوانینِ وراثت اور روایات و عادات' شریعتِ اسلامی

سے انحراف اور اس نعمتِ عظمیٰ کی ناقدری کی نحوستیں مسلمان عورت کی مظلومی اور نظامِ امارت کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کو اس کا صحیح حق دلانے اور اس کو مصائب ومشکلات سے بچانے کی دقتوں نے (جنھوں نے کبھی اس کو ارتداد اور کبھی اس کو حرام کے سایے میں پناہ لینے پر آمادہ کردیا) ان کی آنکھیں کھول دیں اور ان میں سے حساس اور دردمند اصحاب کی راتوں کی نیند حرام کردی' یہ بے چینی ہندستان میں اپنے اپنے مبلغِ علم اور اپنی اپنی دردمندی اور احساس کے درجے کے مطابق عام تھی' لیکن اس سلسلے میں قیادت و رہنمائی اور سبقت و اولیت کی سعادت اللہ تعالیٰ نے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب بہاری کی قسمت میں رکھی تھی''۔ (حصہ سوم' صفحہ ۱۲۸-۱۲۹)

مولانا کے اس اعتراف وشہادت کے بعد مزید کسی بات کی ضرورت نہیں رہتی۔ انھوں نے اپنی کوششوں اور اقدامات سے مسلمانوں کی توجہ خصوصیت سے ان کے اپنے ذاتی وخاندانی' مالی وقانونی معاملات اور اختلافات میں شریعتِ اسلامیہ کی طرف کرائی۔ یہ ان کا وہ کارنامہ اور احسان ہے جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اس کا بھی حق ہے کہ ان کی یاد تازہ کی جاتی رہے اور ان کے لیے دعا اور احسان شناسی کا فرض انجام پائے۔

سید الملت مولانا سید محمد میاں دیو بندی (رحمۃ اللہ علیہ)

۱۳۲۱ھ ۱۹۰۳ء تا ۱۳۹۵ھ ۱۹۷۵ء

ہمارے ملک ہندستان کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے اپنے مسائل کو حل کرنے کی ہمیشہ خود فکر کی اور اس کے لیے عملی جدو جہد اور فکری و سیاسی رہنمائی کا کام بھی کیا۔ جب اس ملک میں انگریزوں نے عمل دخل شروع کیا تو حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ایسی جماعت تیار کی جو ایمان و یقین اور عملِ صالح کی صفات سے متصف ہو' اور سب سے بڑا کام اس جماعت نے یہ کیا کہ مسلمانوں کے اندر دینی حمیت' ملی غیرت' ایمانی و اخلاقی جرأت اور دعوت و تبلیغِ دین و اصلاحِ امت کا ایسا جذبہ پیدا کیا کہ اس کے ذریعے پورے خطۂ برصغیر میں ایمان کی بادِ بہاری چل پڑی' اور عہد بہ عہد علماءِ دین میں وہ جذبہ کام کرتا رہا جو اس جماعت نے پیدا کیا تھا' اور اس کے لیے یہاں کے مسلمانوں نے بڑی قربانیاں بھی پیش کیں' اور اپنا ایسا نظامِ تعلیم جاری کیا جس سے ایک طرف مسلمان پکے مسلمان بنیں، اور اس کے ساتھ رہنمایانہ صلاحیت بھی پیدا کریں۔

اس سلسلے میں دارالعلوم دیو بند کا قیام عمل میں آیا، اور اس کے فضلاء حضرت مولانا محمود حسن دیو بندی' مولانا عبید اللہ سندھی' مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی' مولانا سید حسین احمد مدنی نے عزیمت کا راستہ اختیار کیا' اور ملک کی آزادی کی جدو جہد میں نمایاں کردار پیش کیا' اور اس بات کی پوری کوشش کی کہ ملک تقسیم کی راہ پر نہ جائے' اور ملک باہر کی طاقتوں کے

قبضے سے نکل جائے' اس میں ملک کی دوسری عظیم شخصیتوں نے بھی ساتھ دیا جن میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام سرِ فہرست لوگوں میں ہے۔ وہ اگرچہ کانگریس کے قائدین میں تھے لیکن جمعیۃ العلما کی فکر سے پورے ہم آہنگ اور اس کے رہنماؤں کے شریکِ کار تھے۔

ہندوستان کی آزادی سے قبل علمائے دین اپنے وطن عزیز کو باہری حکومت کے ظلم وستم سے بچانے کے لیے تحریک آزادی کے لیے جو جدوجہد کرتے رہے، اس میں جمعیت علماء کے پلیٹ فارم سے مؤثر اور مفید کوششیں سامنے آئیں، اور اس کے لیے جیلوں میں جانا گوارا کیا گیا، اور قربانیاں پیش کی گئیں، جس کے دو فائدے نمایاں طور پر ظاہر ہوئے، ایک تو یہ کہ انگریزوں کے استعماری دباؤ میں ایسی کمی آئی جو ان کے ملک کو چھوڑنے کا ذریعہ بنی، اور آزادی ملنے کے بعد ہندوستان کی ہندو اکثریت کی حکومتی حصہ میں مسلمانوں کی اقلیت ہونے کے باوجود علماء کی جدوجہد آزادی کے سبب ان پر ملک کی آزادی میں نمایاں حصہ لینے کی وجہ سے ان کو اکثریتی طبقہ کے اقتدار کے برابر کا شریک اور حقدار تسلیم کیا گیا اور اس طرح اس ملک کو صرف اکثریتی ملک کی حیثیت سے مسلمانوں کا حقدار قرار دیا گیا۔

جمعیت العلماء کی ممتاز شخصتیوں میں جو اکثریتی طبقہ کے جنگ آزادی کی معروف شخصیتوں کے ساتھ ان کی وجہ سے برابر کا شریک سمجھا گیا، ان میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کو بہت امتیاز حاصل ہوا، ان کے دیگر شرکاء میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی کے نام نمایاں ہیں، ان میں مولانا سید محمد میاں رحمت اللہ علیہ خاموش طبیعت اور علمی مزاج کے حامل تھے، ان کی اہم کتابیں بھی ہیں، جن سے ہندوستانی مسلمانوں کی روشن تاریخ کے نقوش سامنے آتے ہیں، اور علمی کاموں کی انجام دہی بھی ہوتی ہے، وہ جمعیت العلماء کے پروگراموں میں نمایاں نظر آتے تھے، اور ملک کی آزادی میں ان کا جو کردار رہا وہ بھی نمایاں ہے، ان کا تعلق مسلمانوں کے تعلیمی اداروں سے بھی رہا، اور ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں سے بھی ان کا ربط رہا، جن میں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اور ان کے بھائی حضرت مولانا علی میاں ندویؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مولانا سے میری بھی

اچھی ملاقاتیں رہی، اور میں نے ان کو ہمیشہ ایک بزرگ عالم اور رہنما کی حیثیت سے دیکھا، دین وملک کے لیے جمعیت العلماء کے پلیٹ فارم سے ان کی جو خدمات رہیں وہ کسی سے مخفی نہیں، جمعیت العلماء کا ایک بڑا اجلاس ۱۹۴۸ء میں لکھنو میں ہوا، اور اس کی اہم مجلسیں ندوۃ العلماء میں ہوئی، اس کے باعث اور قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے، اور اچھی دینی فکر کے ساتھ ملک کی آزادی اور ملک کی تقسیم کے بعد یہاں کے مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے دردمندی اور دلسوزی دیکھنے کو ملی، اور واقفیت حاصل ہوئی، ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے لیے ان کی تعمیری کوششوں کے اچھے نتائج سامنے آئے، جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کے باوجود عظمت اور حسن ظن کا مقام حاصل ہوا، اور ان غلط فہمیوں کے ازالے کا بھی کام کیا گیا، جو فرقہ وارانہ منافرت سے پیدا ہوگئی تھیں، جو مسلم اقلیت کے تعلق سے بھی تھیں، اور اسلام کے تعلق سے بھی تھیں، اس لیے بھی ہم مسلمانوں کی ذمہ داری بنتی ہے، کہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ کریں، اور برادران وطن کا ذہن صاف کریں، یہ کام ملاقاتوں اور میٹینگوں اور جلسوں کے انعقاد سے بھی ہوسکتا ہے، جس کے لیے جمعیت العلماء سرگرم رہتی ہے۔ اور پیام انسانیت کے عنوان سے کام اس کا معاون ہے، جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ملک کے حالات اور یہاں کے اکثریتی طبقہ کے رجحانات کو دیکھ کر بڑی دردمندی سے شروع کیا تھا۔

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق دیوبند ضلع سہارنپور سے تھا، جہاں وہ پروان چڑھے، اور ان کو بڑے علما کی سرپرستی حاصل ہوئی، پھر ان کا مرکز عمل دہلی بنا۔ جہاں جمعیت کے پلیٹ فارم سے اور مدرسہ امینیہ دہلی میں اپنی تدریسی خدمت کے ذریعے رجال سازی کا کام کیا، مدرسہ امینیہ میں وہ شیخ الحدیث بھی رہے اور اچھی شہرت و مقام حاصل کیا، بعض اپنے خاص شاگردوں کو عربی میں اچھی قدرت ومہارت پیدا کرنے کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی بھیجا، جن میں مولانا نور عالم امینی ندوی ایڈیٹر مجلّہ الداعی دارالعلوم دیوبند نمایاں ہیں، جنہوں نے ندوہ کے قیام سے خاصہ علمی وادبی فائدہ اٹھایا، اور

یہاں استاد بھی رہے، اور پھر اس کی اہم شاخ جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم اورنگ آباد میں بھی پڑھایا، پھر وہ دارالعلوم دیوبند منتقل ہو گئے، اور وہاں شعبہ ادب کے ذمہ دار ہونے کے ساتھ اس کے ترجمان الداعی کے رئیس التحریر بھی ہیں۔

مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی کو اللہ تعالیٰ نے اچھا تصنیفی ملکہ عطا کیا تھا، زبان و ادب اور علم و تحقیق کے اعتبار سے انھوں نے معیاری کتابیں تصنیف کیں، جن میں سیرت نبوی (ﷺ) اور سیرت صحابہ اور تاریخ اسلامی اور مسلمانان ہند کی تاریخ کے علاوہ علوم دینیہ سے متعلق بھی کتابیں اور حدیث شریف کے انتخابات و مجموعے ہیں جن کا فائدہ عام ہو رہا ہے، اور ان کی شخصیت اس کے ذریعے زندہ ہے۔ ان کی یہ تصانیف سو کے قریب پہنچتی ہیں، جب کہ انھیں ملک کی سیاسی حالت اور اکابر علماء دیوبند کی اس میں عملی شرکت کی وجہ سے خود بھی حصہ لینا پڑا اور جیل کی صعوبت بھی اٹھانی پڑی تھی، اور ان کی بعض کتابوں پر پابندی بھی لگائی گئی، لیکن وہ اس سے متاثر نہ ہوئے اور ان کی علمی و ملی مشغولیت جاری رہی۔

انہوں نے اپنے صاحبزادگان کی اچھی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور سرپرستی فرمائی، ان میں خاص طور پر قابل ذکر ان کے بڑے صاحبزادے مولانا سید حامد میاں مرحوم ہیں، جن کا لاہور پاکستان میں اہم تعلیمی ادارہ دارالعلوم مدنیہ ہے، اور اس کا ترجمان انوار مدینہ پابندی سے نکل رہا ہے اور اب اس کی سرپرستی ان کے بیٹے مولانا سید محمود میاں کر رہے ہیں، جو خود ایک اچھے عالم اور وہاں استاد حدیث بھی ہیں، مولانا سید حامد میاں مرحوم پر شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی شفقت رہی، اور ان کو اجازت و خلافت سے بھی سرفراز فرمایا تھا، مولانا حامد میاں مرحوم کے علاوہ ان کے اور بھی صاحبزادگان تھے جن میں مولانا سید ساجد میاں سعودی ایمبیسی سے وابستہ رہے اور وہ بھی ایک صالح فرد ہیں، انہوں نے ایک بیٹے کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کرایا، جو یہاں سے فارغ ہیں، دوسرے صاحبزادگان بھی اچھی شہرت کے حامل ہوئے اور تعلیم یافتہ ہیں، اللہ تعالیٰ مولانا کی خدمات کو قبول فرمائے، اور ان کی مغفرت فرما کر درجات بلند فرمائے۔

مولانا شاہ قاری محمد مبین الہ آبادی

۱۳۴۵ھ ۱۹۲۷ء تا ۱۴۳۹ھ ۲۰۱۸ء

مولانا شاہ قاری محمد مبین الہ آبادی کی شخصیت الہ آباد اور اس کے علاقہ قرب و جوار کی متعارف دینی شخصیت ہے، جو وہاں کے بڑے صاحب اصلاح وارشاد بزرگ مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ الہ آبادی کے اہم خلیفہ تھے، اور ان کی ارشاد و تربیت دینی کے کام کو ان کے بعد چلانے والے تھے، ان سے بہت لوگوں نے دینی و اصلاحی فائدہ اٹھایا، الہ آباد میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری الہ ابادی کی شخصیت بہت مقبول و محبوب تھی، جن سے ان کے بعض اساتذہ نے بھی تعلق قائم کر کے فائدہ اٹھایا، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے بعض خلفاء و مریدین بھی ان سے وابستہ ہوئے، اور اصلاحی تعلق قائم کیا، مولانا شاہ قاری محمد مبین صاحب ان کے بڑے داماد تھے، جو ان کی جگہ پر بیٹھے، اور ان کا طریقہ تربیت اختیار کر کے اس سلسلہ کو جاری رکھا۔

ہندوستانی مسلمانوں کی بہت اہم ضرورت یہ ہے کہ وہ یہاں اقلیت میں ہیں اور ان کو وہ اختیارات حاصل نہیں ہیں جس سے قومیں ترقی کرتی ہیں اس لیے یہاں مسلمان اپنے طور پر تعلیمی و تربیتی کاموں کی فکر کرتے ہیں، ایسی شخصیتیں جو اس کا مذاق رکھتی ہیں، ان کی سرپرستی سے وہ اس کام کو آگے بڑھاتے ہیں، تا کہ اپنے اپنے دائرہ میں مسلمانوں کی یہ ضرورت ایسی شخصیتیں پوری کر سکیں، یہ ضرورت صحبت، اور وعظ و نصیحت سے پوری ہوتی ہیں، اور نیک کام کو ہوتے دیکھ کر نیکی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور بدی کا کام دیکھ کر بدی کا جذبہ

پیدا ہوتا ہے، اخلاق و بزرگی کی باتیں دیکھ کر ان کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، چنانچہ اس ملک میں اس دینی و روحانی ترقی کے ذریعہ دوسروں پر اثر ڈالنے کا کام بھی لیا جاتا ہے اور یہ کام زیادہ اچھے طریقہ سے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے سلسلہ کے خلفاء و مشائخ علماء کے ذریعہ انجام پاتا رہا ہے، جس کو بعد میں حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی، سید احمد شہید اور ہمارے بڑے دینی مدارس دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم اور ندوۃ العلماء کے ذریعہ اور ترقی یافتہ بنا کر زیادہ عمومیت اور وسعت دی گئی، اور یہ فیض برصغیر سے آگے نکل کر دوسرے ممالک اور دوسرے براعظم میں پہونچا۔

مولانا شاہ قاری محمد مبین الہ آبادی بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھے، جن کا الہ آباد و ممبئ میں قیام رہتا تھا، اور دونوں جگہ ارشاد و تربیت کا عمل اور روحانی و علمی فیض جاری رہتا تھا، آخر میں علالت کی وجہ سے اگرچہ وہ سفر نہیں کر پا رہے تھے، مگر لوگ ان سے استفادہ کے لیے الہ آباد میں ان کی قیام گاہ پر حاضری دیتے، اور استفادہ کرتے تھے، مدرسہ وصیۃ العلوم جسے ان کی سرپرستی حاصل تھی، اور دینی و اصلاحی رسالہ ''وصیت العرفان'' کے ذریعہ ان کا پیغام دور دور تک پہونچتا رہتا تھا، وصیۃ العرفان میں ان کا مضمون ''بلاغ مبین'' لائق مطالعہ و استفادہ مضمون ہوتا تھا۔

وہ حضرت مولانا علی میاںؒ سے تعلق رکھتے تھے اور ندوۃ العلماء سے بھی ان کو تعلق تھا، ان کے ایک صاحبزادے مولوی محمد امین صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم بھی حاصل کی، الہ آباد حاضری پر ان کی خدمت میں بھی حاضری کا موقع ملا، اور شفقت حاصل ہوئی، وہ ندوۃ العلماء بھی متعدد موقعوں پر تشریف لائے اور تعلق کا اظہار کیا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے مراتب بلند فرمائے اور ان کے سلسلہ و فیض کو جاری رکھے۔

صاحبزادگان میں مولانا احمد متین، مولانا احمد مکین اور مولوی محمد امین ندوی ہیں، جو دینی تعلیمی کاموں کو دیکھ رہے ہیں۔

مولانا قاری محمد قاسم انصاری بھوپالیؒ

۱۳۷۶ھ ۱۹۵۷ء تا ۱۴۳۶ھ ۲۰۱۴ء

ادھر ماضی قریب میں مسلمانوں کی متعدد عظیم شخصیتوں نے اس دنیا کو الوداع کہا، عمروں کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، اور وہ ہر شخص کی پیدائش سے پہلے ہی طے فرما دیتا ہے کہ اس کو کتنی مدت دنیا میں رہنا ہے، اور یہ دراصل اس کو اس سے جو کام لینا یا کام کرنے کا موقع دینا منظور ہوتا ہے اسی کے مطابق وہ طے فرماتا ہے، اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، لیکن انسانوں کے دلوں کا جو مزاج ہے اس میں اپنے واقف کار اور محبّ کی جدائی بہت محسوس ہوتی ہے ابھی حال میں معروف عالم دین اور جید قاری وحافظ مولانا قاری محمد قاسم انصاری بھوپالی نے انتقال کیا، انہوں نے اپنی زندگی قرآن مجید کی ایسی خدمت میں صرف کی، جو قابل رشک وقابل تقلید قرار پائی، وہ صرف حفظ وقراءت کے عام حامل فن نہ تھے بلکہ اس کی باریکیوں اور گہری خصوصیات کے جاننے والے اور اپنے اس علم سے دوسروں کو فائدہ پہونچانے والے تھے، ان کو اس فضل وکمال کی وجہ سے چنئی (مدراس) کی اہم ترین مسجد میں امامت وخطابت کا منصب حاصل ہوا تھا، جس کے ذریعہ طویل مدت تک وہ لوگوں کو مستفید کرتے رہے، ان کے پیچھے نماز ادا کرنے والے خصوصیت کے ساتھ ان کی مسجد میں جمعہ ادا کرتے، اور ان کے خطبہ سے مستفید ہوتے، وہ خدمت قرآن وامامت وخطبہ کے تعلق سے معروف ہوئے، اور ملک کے معروف علماء میں شمار ہوئے، انہوں نے ہندوستان کے مشہور خادم قرآن مولانا عبدالکریم پاریکھؒ کے اردو

ترجمہ قرآن کو کیسیٹ میں بھی منتقل کیا تھا، اس کے علاوہ مجلسی طور پر اپنی قراءت کو بھی کیسیٹ میں منتقل کیا تھا، جس سے ہندوستان کی اہم شخصیتیں بھی مستفید ہوتی تھیں، خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بھی اس سے مستفید ہوتے، اور خاص طور سے رمضان المبارک میں اس کو سنتے اور پسند کرتے تھے۔

ان کی اس خصوصیت کی بناء پر ان کو پورے ملک میں شہرت اور قدردانی حاصل ہوئی، وہ ہندوستان کے مؤقر اداروں کے رکن بھی منتخب ہوئے، جس میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ بھی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، قاری صاحب نے بنگلور کی معروف درسگاہ جامعہ سبیل الرشاد کے بانی اور بزرگ شخصیت مولانا شاہ ابوالسعود رحمۃ اللہ علیہ سے بھی علمی و دینی استفادہ کیا تھا، اور بھی کئی عظیم المرتبت شخصیتوں سے وہ مستفید ہوئے تھے، انہوں نے درسیات کی تکمیل ترجمہ والی مسجد بھوپال کی دینی درسگاہ سے کی تھی، جس کے ذمہ دار مولانا مفتی عبدالرزاق خاں صاحب ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بھی قاری صاحب کو خصوصی تعلق تھا، جو بڑھ کر اس درجہ تک پہونچا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے قاری صاحب کی دینی و باطنی صلاحیت وخصوصیت کی بنا پر اجازت وخلافت سے سرفراز کیا، قاری صاحب نے زاہدانہ زندگی گذاری، اور تقویٰ وللّٰہیت کے ساتھ ان کی زندگی لوگوں کے سامنے ظاہر ہوئی، قاری صاحب چوں کہ بھوپال کے تھے اور یہ تقدیر الٰہی تھی کہ وہ بھوپال آئے ہوئے تھے جب کہ ان کا قیام مدراس میں رہتا تھا اور وہی ان کا مقر عمل تھا، بھوپال کی ایک اہم مسجد میں انہوں نے جمعہ کا خطبہ دیا نماز پڑھائی اور بھوپال کا ان کا یہ سفر ان کے حج کے سفر کے تعلق سے تھا چند ہی دنوں میں ان کی حج کے لیے فلائٹ تھی انہوں نے حج کے سلسلہ میں بھی گفتگو کی اور خطاب کیا، اور درس قرآن بھی دیا، دیر رات کو ان کو قلبی تکلیف ہوئی اور اسپتال کے راستے میں داعی اجل کو جواب دیا، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون، غفر اللّٰہ له ، ورحمه رحمة واسعة شاملة، وأسكنه فسيح جناته.

ان کی عمر ایسی نہیں تھی کہ اتنی جلدی ان کی جدائی کا تصور ہوتا لیکن اللہ نے یہی عمر مقدر کی تھی اور اسی عمر میں اللہ کو ان سے بڑا کام لینا تھا، وہ ایک اچھی زندگی گذار کر اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے، اللہ تعالیٰ ان کی علمی و دینی ،قرآنی خدمات کو قبول فرمائے، اور ان کے درجات کو بلند فرمائے، عفو و مغفرت سے نوازے، پسماندگان کو صبر جمیل دے، جن میں ان کی اہلیہ اور اولاد اور بھائی وغیرہ شامل ہیں۔

حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۰۲ھ ۱۸۸۵ء تا ۱۳۶۴ھ ۱۹۴۴ء

داعی الی اللہ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ چودھویں صدی ہجری کے ان عظیم دینی شخصیات میں ہیں، جنہوں نے دین کی دعوت کو عمومی بنانے کی کوشش کی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کو اس میں اپنے پچھلے اور ہم عصر علماء ومشائخ میں یہ امتیاز حاصل ہوا کہ وہ عالمی انداز میں یہ کام لے کر اٹھے اور خواص کے ساتھ عوام کو اور عوام کے ساتھ کو جوڑ کر جماعتوں کی شکل میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا نظام بنایا، جس کا آغاز دہلی میں بنگلہ والی مسجد سے جہاں ان کے والد مولانا محمد اسماعیل کاندھلوی اور ان کے بعد ان کے بڑے بھائی مولانا محمد میاں مرحوم درس وتدریس اور تعلیم وتبلیغ کا کام اپنے محدود دائرہ کار میں رہتے ہوئے کررہے تھے، اور بقیہ وقت ذکر وشغل میں گزارے اور بہت احتیاط کی زندگی گزارنے کے ساتھ عبادت کا بڑا ذوق اور شغف رکھتے تھے اور رات کو اس طرح تقسیم کر رکھا تھا کہ ایک حصہ مولانا اسماعیل صاحب، ایک حصہ مولانا محمد صاحب اور ایک حصہ مولانا محمد یحییٰ صاحب جاگتے اس طرح پوری رات کا کوئی لمحہ غفلت میں نہیں گزرنے پاتا تھا، پھر اللہ نے مولانا محمد الیاس صاحب کو کھڑا کیا اور اس درد کو جو ان کے بزرگوں کے سینہ میں تھا وہ دوسروں کے سینوں میں منتقل کرنے کے جذبہ سے باہر نکلے، اور اپنا یہ دعوتی سفر انہوں نے میوات سے شروع کیا۔

میوات کے لوگوں نے شروع میں ان کو تکلیفیں پہنچائیں، لیکن دین کے خاطر ان

تکلیفوں کومولانا نے بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا، اوراس بات کی کوشش کی کہ میوات کے ان مسلمان بھائیوں کوکسی طرح ان کے گھروں سے نکال کر باہر لایا جائے اور دینی ماحول میں ان کا وقت گزروایا جائے۔ان کو دہلی میں بنگلہ والی مسجد میں وہ لاتے اور وہاں ان کو دین سکھاتے، دھیرے دھیرے اس کا فائدہ اس طرح ظاہر ہوا کہ ان کو اس کا شوق پیدا ہونے لگا، اوران کو یہ احساس ہوا کہ وہ کس قدر پستی میں تھے، پھران لوگوں کے اندر یہ جذبہ پیدا ہوا کہ وہ جو دین کی باتیں سیکھ رہے ہیں وہ دوسروں کو بھی جا کر سکھائیں۔

حضرت مولانا محمدالیاس صاحب کے ساتھ ان کے برادر نسبتی اور عزیز وقریب حضرت مولانا احتشام الحسن کاندھلوی ان کے کار دعوت وتبلیغ میں اس طرح لگے کہ دست راست بن گئے، انہوں نے حضرت مولانا محمدالیاس صاحب کے ساتھ اس کام کو منظم کیا، اوران کی تعلیمات کی روشنی میں اس کے اصول مقرر کیے، پھراس کی تائید ملک کی عظیم اور مرکزی شخصیات نے کی، اوراس کے اجتماعات میں حصہ لیا۔ان میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا ظفراحمد صاحب تھانوی، مولانا قاری محمد طیب صاحب دیوبندی، مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی، مولانا سید حسین احمد مدنی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے قلمی تعاون دیا۔ اوراس کام میں لگنے والوں کے لیے ایک دینی نصاب تبلیغی نصاب کے نام سے تیار کیا جو کتب فضائل کا مجموعہ ہے، فضائل نماز، فضائل رمضان، فضائل صدقات، فضائل حج، فضائل ذکر، فضائل قرآن مجید۔فضائل تبلیغ کے ساتھ حکایات صحابہؓ پر مشتمل ایک کتاب بھی شامل ہے، یہ سب کتابیں بڑی مقبول ہوئیں اورلوگوں کی زندگیوں میں ان کے ذریعہ بڑا انقلاب آیا، مولانا احتشام الحسن صاحب نے بھی بعض رسائل حضرت مولانا محمدالیاس صاحب کی ایماء پرتحریر فرمائے، ان کا ایک رسالہ مسلمانوں کی پستی کا واحد علاج اس مجموعہ رسائل میں شامل ہے۔

ان کے بعد مولانا محمدالیاس رحمۃ اللہ علیہ کو مظاہرعلوم سہارن پوراورندوۃ العلماء

لکھنؤ اور دارالعلوم دیو بند کے جن فضلاء کا بڑا تعاون ملا ان میں مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبید اللہ بلیاوی، مولانا سعید احمد خاں مکی سہارن پوری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کی کوشش ہوتی کہ وہ ہر اہم اجتماع میں ضرور شریک ہوں اور جہاں کا تقاضا ہو وہاں کا سفر کریں، مولانا کو ان لوگوں کی بڑی قدر تھی۔ اور ان لوگوں کو مولانا سے اور مولانا کے کام اور مشن سے گہرا تعلق تھا۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا مولانا سے تعلق بہت بڑھ گیا، ان کی وجہ سے مجھ جیسے لوگوں کو مولانا کی شفقت حاصل ہوئی، اور میرے لیے دو موقع بڑے قیمتی اور بابرکت تھے جب مجھے مولانا کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ایک تو اس وقت جب مولانا لکھنؤ تشریف لائے اور ہمارے وطن رائے بریلی میں تشریف لے گئے اور دوسرے اس موقع پر جب میرے ماموں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی پشاور کے سفر پر جارہے تھے تو اپنے ساتھ دہلی مجھے لیتے گئے اور وہ مولانا عبدالغفار ندوی صاحب کو ساتھ لے کر آگے پشاور چلے گئے اور مجھے چند دن کے لیے دہلی میں مولانا محمد الیاس صاحب کے پاس چھوڑ گئے، اس وقت بہت قریب سے مولانا کو ان کی جگہ پر دیکھنے کا موقع ملا، اور ان کے دردوسوز، فکر وتڑپ کو دیکھا کہ ان کا ایک ایک لمحہ ملت کے لیے کس طرح وقف ہے، اور اللہ کی رضا جوئی کی کس بے قراری سے ان کو تلاش ہے۔ ملت کے لیے جب ان کے دردوغم کا یہ حال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی نسبت رکھنے والوں کی جب یہ کیفیت ہو، تو صحابہ کا اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال رہا ہوگا۔

انہی ایام میں ان کا ایک سفر میوات غالباً نوح کا تھا اور ایک ہی یکہ اس وقت میسر رہا ہوگا، مولانا محمد یوسف صاحب اور مولانا محمد انعام الحسن صاحب کاندھلوی بھی ساتھ تھے اور مجھے بھی از راہ شفقت ساتھ لے لیا گیا تھا، اس وقت مولانا محمد یوسف صاحب اور مولانا انعام الحسن صاحب پر پڑھنے پڑھانے اور علمی شغل کا غلبہ تھا ان کی اس خصوصیت سے اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کے دردوسوز اور ملت کے لیے فکر وتڑپ کی خصوصیت سے

فائدہ اٹھانے کو ملا۔ اس وقت میری عمر کم تھی ۱۳ یا ۱۴ سال کی رہی ہوگی لیکن شعور کی اور سیکھنے کی عمر تھی، اس لیے اس موقع سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا، اور اس کام کی قدر و منزلت دل میں بیٹھ گئی، پھر جب مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی نے مولانا محمد الیاس صاحب کی وفات کے بعد کام کو سنبھالا اور اس کو عالمگیر وسعت دی تو ۵۰ء میں بلادعربیہ کے سفر میں خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ساتھ جانے کی سعادت حاصل ہوئی، اور اس سفر کی خصوصیت یہ تھی کہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کی سرپرستی میں یہ سفر ہوا تھا۔

جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں کہ مولانا محمد الیاس صاحب نے یہ کام میواتیوں سے شروع کیا تھا، میوات کے تعلق سے مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جو لکھا وہ پیش کیا جا رہا ہے:

> ''میوات کا بڑا علاقہ ہے جو دہلی کے پاس سے لے کر راجپوتانہ کی ریاستوں تک پھیلا ہوا ہے، خیال ہے کہ اس قوم کی آبادی پچاس لاکھ کے قریب ہے، ان کا پیشہ کاشتکاری اور مویشی پالنا ہے، لیکن یہ لوگ حد درجہ لڑاکے، چوری، ڈاکہ اور قتل میں بدنام تھے، کہنے کو تو مسلمان تھے لیکن نام بھی مسلمانوں کا نہیں اور کام بھی نہیں، مولانا نے یہ سمجھ کر کہ یہ سارا فساد ان کی جہالت کے سبب سے ہے، میوات کے پورے علاقہ کا بڑی محنت سے دورہ فرمایا، میلوں پیادہ چل کر بیل گاڑی میں بیٹھ کر، اور جہاں سڑک تھی موٹر پر پورے علاقہ میں سالہا سال پھرتے رہے، جگہ جگہ مسجدوں اور مکتبوں کا انتظام کیا، ہر جگہ وعظ کہا، لوگوں سے ملے، ان کو اپنے سے آشنا کیا، ان کو سمجھایا، ان کو دین بتلایا، کلمہ سکھایا، جو جان چکے اور سیکھ چکے ان کو آگے بڑھایا، ان کو دوسروں کے بتانے اور سکھانے کا کام سپرد کیا، جو اہل نظر آئے ان کو ذکر و فکر کی تلقین کی، جو تعلیم کے قابل معلوم ہوئے ان کو تحصیل علم پر مامور کیا، اخلاص سے کام کرنے والوں کو آس پاس سے بٹورا، ان کو اپنے طرز دعوت سے آشنا کیا، اور ان کو تھوڑی تھوڑی تعداد میں اس شرط کے ساتھ کہ وہ کھانے پینے اور سفر کا کل خرچ اپنی جیب سے کریں

گے، گاؤں گاؤں میں بھیجا، اوراس طرح میوات کی پوری سرزمین، مخلص مبلغ سپاہیوں کا کیمپ بن گئی اور چند سال کے بعد ڈاکوؤں اور چوروں کا جرائم پیشہ گروہ نیک صالح اور دیندار مسلمانوں کی جماعت بن گئی، یہ حضرت مولانا کی مساعی جمیلہ کی وہ کرامت ہے جس کو پولیس کی سرکاری رپورٹ میں بھی صحیح مان کراور جرائم پیشہ گروہ سے وہ خارج قرار دیا گیا۔"

جہاں تک مولانا کے انداز دعوت کا تعلق ہے، اس کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا کا طریق دعوت بالکل سادہ تھا، سراپا اخلاص تھے، سراپا درد تھے، دین کے سچے غمخوار اور مسلمانوں کے بدل خدمت گزار، اللہ پر متوکل، ایک دھن تھی کہ دن رات ان کو بے قرار رکھتی تھی، ان کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا جو تھا وہ صرف دین کی خدمت اور مسلمانوں کی غمخواری اور اصلاح کی فکر تھی، یہی ان کی تقریر تھی، یہی ان کی گفتگو اور اسی کا شب و روز ملنے جلنے والوں سے اعلان واظہار۔"

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ جوان کے عصر کے بڑے علماء میں تھے اور بڑی شہرت رکھتے تھے، اپنی پہلی ملاقات کا تاثر اس طرح بیان کرتے ہیں:

"مولانا نے فوراً اپنی تبلیغ کی تقریر شروع کر دی اور ان کو اپنے کام میں شرکت کی دعوت بڑے اصرار والحاح سے فرماتے رہے، اور اپنے طریق دعوت کی توضیح بھی بیان فرماتے رہے اور وہ مجھ سے بالکل ناآشنا تھے، اور میں ان کے نام اور کام سے آشنا، مگر خود ان کی حقیقت سے ناآشنا تھا، میں ان کی باتوں کو چپ سنتا رہا، آخر میں یہ عرض کی کہ حضرت ایسے لوگوں کو جو صرف دو چار دن آپ کی صحبت میں رہے ان کو تزکیہ اور تصفیہ کے بغیر مبلغ بنا کر بھیجنا کیونکر مفید ہوگا، فرمایا، مکتوبات مجدد الف ثانی پڑھیے، معلوم ہو جائے گا، دوبارہ عرض کی، میں نے ان کو پڑھا ہے، مگر ان سے تو اس

مشکل کا حل معلوم نہ ہوا، شاید مولانا کو کچھ اچنبھا سا ہوا، مولانا ظفر صاحب سے پوچھا آپ کون ہیں، انھوں نے میرا نام لیا تو خوشی سے اُچھل پڑے، کھڑے ہو گئے سینہ سے لگایا اور مجبور کیا کہ انہی کے ساتھ انہی کے ڈبہ میں سکنڈ کلاس میں سفر کروں، میرا ٹکٹ بدلوایا اور اس وقت سے لے کر کاندھلہ تک برابر ڈیڑھ دو گھنٹہ بڑے جوش وخروش سے کلام فرماتے رہے، ان کی زبان میں لکنت تھی، تقریر پر قادر نہ تھے، تقریر بھی الجھی ہوئی ہوتی تھی مگر جوش وخروش کا سمندر ان کے سارے خس وخاشاک کو بہائے لیے جاتا تھا، تھوڑی گفتگو کے بعد ؎

واہ ری تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا وہ بھی میرے دل میں ہے

جسمانی کمزوری اور ضعف سینہ کے باوجود ان کے پھیپھڑے ان کی پُر زور تقریر اور پر جوش گفتگو کے تسلسل اور تواتر کے سبب سے ہر وقت اس طرح اُبھر اُبھر کر اٹھتے تھے کہ مجھے تو ڈر لگتا تھا کہ کہیں یہ پھٹ نہ جائیں، یا گلے کی رگیں جو بار بار پھول پھول جاتی تھیں وہ نہ پھٹ جائیں، یہ سب سہی مگر دریا اپنی روانی میں ہر خطرے سے بے خبر اور ہر اُفتاد سے بے پرواتھا۔"

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح لکھا ہے کہ:

"زیادہ دیکھنے والوں اور بار بار ملنے والوں کو تو خدا جانے ان کی کیا کیا ادائیں پسند ہوں گی، لیکن مجھے اس تھوڑی سی ملاقات میں ان کی تین ادائیں بہت پسند آئیں، صبح کی نماز کے بعد مقتدیوں کے رُخ بیٹھ کر وہ کام کرنے والوں کو دین کا کام سمجھاتے تھے، اور بار بار ان کی کامیابی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں فرماتے تھے، ان دعاؤں میں لفظ اللہ ان کے دل کی گہرائی سے نکل کر دوسروں کے دلوں کی گہرائی میں گھر کر لیتا تھا، ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد، مختلف اوقات میں ان کی زبان سے کسی قدر آواز

میں یہ دعائے ماثورہ "یاحی یاقیوم برحمتك استغیث اصلح لی شانی کلہ ولاتکلنی الیٰ نفسی طرفة عین" (اے حی وقیوم خدا! میں تیری رحمت سے چاہتا ہوں کہ تو میری فریاد کو سنے، تو میری حالت کی درستی فرمادے اور ایک لمحہ کے لیے بھی مجھے میرے نفس پر نہ چھوڑے) نکلتی تھی اور ان کے فقر والتجاء دلی کی اس کیفیت کو ظاہر کرتی تھی۔"

بستی نظام الدین بنگلہ والی مسجد میں دعوت وتبلیغ کا عالمی مرکز قائم ہوا، وہاں کے دینی ماحول میں جو شخص تھوڑا وقت بھی گزار لیتا، اس کی زندگی ایمان کی حلاوت پالیتی، لیکن مستقل وہاں قیام جماعتوں کا نہیں رہتا، بلکہ جماعتیں کچھ وقت قیام کے بعد دوسرے علاقوں میں کام کے لیے بھیج دی جاتیں۔

نظام الدین کا حال یہ ہوتا کہ جیسا کہ میرے مشاہدے میں بھی آیا، اور آج بھی اس کے اثرات قائم ہیں کہ یہی مبلغ جو دن کے سپاہی ہوتے رات کے راہب بن جاتے فرساناً بالنهار رهباناً بالليل کی تصویر ہوتے۔ ہر طرف سے تہجد گزاروں، ذاکروں اور تسبیح خوانوں کی آوازیں بلند ہوتی تھیں، کوئی سجدہ میں ہوتا تھا تو کوئی رکوع میں، کوئی گریہ وبکا میں تھا تو کوئی دعاؤں میں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سچائی کا ایک آفتاب کیونکر متعدد ذرّوں کو اپنے پاس کھینچ کر روشن بنادیتا ہے۔

مولانا کا جسمانی ضعف، پھر شب وروز کی یہ محنت، اور دعوت کے کاموں میں ہمہ وقت کا یہ شدید انہاک، اور آرام وراحت کی ہر تدبیر سے کامل اعراض نے ادھر ان کو ضعیف بنادیا تھا، مہینوں سے پیچش اور اسہال کا عارض پیدا کردیا تھا اور ضعف روز بروز بڑھتا جاتا تھا، ہر علاج ناکام رہا مگر اس حالت میں بھی کام کے انہاک اور دعوت کے جوش کا وہی عالم تھا، آخر میں تو نشست وبرخاست دشوار ہوگئی تھی، سہارے سے اٹھتے بیٹھتے تھے مگر اس حالت میں بھی نماز باجماعت کا اہتمام اخیر اخیر تک رہا، بلکہ فرض نماز کھڑے ہوکر ادا فرماتے رہے اور خدا جانے اس وقت ان کے اندر کہاں سے طاقت آجاتی تھی۔

خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت میں یہ سب کچھ پوری تفصیل سے بیان کیا اور مزید مولانا کے دردوسوز اور کام کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے ان خطوط کا مطالعہ بھی مفید ہے جو مکاتیب مولانا محمد الیاس کے نام سے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے مرتب فرمائی ہے۔

افسوس کہ حضرت مولانا نے ۲۱ رجب ۱۳۶۳ھ (۱۳ جولائی ۱۹۴۴ء) کو وفات پائی، اور اسی مقام بستی نظام الدین کی مسجد کے صحن کے باہر جنوبی و مشرقی گوشہ میں اپنے والد و برادر معظمؒ کے پہلو میں سپرد خاک ہوئے۔

مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی

۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء تا ۱۴۰۵ھ ۱۹۸۴ء

افسوس کہ ہندوستان کے ایک ممتاز عالم دین مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل نے شوال کی ٦ تاریخ کو اپنے وطن مؤناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ میں اس دار فانی سے انتقال کیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا نے اپنے پیچھے تین اہل علم صاحبزادگان اور ہزاروں شاگردوں کی تعداد چھوڑی، مولانا محمد ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ الٰہ داد پور مؤ ضلع اعظم گڑھ کے علمی خاندان کے فرد تھے، ان کے والد ماجد مولانا صابر صاحب اور جد امجد شیخ محمد احمد صاحب مشہور اہل علم و مدرسین میں سے گزرے ہیں، مولانا مرحوم ۱۳۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور تعلیم اپنے جوار کی مشہور دینی تعلیم گاہ مظہر العلوم بنارس میں حاصل کی، پھر دیوبند تشریف لے گئے اور وہاں تعلیم مکمل کی، درمیان میں علی گڑھ میں مشہور استاد معقولات و حدیث مولانا ماجد علی صاحب جونپوری سے بھی استفادہ کیا۔

مولانا مرحوم نے لاہور میں فاضل کرنے کا قصد بھی کیا تھا، لیکن خلافت تحریک کا زمانہ تھا، اس تحریک سے مولانا نے وابستگی اختیار کی، بعد میں علمی و تعلیمی مشغلہ اختیار کرتے ہوئے تدریس حدیث کو موضوع بنایا، اولاً کلکتہ ہی کے ایک مدرسہ میں چند سال، پھر ایک دوسری جگہ تدریس حدیث کے بعد مؤ کے مشہور جامعہ مفتاح العلوم آئے اور وہاں تدریس حدیث میں ۳۵ سال کی طویل مدت گزاری اس اثناء میں وہ شیخ الحدیث رہے اور ایک طویل مدت تک نظامت کے فرائض انجام دیئے ۱۳۸۱ھ میں ندوۃ العلماء کو مولانا مرحوم کی

خدمت تدریس حدیث حاصل ہوئیں، اور دو سال شیخ الحدیث کے منصب کو پُر رکھا، پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے جہاں ۲۱ سال شیخ الحدیث رہنے کے بعد اپنے وطن میں سالانہ رخصت کے وقت وفات پائی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ مولانا مرحوم کی شخصیت کا علمی خاکہ تھا جہاں تک صفات واخلاق کا تعلق ہے تو اس میں بھی مولانا مرحوم کا پایہ خاصہ بلند تھا، وہ بڑے نرم خو، تہذیب وخوش خلقی کا نمونہ تھے، ان کی گفتگو اور بات چیت دلوں کو متوجہ کرنے والی ہوتیں، چھوٹوں کے ساتھ خاص شفقت اور ہم عصروں سے تعلق خاطر کے ساتھ پیش آتے چونکہ علم وتعلیم سے مولانا کا طویل اشتغال رہا، لہٰذا علم وتعلیم سے مزاجی مناسبت پیدا ہوگئی تھی وہ ان کی زندگی کا پسندیدہ مشغلہ بن گیا تھا۔

مولانا مرحوم کو دیوبند کے زمانہ تعلیم میں سابق مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی رفاقت حاصل رہی، مولانا مرحوم نے تین صاحبزادگان چھوڑے ہیں، مولانا حکیم عزیز الرحمٰن، مولانا سعید الرحمٰن، اور ڈاکٹر مسیح الرحمٰن ان تینوں حضرات نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور تینوں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے اسوہ ہی کے مطابق تعلیم کو مشغلہ بنایا، اول الذکر نے علم دین کے ساتھ علم الصحۃ میں کمال پیدا کیا اور دارالعلوم دیوبند کے جامعہ طب کے بڑے استاد رہے، ثانی الذکر ندوۃ العلماء میں ادب کے بڑے استاد، مہتمم اور اس کے مقبول عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے مدیر ہیں، اور تیسرے صاحبزادے شبلی ڈگری کالج میں استاد ہیں۔

مولانا مرحوم نے اشتغال علم کی ایک سنہری اور منہمک زندگی گزاری جو محبین علم دین کے لیے قابل استفادہ ونقل ہے کہ زندگی کے آخری لمحات تک اور باوجود مقتضائے عمر کمزور وضعیف ہوجانے کے علم وتعلیم سے وابستگی، استقلال وتوجہ کے ساتھ قائم رکھی اس کے ساتھ اہل علم کا سنجیدہ اور باوقار اخلاق وانداز رکھا کہ ان کی ملاقات ومجلس سے لوگوں کو مسرت وفائدہ حاصل ہوتا تھا۔

مولانا مرحوم اب ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کے اخلاق واشتغال علم وتعلیم ہمارے لیے قابل استفادہ سرمایہ ہے اور ہم ان کے لیے جو کر سکتے ہیں وہ اب ان کے لیے ایصا ثوال ودعا واجر ومغفرت ہے ہم دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے اور عفو ومغفرت سے نوازے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مولانا محمد عاشق الٰہی (برنی) بلندشہری

۱۳۴۴ھ ۱۹۲۵ء تا ۱۴۲۲ھ ۲۰۰۱ء

گزشتہ ماہ رمضان المبارک میں ایک اہم دینی وعلمی شخصیت اور صاحب تصنیف وتحقیق عالم، فقیہ، محدث ومفسر قرآن مولانا مفتی عاشق الٰہی بلندشہری مہاجر مدنی نے مدینہ منورہ میں مختصر علالت کے بعد وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

مولانا کی کچھ دنوں سے طبیعت ناساز چل رہی تھی جس کی وجہ سے ان کو اسپتال بھی لے جانا پڑا اور پھر صحت معمول پر آگئی اور وہ اپنے اس مکان میں مقیم ہوگئے جو رمضان المبارک میں مسجد نبوی کے قریب لے لیا کرتے تھے، اور وہیں انہوں نے ۱۳؍رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۸؍نومبر ۲۰۰۱ء کو داعی اجل کو لبیک کہا اور دیار حبیب سے سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ تراویح کے بعد مسجد نبوی (علی صاحبہ الف الف تحیۃ وسلام) میں اس وقت کے امام شیخ حسین بن عبدالعزیز آل الشیخ نے نماز پڑھائی اور جنت البقیع میں جس کے شوق ومحبت میں وہ ایک ایک دن گن رہے تھے اور دوسری جگہوں کے سفر بھی کم اور بہت مشکل سے کرتے تھے سپرد خاک کردیئے گئے۔

مولانا مفتی عاشق الٰہی بلندشہری، ہمارے صوبہ اتر پردیش کے علاقہ ضلع بلندشہر میں ۱۳۴۳ای؍مطابق ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے، قرآن مجید حفظ کیا اور پھر ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں مولانا محمد صادق سے حاصل کی، پھر علاقہ سے باہر دوسرے مدارس میں ثانوی تعلیم حاصل کی، جامعہ مظاہر علوم سہارن پور میں آپ کی تعلیمی مدت تین سال رہی، مولانا

مفتی سعید احمد صاحب اجراڑوی، مولانا شاہ اسعد اللہ صاحب رام پوری اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی مہاجر مدنیؒ آپ کے ان اساتذہ وشیوخ میں ہیں جن سے آپ کو آخر تک بڑا خصوصی تعلق رہا، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے مدینہ منورہ میں قیام کے اشتراک کی وجہ سے زیادہ نمایاں ہوا، اور حضرت شیخ کی انھیں توجہات وعنایات خوب حاصل ہوئیں۔

مظاہر علوم سہارن پور میں وہ ہمارے برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے دورۂ حدیث کے سال میں رفیق درس رہے تھے اس تعلق سے مجھے بھی ان سے انس وتعلق تھا اور وہ ہمیں اپنے بڑے بھائی کی طرح محسوس ہوتے تھے اور انھیں بھی اس نسبت کا خیال رہتا تھا، اور خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کا تعلق تکریم وتوقیر کا اور نیاز مندانہ ہوتا، اور مدینہ منورہ کی حاضری کے موقع پر ملاقاتیں ہوتیں اور وہ اپنی تحقیقات وتصنیفات سے بھی نوازتے۔ ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فضلاء میں سے بعض ان سے وابستہ ہوئے اور انہوں نے ان کے سایۂ عاطفت میں علمی ترقی بھی کی جن میں مولوی جاوید اشرف ندوی میرٹھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور وہ مدینہ منورہ میں ہی مقیم ہیں۔

مولانا کو اللہ نے شروع سے شوق عبادت واتباع سنت اور ذوق دعا اور تصنیفی وتحقیقی مزاج سے نوازا تھا، چنانچہ ان کے قلم سے جو کتابیں شروع میں آئیں ان میں ان کی مرتب کردہ مسنون دعائیں بہت مقبول ہوئیں، اسی طرح تبلیغی جماعت کے چھ اصولوں پر کتاب ''چھ باتیں'' اور تذکیر بالآخرت پر کتاب ''مرنے کے بعد کیا ہوگا؟'' بہت مقبول ہوئیں اور آج بھی ان کو بہت مقبولیت حاصل ہے اور ان کتابوں کے ایڈیشن پر ایڈیشن نکلتے رہتے ہیں، اسی طرح ''تحفۂ خواتین'' عورتوں کی تربیت ورہنمائی کے لئے لکھی، جو بہت سے ان مدارس کے نصاب میں بھی داخل ہے جو لڑکیوں کی تعلیم کے لئے خاص ہیں، یہ آپ کی وہ کتابیں ہیں عوام الناس کے حلقوں میں جن کی بڑی پذیرائی ہوئی اور

علماء وطلبہ کے لئے آپ کی تصنیفی خدمات میں حدیث وفقہ کے موضوعات پر وہ اہم کتابیں جو مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں اور آپ کا آخری بڑا علمی ودینی کارنامہ قرآن مجید کی خدمت ہے جو اس کی تفسیر لکھ کر انجام دیا اور وہ کئی ضخیم جلدوں میں طبع ہو کر آئی اور آپ کی زندگی میں ہی اس کے دوسری زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے، یہ تفسیر ''انوار البیان فی کشف اسرار القرآن'' کے نام سے ہے جو آپ نے اردو میں لکھی اور انگریزی، فرانسیسی، بنگلہ زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں، فتنوں کے تعاقب پر بھی رسائل وکتب تصنیف کئے، جیسے قادیانیت، شیعیت اور وحدت ادیان کا نظریہ وغیرہ اور فتاویٰ کا کام ہے جو ''انوار الفتاویٰ'' کے نام سے طبع ہو رہا ہے اور کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ اکثر تصنیفات اردو میں ہیں بعض عربی میں تصنیف کیں جو اکثر حدیث اور علوم حدیث سے متعلق ہیں، ایک تاثراتی مضمون میں ان کی ساری تصنیفات کا جائزہ پیش کیا جا سکتا ہے جو ستر سے زائد ہیں اور ان کی چھتر سالہ زندگی کی جہد مسلسل کا نتیجہ ہیں۔

ان کی عملی زندگی کو تین حصوں اور تین مقامات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلا تعلیم ودعوتی دور ہے جو ہندوستان میں گزرا، وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد تبلیغی جماعت سے وابستہ ہو گئے تھے اور اسی زمانہ میں اپنے دہلی کے قیام سے تصنیفی کام کا بھی آغاز کر دیا تھا، دوسرا دور تدریسی دور ہے جو پورے انہماک کے ساتھ انہوں نے پاکستان ہجرت کے عمل سے اختیار کیا اور دار العلوم کراچی میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں گزارا، تیسرا دور تصنیف وتالیف وتحقیق کے کام میں یکسوئی کا ہے جو مدینہ منورہ ہجرت کر کے گزارا اور علمی توجیہات اور دینی ارشاد وتربیت کا بھی عمل جاری رکھا، اس مبارک اور مشغول زندگی کے ساتھ انہوں نے سفر آخرت اختیار کیا۔

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات وحسنات کو قبول فرمائے اور اونچے مراتب پر فائز کرے، اور ان کے صاحبزادگان وپسماندگان کو ان کے نقش قدم پر رکھے۔ آمین۔

شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری

۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء تا ۱۴۳۸ھ ۲۰۱۷ء

ہمارے بزرگ اسلاف وعلماء نے اس ملک کو اپنی علمی ودینی کوششوں سے اسلامی رنگ وروپ دینے کی بڑی حد تک جو کامیاب کوشش کی، اسلامی تشخص اور شریعت اسلامی کے وجود کے لئے جب ان کو بہت خطرہ محسوس ہوا، تو اس کے تدارک کے لیے ان کے دانشوروں اور علماء دین کی نظر میں جو شکل سب سے زیادہ کارگر محسوس ہوئی، وہ یہ تھی کہ اہل غیرت مسلمانوں کے جذبہ کو متحرک کریں اور اسلام کی اعلیٰ قدروں کے پابند ہونے کی پیشکش کریں اور اس کی تقویت کے لیے، علوم شریعت کی تعلیم کو قائم رکھنے کے لیے تدریسی نظام کا بندوبست کریں، ظاہر ہے کہ ان کے پاس اس کے لیے صرف عوامی تعاون ہی کا ذریعہ تھا کیونکہ یہ اصحاب اقتدار کی مرضی کے بالکل خلاف ہونے کی وجہ سے ان سے کسی ہمدردی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

اہل عزیمت وہمت علماء دین نے جن میں سرخیل مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے، زمانہ کے بدلتے تیور کو بھانپ کر حکمت عملی کے تحت سب سے پہلے سہارنپور کے ایک قصبہ دیوبند میں مدرسہ عربیہ دارالعلوم کے نام سے مدرسہ قائم کیا اور وہاں ایک استاد اور ایک شاگرد جو دونوں محمود تھے اور وہ دن بھی ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں بڑا محمود تھا، مدرسہ کا آغاز ایک انار کے درخت کے نیچے ہوا، اور اسی کے طرز پر سہارنپور میں چند جیالے جو دین اسلام کے لیے ہر وقت فکرمند رہتے تھے اور ہندوستان میں اسلام کی بقاء کے لیے مدرسوں کا وجود ناگزیر سمجھتے تھے

مدرسہ مظاہر علوم نام کا جامعہ قائم کیا، مولانا سعادت علی (۱) ان لوگوں میں سرفہرست تھے جنہیں اس تعلیمی ادارہ کے قیام وتاسیس کی توفیق ملی، پہلے انہوں نے اپنے گھر میں تعلیم دینا شروع کیا، پھر ایک مسجد میں باقاعدہ ماہ رجب ۱۲۸۳ھ کو شروع کیا گیا، مولانا سعادت علی سہارنپوریؒ امیر المومنین حضرت سید احمد شہید کی جماعت کے ایک فرد تھے، دیگر حضرات میں مولانا محمد مظہر نانوتویؒ، مولانا احمد علی سہارنپوریؒ محدث اور حکیم سید احمد حسین سہارنپوریؒ وغیرہ تھے۔

ان دونوں جامعات کا مقصد اور مطمح نظر ایک تھا، تحفظ شریعت واحکام دین کی حفاظت کے اس اقدام کو بہت پسند کیا گیا اور دونوں اداروں کو بڑے ربانی اور مخلص علماء حق کی درس وتدریس اور انتظام وانصرام کے کام کے لیے مخلصانہ خدمات حاصل ہوئیں اور پھر یہ تسلسل زمانہ علماء دین کی ایک تعداد امت مسلمہ کو دین سے واقف کرانے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ان کے اخلاق وعادات کو سنوارنے کے لیے ملنے لگی۔

مظاہر علوم کا طرز دارالعلوم دیوبند سے قریب تر رہا، مگر دارالعلوم دیوبند کے مقابلہ میں اپنے مخصوص دائرہ میں کاربند رہتے ہوئے تعلیم وتربیت کا کام کیا جاتا رہا۔ یہاں کے ذمہ دار حضرات اور اساتذہ نے ایک طرف تو علوم دینیہ کی بڑی خدمت کی، دوسری طرف اسلامی اخلاق اور دینداری کو پیدا کرنے کی طرف مزید یکسوئی کے ساتھ توجہ کی، چنانچہ ان دونوں پہلوؤں میں مظاہر علوم کا اچھا کام سامنے آیا، جو دارالعلوم دیوبند ہی کی طرح تھا،

(۱) اس سے مولانا سعادت علی سہارنپوری مراد ہیں، جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے مخصوص افراد میں ہونے کے باوصف مسلم الثبوت فقہاء میں سے تھے، فقیہ سہارنپور آپ کا لقب تھا، علم کے شائق اور دلدادہ تھے، جہاد سے واپس آکر تعلیم دینے میں لگ گئے، متفرق جگہوں کے طلباء آپ سے آکر کسب فیض کرتے، اوران کے اخراجات آپ ہی کے ذمہ ہوتے تھے، آپ کی بڑی تمنا تھی کہ سہارنپور میں کوئی بڑا دینی مدرسہ قائم کیا جائے، آخر کار ان کی تمنا رنگ لائی، اور مظاہر علوم کا آغاز ایک مکتب کی حیثیت سے محلّہ قاضی میں چوک کی مسجد میں ہوگیا، حضرت مولانا سعادت علی اسی مسجد میں نماز پنج گانہ ادا کرتے تھے، ۱۲۸۶ھ میں جب کہ مظاہر علوم اپنی عمر کے چوتھے سال میں تھا مولانا کا وصال ہوا، اسی میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مولانا مظہر نانوتوی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے درس دیا، اور آخر میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے دور میں اس کی شہرت چہار دانگ عالم میں ہوئی۔ (علماء مظاہر علوم سہارنپور، ص۔۷۰۔۷۱)

لیکن بعض حیثیتوں سے اپنی علاحدہ انفرادیت رکھتا رہا، حدیث شریف کی علمی خدمت اور اس کی تعلیمات کے مطابق طلباء اور عامۃ المسلمین کے اخلاق و سیرت سازی کی طرف توجہ نمایاں رہی۔

حدیث شریف کی علمی خدمات میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ، حضرت مولانا محمد یحیٰ صاحب کاندھلویؒ اور موجودہ عہد میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے جید عالم دین اور عظیم محدث تھے اور اپنے شیخ اور استاد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے جانشین کے طور پر مظاہر علوم کے شیخ الحدیث ہوئے اور تدریس حدیث اور خدمت علوم حدیث میں امتیازی شان کے مالک ہوئے اور اپنے والد معظم مولانا محمد یحیٰ کاندھلویؒ کی امتیازی خصوصیات کے بھی وارث ہوئے، سنن ابی داؤد کی عظیم شرح "بذل المجہود" کی تصنیف میں اپنے شیخ واستاذ معظم مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کے ساتھ وقیع تعاون کیا جس سے یہ شرح دیگر شروح میں خصوصی اہمیت وافادیت کی حامل بنی، اس کے علاوہ حدیث وعلوم حدیث کے سلسلہ میں کئی وقیع تصانیف تیار کیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ مولانا خلیل احمد صاحب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں "حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے تحقیق ومطالعہ، تصنیف وتالیف، عبادت وریاضت میں طاقت سے زیادہ اپنے اوپر بوجھ ڈالا تھا، جس کی وجہ سے آپ کے قویٰ میں کمزوری لاحق ہوئی اور صحت متاثر رہنے لگی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ ایک بڑی مخلوق کو فائدہ پہنچایا اور آپ کی کوشش وتربیت کے نتیجہ میں علماء ومشائخ اور مصلحین ومرشدین کی ایک جماعت تیار ہوگئی، جس کے ہاتھوں ہندوستان میں علوم دینیہ کی اشاعت، عقائد کی تصحیح، معاشرہ کی اصلاح اور دعوت وتبلیغ کا بڑا کام ہوا۔ ان حضرات میں سب سے نمایاں نام تبلیغی جماعت کے بانی اور ہندوستان کے عظیم مصلح مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ دوسرا مشہور نام شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا۔"

(بصائر صفحہ ۱۳۱۔ از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)

اوران کے اخص الخاص رفقاء حدیث میں اہم نام شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ کے والد ماجد مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، ان کا بھی علم حدیث کی خدمت میں بڑا حصہ رہا۔ انہوں نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے سنن ترمذی کے افادت وعلمی نکات کو ضبط تحریر میں لاکر حدیث شریف کی ایک بڑی خدمت انجام دی، جسے ان کے صاحبزادے مولانا محمد زکریا صاحب ''الکوکب الدری'' کے نام سے اپنی تحقیق کے ساتھ منظر عام پر لائے۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مظاہر علوم میں حدیث شریف کی تدریس معیاری انداز سے انجام دی اور پھر صاحبزاہ مولانا محمد زکریا صاحب کو اعلیٰ صفات واخلاق سے متصف کیا اور حدیث شریف میں خصوصی امتیاز ورسوخ پیدا کرنے کی طرف توجہ دلائی، یہ خود ان کا ایک اہم کارنامہ اور حدیث شریف کی بڑی خدمت تھی۔ چنانچہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد کے استاد وشیخ جوان کے بھی استاد وشیخ ہوئے، حضرت مولانا خلیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی استفادہ کیا اور ان کی وہ توجہات حاصل کیں، جن میں دوسرا ان کا شریک وسہیم نہ ہوسکا۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں ان کی قائم مقامی ملی۔ حضرت سہارنپوریؒ نے ان کی بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کو دیکھ کر ان کو اپنی علمی خدمت اور حدیث شریف کے کام میں اپنا معاون بنالیا اور حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے اس معاونت کو اعلیٰ معیار پر اختیار کیا اور اپنے استاذ کے اس عظیم کام میں جسے وہ نہایت عرق ریزی اور دقیقہ رسی سے انجام دے رہے تھے۔ بھرپور تعاون کے ساتھ شرکت کی اور اسی محنت کے نتیجہ میں ''بذل المجهود'' کے نام سے ایک جامع اور کامل شرح منظر عام پر آ گئی۔ اس شرح کو مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری نے اعلی معیار پر اپنی تحقیق کے ساتھ عرب امارات سے شائع کیا ہے۔

اس طرح مظاہر علوم، علوم حدیث اور تصوف وسلوک کے طالبین کے لیے ایک بڑا مرکز بن گیا اور سال بہ سال وہاں طالبان دین وعلم جوق در جوق پہنچنے لگے اور یہ فیض رسانی

کی جو راہ بن گئی تھی وہ ماشاء اللہ جاری ہے۔

مظاہر علوم مختلف پہلوؤں سے دینی اور تربیتی کام میں امت اسلامیہ کے لیے ایک اہم مرکز کی حیثیت کا مالک بنا، جس کے ذریعہ بزرگوں کے طریقۂ تعلیم و تربیت کے سلسلہ کو ان کے جانشین قائم رکھے ہوئے ہیں، خاص طور پر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے متسبین و خلفاء مفید خدمات انجام دے رہے ہیں، اس کو ایک صدی سے زائد طویل مدت کی تاریخ حاصل ہے، جس کی اپنی فیض رسانی کے لحاظ سے شاندار تاریخ بنی ہے۔

حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ بالا علمی و دینی خدمات جن سے جامعہ مظاہر علوم کی شہرت میں بڑا اضافہ ہوا، اپنے پیش روؤں کی خدمات کا امتداد تھا، ان کے پیش روؤں نے مدرسہ کے قیام کے بعد اس کی ترقی اور افادیت کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ اپنی جگہ پر بڑی اہم اور قابل ستائش ہیں۔ ان کے وقت سے فیض رسانی کا جو سلسلہ جاری ہوا، اس کو حضرت مولانا سہارنپوری اور حضرت شیخ الحدیث نے بام عروج تک پہنچایا۔

مظاہر علوم کو اس کے قیام کے وقت ہی سے جید اور عظیم القدر علماء حاصل ہوئے جن میں حضرت مولانا سعادت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو کہ اس کے بانی اور اول مدرس تھے، مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی، مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمہم اللہ تعالیٰ کی خدمات سے اس ادارہ نے تقویت و ترقی حاصل کی۔ اس کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی بھی اسے حاصل رہی۔

مظاہر علوم کی اہم شخصیتوں میں حضرت مولانا احمد علی صاحب کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، ان کے زمانۂ تدریس سے مظاہر علوم کی حدیث شریف کے علم کی مرجعیت و مرکزیت کا آغاز ہونے لگا تھا، حدیث شریف میں آپ کی نمایاں خدمات اور درس کی مقبولیت کا دور دور چرچا تھا، اسی زمانہ میں آپ سے استفادہ کے لیے حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لائے اور ایک سال مکمل قیام کر کے دروس حدیث شریف میں بڑے اہتمام سے

شرکت فرمائی، مظاہر علوم کی شروع کی دیگر شخصیات میں ایک نام مولانا سخاوت علی انبیٹھوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ ان حضرات کے علمی وروحانی فیوض وبرکات سے ملک وبیرون ملک میں نفع عام ہوا۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری، مولانا عبداللطیف سہارنپوری اور مولانا اسعد اللہ صاحب رام پوری رحمہم اللہ تعالیٰ کی تعلیم وتربیت سے مظاہر علوم کی شہرت اوراس کی حسن خدمات کا اعتراف تمام اہل دین کرتے ہیں اوراس کے اثرات آج صرف ہندوستان بلکہ برصغیر ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں یہاں تک کہ امریکہ وافریقہ اور یورپ کے ملکوں میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں، جہاں انہی حضرات سے استفادہ کرنے والے حضرات علم حدیث اوردین کی خدمت میں مصروف عمل ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے صرف علمی شاگرد ہی نہ تھے بلکہ تصوف اورسلوک میں بھی ان کے جانشین ہوئے، اوراس فیض کو بھی جوانہوں نے اپنے استاد سے حاصل کیا تھا، بہت وسیع اوراہمیت رکھنے والے انداز سے جاری کیا، علم حدیث کی خدمت کے پہلو سے وہ مظاہر علوم کے بلند مرتبہ شیخ الحدیث ہوئے اوراس کے ذریعہ انہوں نے اپنے ہزاروں طالبان حدیث شاگردوں میں حدیث کا ذوق اوراس کی خدمت کا شوق پیدا ہوگیا، اورعلمی وتصنیفی پہلو سے خدمت حدیث کا مزید کام انجام دیا اور مؤطا امام مالکؒ کی عظیم الشان شرح تیار کی اور صحیح بخاری شریف کے بعض پہلوؤں پر اورحدیث شریف کے موضوع پر تصنیفات نہایت محققانہ انداز میں تیار کیں۔ دوسری طرف تربیت دینی اورارشاد باطنی کے کام کو وسیع اور موثر انداز میں انجام دیا۔

اس آخری دور کی دیگر اہم شخصیات میں جن حضرات نے علم حدیث کی نمایاں خدمت انجام دیں ایک نام مولانا ظفر احمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ جو حکیم الامت

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے اور جلیل القدر عالم دین تھے، جن کی کتاب ”اعلاء السنن“ حدیث شریف کے موضوع پر بڑی وقیع، فاضلانہ اور بلند پایہ تصنیف ہے، جو شام کے ممتاز جلیل القدر محدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ یہ کتاب بیس جلدوں میں مکمل ہوئی تھی، اس کا مقدمہ ”انہاء السکن“ کے نام سے خود ایک کتاب ہے، جسے شام کے مشہور محقق وفاضل ابوغدہ نے اپنی قیمتی تحقیقات وتعلیقات کے ساتھ ”قواعد فی علوم الحدیث“ کے نام سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ مولانا موصوف کی تفسیر، تصوف، فقہ اور فضائل پر متعدد تصنیفات ہیں۔

دوسرا نام مولانا سید بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، یہ بھی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کے خاص تلامذہ اور مسترشدین میں تھے، آپ کی تصنیفات میں اہم ترین تصنیف ”ترجمان السنۃ“ ہے یہ کتاب چار جلدوں میں ہے، اور اپنے موضوع پر ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، یہ مولانا کے آخری دور کی تصنیف ہے، اس کی چوتھی وآخری جلد مولانا کی وفات کے بعد شائع ہو سکی۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ حدیث نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا ضروری اور مستند ذخیرہ ایک نئی ترتیب اور نئے عنوانات کے تحت اُردو زبان میں منتقل ہوا اور اس ذخیرہ سے متعلق جو مباحث تھے ان سے استفادہ کے لئے اچھے پیرایۂ بیان میں اور جدید ذہنوں کی رعایت کرتے ہوئے تشریحات پیش کی گئی ہیں۔

اسی صف کے دو اہم نام اور ہیں، ایک مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی کا اور دوسرا مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ کا، مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلویؒ کی علم حدیث میں خدمات اہمیت اور قدر وقیمت کی حامل ہیں۔ ”طیب الشذی“ کے نام سے جامع ترمذی کی بڑی عالمانہ شرح لکھی، جس پر علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی تقریظ ہے۔ اس کے علاوہ سنن نسائی اور مؤطا امام مالک پر علمی وتحقیقی حواشی تحریر فرمائے، موطا امام مالک کے رجال پر ایک کتاب ”کشف المغطا عن رجال الموطا“ تصنیف کی۔

مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد اہم اور وقیع کام سامنے آئے، جن میں ''معارف القرآن'' (تفسیر قرآن کریم) اور ''التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح'' کو اچھی شہرت ومقبولیت ملی۔ مولاناؒ کی بخاری کے ابواب وتراجم اور اس کے مشکلات کے حل پر ایک کتاب ''تحفۃ القاری بحل مشکلات البخاری'' بھی ہے۔

بعد کی شخصیات میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ، مولانا عبیداللہ بلیاویؒ اور مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہریؒ کی علم حدیث میں خدمات قابل ذکر ہیں۔ مولانا محمد یوسف صاحب کی ''امانی الأحبار فی شرح معانی الآثار'' سامنے آئی جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ مولانا عبیداللہ صاحب بلیاویؒ نے سنن ترمذی کا اختصار وتلخیص ''تلخیص الترمذی'' کے نام سے مرتب کیا اور طحاوی شریف کی تلخیص واختصار ''تلخیص الطحاوی'' کے نام سے کیا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری مہاجر مدنیؒ نے ''مجالی الأثمار من شرح معانی الآثار'' کی تکمیل تالیف کی اور ''زاد الطالبین من کلام رسول رب العالمین'' کے نام سے حدیث شریف کا ایک قیمتی مجموعہ مرتب کیا۔ اس کے علاوہ حدیث شریف پر اور بھی ان کے کام سامنے آئے۔

مولانا حکیم محمد ایوب صاحب کی کتاب ''تراجم الأحبار فی رجال معانی الآثار'' بھی ایک اہم وقیع کام ہے، اس کے علاوہ بھی حکیم صاحب نے طحاوی سے اعتناء کیا ہے، عربی میں اس کا مختصر حاشیہ بھی لکھا ہے۔ ''تہذیب التہذیب'' پر بھی ان کی بعض تعلیقات وتصنیفات ہیں۔

خوشی ومسرت کی بات ہے کہ مظاہر علوم کو ایسے فاضل اساتذہ اور مربی آج بھی دستیاب ہیں جو نئی نسل کی علمی ودینی تربیت کے کام میں مصروف ہیں اور تحقیقی وتصنیفی ذوق پیدا کرنے کے لئے رہنمائی کر رہے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی وتحقیقی کارناموں کے علاوہ تربیت دینی اور تزکیہ وتصوف کی صفت سے بھی ہزاروں ہزار لوگوں کو نفع

پہنچا۔حدیث شریف کے باقاعدہ درس کے علاوہ مسلسلات کے درس کا بھی اہتمام سال میں ایک بار ہوتا تھا، جس میں جامعہ کے طلباء کے علاوہ دیگر جامعات کے علماء واعیان شریک ہوتے اور ہر سال ہزاروں کو شرف تلمذ حاصل ہوتا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ جو دوسری جگہوں پر رہ کر علم حدیث کی خدمت انجام دے رہے ہیں، ان میں فاضل گرامی مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب اعظمی مظاہری ندوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں حدیث شریف سے مناسبت پیدا کی اور ''بذل المجهود في شرح سنن ابی داؤد'' اور ''أو جز المسالك شرح موطا لامام مالك'' کو تحقیق کے ساتھ شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ اس کے ساتھ ایک اچھا تصنیفی ذخیرہ بھی حدیث شریف کے تعلق سے پیش کیا ہے۔

مظاہر علوم کی مسند درس حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے اپنے ہی عزیز اور معتمد شاگرد حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ کے حوالہ کر کے ایک مثال قائم کی اور یہ توقع بھی کی کہ وہ ان سے لمبی مدت تک اس مسند سے اس فیضان کو عام کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ انہوں نے پچاس سال سے زیادہ حدیث شریف کی تدریس اور پورے پچاس سال بخاری کے درس کی خدمت انجام دی اور گہرے اور وسیع مطالعہ، مزید اپنی قوت یادداشت اور ذہانت، اپنے سلسلہ تعلیم وتعلم اور سلسلہ اصلاح وتربیت کی برکت کے نتیجہ میں وہ مقام حاصل کیا کہ دوسرے مکاتب فکر کے علماء اور بلاد عربیہ کے طالبین علم حدیث اور علماء نے بھی ان کی طرف رجوع کیا، اور انہوں نے حدیث شریف سے شغف، اس کے مطالعہ میں یکسوئی اور انہماک کے نتیجہ میں جو رسوخ وتبحر پیدا کر لیا تھا، وہ مقام بھی حاصل کیا تھا کہ روایت حدیث کے سلسلہ میں ان کی رائے کو بہت اہمیت دی جانے لگی تھی، اس کی وجہ سے اور اس کے ساتھ انہیں جو مصلحانہ اور مربیانہ کردار حاصل تھا ان کی وفات کا سانحہ بہت محسوس کیا گیا، خاص طور سے علمی حلقوں نے اس کو بہت اہمیت دی اور اپنے مضامین اور مقالات اور تاثرات کے ذریعہ

انہیں اچھا خراج عقیدت پیش کیا اور واقعی یہ بہت محسوس کیے جانے والا خلا ہے جو سامنے آیا۔

(مولانا پیر کے روز رجب المرجب ۱۳۵۵ھ میں شہر جونپور میں پیدا ہوئے، بچپن میں ہی والدہ کا انتقال ہوا، تو ان کی نانی جو ایک خدا رسیدہ خاتون تھی آپ کی پرورش کی، آپ کے والد ایک ولی صفت انسان تھی، ہمیشہ عبادت و ذکر میں مشغول رہتے تھے، شیخ نے اپنے گھر میں ابتدائی لکھنا پڑھنا سیکھا، اور جونپور کے دیہات مانی کلا میں واقع مدرسہ ضیاء العلوم سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز کیا۔ وہاں سے مظاہر العلوم سہارنپور آئے، اور تین سال تک تعلیم حاصل کی، شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے خصوصی استفادہ کیا اور شیخ کی بھرپور توجہ حاصل کی، مظاہر العلوم سے فارغ ہو کر ۱۳۸۱ھ میں آپ وہیں مدرس ہوئے، اور کئی سال تک فقہ واصول فقہ کی تعلیم دی، پھر احادیث کی بعض کتابیں آپ کے حوالے کی گئیں، شیخ الحدیث کے مدینہ ہجرت کرنے جانے کے بعد ۱۳۸۸ھ میں آپ کو باقاعدہ بخاری کی مسند درس ملی، اور پچاس سال تک آپ نے بخاری کا درس دیا۔

حضرت شیخ الحدیث سے بیعت ہو کر سلوک کے منازل طے کیے، مولانا اسعد اللہ صاحب کی طرف سے آپ کو اجازت ملی، پھر حضرت شیخ نے بھی اجازت سے نوازا۔

مولانا عرصہ سے متعدد امراض کا شکار تھے، اور مسلسل تکالیف سے دوچار رہتے تھے، امراض میں ایک سحر کا مرض بھی تھا، بسا اوقات آپ کی تکلیف میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا، جو آپ کے لیے ناقابل برداشت ہوتا، لیکن کبھی بھی آپ نے اس پر زبان مبارک سے شکوہ نہیں کیا، اس تکلیف کی وجہ سے کئی کئی راتیں بیداری کی حالت میں گذارنی پڑتیں، پھر بھی سبق کا ناغہ نہیں کرتے تھے، ۱۴۲۶ھ میں آپ کو دل کا دورہ پڑا، اور دہلی میں علاج کی غرض سے رہے، وفات سے دو سال قبل مدینہ منورہ میں آپ کی حالت بہت نازک ہوگئی تھی، آپ اس حالت میں کئی بار کہتے تھے کہ مجھے سہارنپور لے چلو، لیکن کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ ایسی نازک حالت میں آپ کو لے کر سفر کرایا جائے، بلکہ سب لوگ سمجھتے تھے کہ اب یہ آخری وقت ہے، اس وقت حضرت نے فرمایا، میں ابھی نہیں مروں گا، اللہ تعالیٰ سے دو سال مانگ لیے ہیں، اس کے

بعد دو سال میں آپ نے دو حج کیے، مدینہ منورہ سے ممبئی میں ملت اسپتال میں آپ کو رکھا گیا، اور وہاں مسلسل ڈایالیسس پر آپ رہے، اسی دوران مولانا رابع صاحب، مولانا واضح صاحب اور راقم نے بھی حضرت کی عیادت کی، پھر آپ سہارنپور چلے گئے، وہاں ایک بار بھی آپ کو اس علاج کی ضرورت پیش نہ آئی۔

شوال میں مدرسہ شروع ہونے پر دعا بھی کرائی، اس کے بعد سے غنودگی کی کیفیات میں اضافہ ہوتا گیا، ۱۶ شوال کی فجر کو غشی کی کیفیت میں اضافہ ہوتا گیا، اسپتال لے جایا گیا تو ڈاکٹروں نے وفات کی اطلاع دی، بروز منگل ۱۶ شوال ۱۴۳۸ھ، ۱۱ جولائی ۲۰۱۷ء عمر عزیز کی ۸۳ بہاریں گزار کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

مولانا ستودہ صفات کے حامل تھے، اور سب سے عمدہ صفت آپ کی عاجزی و انکساری تھی، آپ تصنع و بناوٹ سے کوسوں دور تھے، اور آپ کے یہاں کروفر نام کی کوئی چیز نہ تھی، اتنے اونچے درجے اور مرتبہ پر فائز ہونے کے باوجود اپنی غربت وغیرہ کے واقعات برملا اور بلا جھجک سنایا کرتے تھے، ایک مرتبہ دوران درس فرمایا ''بچو! کپڑے دھونے کو صابن کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے، جہاں طلبہ کپڑے دھوتے، تو اس سے آگے جا کر بیٹھ جاتا، ان کے کپڑوں سے صابن کا جو پانی آتا، اس سے کپڑے دھوتا۔

حضرت کے تقوے کا یہ عالم تھا کہ مدرسہ کے خلفشار کے بعد تنخواہ لینا ترک کر دیا، مزاج میں بے پناہ استغناء تھا، حضرت شیخ کے ایک شاگرد شیخ یعقوب دہلوی نے بیان کیا کہ مدینہ منورہ تشریف لانے پر عرب علماء شیخ یونس کے جوتے سیدھے کرنا اپنا شرف سمجھتے تھے ایک سفر میں عرب شاگردوں نے اتنے ہدایا دیے کہ ریالوں سے دو تھیلے بھر گئے، مدینہ سے واپسی پر شیخ نے مجھے حکم دیا کہ سارے پیسے مدینہ منورہ میں غرباء میں تقسیم کر دوں، میں نے باصرار کہا کہ حضرت اپنی ضرورت کے بقدر رکھ لیں، لیکن وہ تیار نہیں ہوئے، اور ایک ایک ریال صدقہ کروا دیا، ایک عرب عالم دین نے شیخ کے تقویٰ و زہد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ''وھو آیۃ فی الزھد والورع''، مولانا اتباع سنت کا حد درجہ اہتمام کرتے تھے، ان کی مجلس بہت باوقار اور

سنجیدہ ہوتی تھی، ادب و تعظیم کا بڑا لحاظ فرماتے تھے۔

مولانا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ علم کو برابر بڑھاتے رہے، اور باوجود صحت کا ساتھ نہ دینے کے انہوں نے محنت جاری رکھی، بیرونی سفروں میں محدثین کا پتہ لگاتے، اور ان کی خدمت میں جا کر استفادہ کرتے، اور کتابیں خریدتے، اس طرح انہوں نے سیرت پاک اور حدیث پاک کا ایک بڑا مکتبہ تیار کر دیا، اور معلوم ہوا کہ اس کو مظاہر علوم کے لئے وقف کر دیا تھا، وہ ایک سچے عاشق رسول تھے، حدیث سے ان کا تعلق ایسا اٹوٹ تھا کہ وہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہو گیا، صحت و تندرستی بیماری و لاچاری میں بھی اس کو جاری رکھا، ان کی جامعیت کی وجہ سے ان کی مقبولیت اور محبوبیت میں اور اضافہ ہوا۔

مولانا کا وجود ایسے حالات میں خاص طور پر باعث رحمت تھا، مولانا خالص کتابوں کے آدمی تھے، اللہ والے تھے، لیکن دنیا پر بھی نگاہ تھی،، مولانا علی میاں ندویؒ کی فکر کے بہت قائل تھے، آپ کی ساری کتابیں پڑھی تھیں، مولانا کہتے تھے کہ مولانا علی میاں کا جو طرز فکر ہے وہ بلاشبہ قابل تقلید ہے، کیوں کہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم دین کو اہل اقتدار تک پہونچائیں، جو طاقت والے ہیں ان تک ہمیں دین پہونچانا ہے، اگر ہم یہ کریں کہ دین والوں کو ہاں پہونچائیں تو اس کے نتیجہ میں انتشار ہوگا، خون بہے گا، کرسی والے کرسی توڑنے کو ترجیح دیں گے، چھوڑیں گے نہیں، اسی لیے ان حالات میں حضرت مولانا ندویؒ کے طرز فکر کو عام کرنے کے قائل تھے، بعض مرتبہ درس بخاری میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کے مطالعہ کی تلقین بھی کی۔ (مرتب)

جہاں تک ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت کا تعلق ہے خاص طور پر گجرات کے مختلف مدارس میں مولانا محمد یونس جونپوریؒ کے تلامذہ نمایاں اور ممتاز ہیں، جامعہ قاسمیہ کھروڈ گجرات اور اس جامعہ کے شیخ الحدیث مولانا محمد حنیف صاحب بھی حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ کے خصوصی فیض یافتہ اور ان کے علوم و معارف کے حامل و ناشر ہیں، اسی طرح مولانا محمد ایوب سورتی (استاد جامعہ فلاح دارین ترکیسر) مولانا مرحوم کی مختلف کتابوں اور علمی

افادات وتحقیقات کے مجموعوں جیسے ’’کتاب التوحید ‘‘ اور ’’الیواقیت الغالیة في الأحادیث العالیة ‘‘ اوراس کے علاوہ ان کی شرح صحیح بخاری ’’نبراس الساری فی ریاض البخاري ‘‘ خاص طور پر قابل ذکر اور وقیع علمی کام ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے اور بھی حضرات جنہوں نے علامہ جونپوری کے دروس سے فائدہ اٹھایا وہ بھی اپنے طرز سے ان کو سامنے لانے کی فکر اور کوشش میں ہیں ،نوادر الحدیث اور نوادر الفقہ کے عنوان سے ان کے افادات کے مجموعے مفتی محمد زید ندوی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء اور ان کے سندی امتیاز اور خصوصی امتیازات پر ڈاکٹر مولوی محمد اکرم ندوی کی کتاب ’’الفرائد فی عوالی الاسانید وغوالی الفوائد ‘‘ اہمیت کی حامل ہیں، جو بحرین سے استاد یعقوبی نے شائع کی ہے، ان کو جو علمی تعمق اور رسوخ اور مطالعہ کا تنوع اور توسع حاصل تھا اور مزاج وفکر میں عدم تعصب اور مختلف مکاتب فکر اور مسالک کے ائمہ اور علماء سے استفادہ کا شوق اور ان کی قدردانی تھی ،اس نے ان کو اپنے ملک کے علاوہ بلاد عربیہ کے حلقوں میں بھی ایک مقبول محدث اور محبوب شخصیت کے طور پر متعارف کرادیا تھا، یہ ان کا امتیاز تھا، جو انہیں اپنے عصر کے علماء اور محدثین اور برصغیر کے اساتذہ حدیث میں خصوصیت کے ساتھ ظاہر ہوا جسے ان پر لکھی گئی کتابوں ، مقالات اور علمی مذاکرات کے انعقاد سے خاص طور پر سمجھا جاسکتا تھا، مجھے بھی مختلف ملاقاتوں اور علمی تبادلہ خیال میں ان کی اس خصوصیت کا اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہوئی، اللہ تعالی ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کے علوم ومعارف سے لوگوں کو مستفید فرماتا رہے اور ان کے مراتب بلند فرمائے۔

مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی

۱۳۲۵ھ ۱۹۰۶ء تا ۱۴۱۷ھ ۱۹۹۶ء

مظاہر علوم سہارن پور اور دارالعلوم دیو بند کے عظیم استاد اور مربی شخصیت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے جنوبی افریقہ کے معروف شہر جوہانسبرگ میں ۱۸/ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ مطابق ۳/ستمبر ۱۹۹۶ء بروز منگل وفات پائی، اوران کی نماز جنازہ ان کے ہی خلفاء میں ایک ممتاز خلیفہ مولانا ابوالقاسم نعمانی بنارسی (جوموجودہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم ہیں) نے پڑھائی۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم گنگوہ میں وہاں کی فخر عہد شخصیت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات کے ٹھیک دوسال بعد شب جمعہ میں ۹/جمادی الثانی ۱۳۲۵ھ کو پیدا ہوئے، ان کے والد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی کے شاگرداوران سے بڑی محبت کرنے والے شاگرد تھے، اپنے استاد کے نام پر محمود حسن نام رکھا، اور بسم اللہ بھی حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ سے ہی کرائی، مظاہر علوم سہارن پوراوردارالعلوم دیوبند دونوں جگہ تعلیم حاصل کی اوردورۂ حدیث دارالعلوم دیوبند میں مکمل کر کے دوبارہ مظاہر علوم میں بھی کیا، اور پھر مظاہر علوم سہارن پور میں ۱۳۵۱ھ میں استاد اور معین مفتی مقرر ہو گئے، مظاہر علوم سہارنپور میں بیس سال درس وخدمت انجام دے کر ۱۳۷۱ھ میں کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں دینی وتعلیمی خدمات سپرد ہوئیں جہاں فقہ وفتاویٰ وعظ وارشاد کی خدمت اورلوگوں کی تربیت واصلاح نفوس کا کام بھی انجام دیتے رہے، عوام وخواص آپ سے خوب مستفید

ہوئے، اور شیخ الحدیث کی حیثیت سے بخاری شریف کا درس بھی ذمہ رہا لیکن پھر دارالعلوم دیوبند میں ضرورت محسوس کی گئی، اور اپنے شیخ ومربی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی منشا پاکر وہاں جانے کا فیصلہ کیا، اور صحیح بخاری شریف جلد ثانی کا کئی سال درس دیا، اس طرح آپ نے برصغیر کے ان دونوں مرکزی اور عظیم دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم میں پڑھا بھی اور پڑھایا بھی، اوران دونوں اداروں کے اصحاب افتاء کے سرپرست اور مشیر بھی رہے، مجموعی طور پر آپ کے فتاویٰ کئی ضخیم جلدوں میں ''فتاویٰ محمودیہ'' کے نام سے اور ملفوظات وارشادات ''ملفوظات فقیہ الامت'' کے نام سے کئی جلدوں میں طبع ہو چکے ہیں، اور مقبول ہیں۔

اصلاح وتربیت کا تعلق اپنے استاد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہ سے دوران طالب علمی ہی قائم کرلیا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد ان کے مجاز بیعت وارشاد ہوکر تربیت وارشاد کے میدان میں بھی شہرت ومقبولیت حاصل کی، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے انتقال کے بعد ان کے حلقۂ ارادت کے وابستگان بڑی تعداد میں آپ سے وابستہ ہوئے جن میں تعلیم وتربیت کے میدان میں اہمیت کے حامل کئی نمایاں حضرات بھی ہیں۔ آخر میں بینائی جاتی رہی تھی لیکن اس حال میں بھی آپ نے ارشاد وتربیت کے کام جاری رکھے اور لوگ آپ سے استفادہ کے لئے جوق درجوق حاضر ہوتے رہے۔

تعلیم وتدریس کے زمانہ میں آپ سے خصوصی رہنمائی حاصل کرنے والوں میں وہ شخصیتیں بھی ہیں جن کا فیض دور دور تک پھیلا، جن میں خاص طور سے حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی، حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی، حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی، حضرت مولانا ابرار الحق حقی اور حضرت قاری امیر حسن صاحب رحمہم اللہ کے نام نامی زیادہ اہمیت کے حامل ہیں، جن کے نام خصوصیت سے حضرت مفتی صاحب کے لئے صدقۂ جاریہ ہیں۔ ان میں خاص طور سے حضرت مولانا ابرار الحق صاحب اور حضرت مولانا

قاری سید صدیق احمد صاحب کے اداروں کے سرپرست بھی حضرت مفتی صاحب آخر تک رہے اوران دونوں کے اداروں میں مفتی صاحب تشریف لاتے اور قیام فرماتے۔

آخر میں مفتی صاحب کے حلقۂ تربیت سے جو شخصیتیں اپنے وسیع میدان عمل کے ساتھ سامنے آئیں ان میں مولانا محمد ابراہیم پانڈور (جنوبی افریقہ) مولانا مفتی احمد خان پوری (گجرات)، حضرت حکیم محمد اختر صاحب (پاکستان) مولانا مفتی محمد فاروق میرٹھی اور مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی کی شخصیتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

راقم کا حضرت مفتی صاحب سے تعلق بہت پرانا ہے جب اس کی عمر کوئی زیادہ نہ تھی اور سہارن پور میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی خدمت میں ایک ماہ یا اس سے کچھ زیادہ قیام رہا تھا اور مفتی صاحب مظاہر علوم سہارن پور میں استاد تھے اور وہ حضرت شیخ کی مجلس میں تشریف لایا کرتے تھے، یاد پڑتا ہے اس وقت بعض نحوی صرفی مسائل میں استفادہ بھی کیا، پھر بعد میں ان کی شخصیت کے گوشے کھلتے گئے اور حضرت شیخ اور حضرت رائے پوری کی خانقاہوں میں ان کا وقت گزارنا اور پھر کانپور میں جو ہمارے لکھنؤ کا قریبی شہر ہے تعلیمی ودعوتی سرگرمیاں قریب ہونے کی وجہ سے جس کی خبریں بھی ملتی رہتیں، اورآخر میں میل وشارم میں رمضان المبارک کا قیام جس کا انتظام ملک محمد ہاشم صاحب کرتے تھے اور بڑے اصرار سے حضرت مفتی صاحب کو پورے رمضان کی قیام کی دعوت دیتے، وہاں دور دور سے طالبان سلوک ومعرفت آکر قیام کرتے اور اس ماحول میں حضرت مفتی صاحب سے استفادہ کرتے، اس طرح بڑی شخصیتوں کے ایک ایک کر کے اٹھ جانے کے بعد مفتی صاحب کی شخصیت مرجع خلائق بن گئی تھی، اوران کا حلقہ بہت وسیع ہوگیا تھا، اس لئے ان کی وفات کا سانحہ ایک بڑے علمی ودینی خسارہ کے طور پر محسوس کیا گیا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی وفات کو سال رواں کی وفیات میں سب سے بڑا حادثہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''ان میں سب سے بڑا حادثہ حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہیؒ کی

رحلت کا ہے، جو ۱۸؍ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ مطابق ۳؍ستمبر بروز سہ شنبہ جوہانسبرگ افریقہ میں پیش آیا، اس وقت آپ کی عمر شریف ۹۲ سال کی تھی، علمی رسوخ، فقہ وحدیث پر عمیق وغائر نظر، افتاء اور فقہی فیصلوں میں وہ سند وحجت کا درجہ رکھتے تھے پھر ذکر وسلوک میں بھی ایک رہنما اور مرجع ہونے کی بنا پر آپ کو اگر ''بقیۃ السلف'' کہا جائے تو بے جانہ ہوگا، آپ کی وفات کی خبر اسی دن جنوبی افریقہ سے ٹیلی فون کے ایک پیغام سے ملی، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایصال ثواب کا خاص اہتمام کیا گیا اور دارالعلوم کی مسجد میں عشاء کی نماز کے بعد مولانا برہان الدین صاحب نے ایک تعارفی وتعزیتی تقریر کی''۔

(کاروان زندگی حصہ ششم، ص:۲۶۷)

مولانا مخدوم حسین صاحب

۱۳۵۳ھ ۱۹۳۴ء تا ۱۴۳۲ھ ۲۰۱۱ء

مولانا مخدوم حسین صاحب کی ۱۸ رشوال المکرّم ۱۴۳۲ھ مطابق ۱۷ ستمبر ۲۰۱۱ء کو وفات کی اطلاع ملی، ایک مخلص اور کارگزار عالم دین کے اٹھ جانے کا افسوس ہوا، مولانا کا تعلق حضرت مولانا مسیح اللہ خاں شیروانی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت واسترشاد کا تھا، اوران کی خدمت میں انہوں نے اچھا وقت گزارا تھا، دینی تعلیم کے فروغ میں انہوں نے قربانی سے کام لیا، حالانکہ ان کا وطن ریاست کرناٹک تھا لیکن ریاست مہاراشٹر میں رہ کر احمد نگر میں انہوں نے دارالعلوم عالمگیر قائم کر کے ۱۷ سال بحیثیت استاد وذمہ دار کے وقت گزارا، یہ وہ جگہ تھی جہاں سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی تربیت حاصل کی تھی، آج بھی اس کے نقوش قائم ہیں، مولانا نے ایک عظیم سلطان کی یادگار باقی رکھنے کا یہ اچھا طریقہ اختیار کیا کہ وہ دینی ادارہ قائم ہوجائے، اور قرآن مجید اور دینی علوم سے متعلق ادارہ کو ان سے اس لئے بھی مناسبت ہے کہ وہ قرآن مجید اپنے ہاتھ سے لکھ کر زیادہ پاکیزہ کمائی حاصل کرتے تھے، اور خدمت ملک وملت کا معاوضہ نہیں لیتے تھے۔

مولانا مخدوم حسین صاحب نے احمد نگر سے ستر کیلومیٹر کے فاصلہ پر شری رام پور میں ایک دینی تعلیمی ادارہ مدرسہ مدینۃ العلوم بھی قائم کیا اور اپنی اولاد کو بھی دینی تعلیم میں لگا کر دین کی خدمت کرنے کا حوصلہ بخشا، ان کے ایک صاحبزادے مولوی محمد عبداللہ مخدومی ندوی ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دفتر اہتمام اور اضافی طور پر اس کے عربی ترجمانہ

مجلۃ البعث الاسلامی کے دفتر سے بھی وابستہ رہ کر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں، اور مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا ڈاکٹر سعیدالرحمٰن اعظمی ندوی صاحب کے داماد بھی ہیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے اوران کے درجات بلند کرے اور پسماندگان سے دین کی تقویت واشاعت کا کام لے۔

مولانا معراج الحق قاسمی

۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء تا ۱۴۱۲ھ ۱۹۹۱ء

بروز اتوار ۷/صفر المظفر ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۸/اگست کو دارالعلوم دیوبند کے بزرگ ومعمر استاذ جناب مولانا معراج الحق صاحب قاسمیؒ کا انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں یہ خبر بڑے رنج وغم کے ساتھ سنی گئی۔

مولانا مرحوم حدیث شریف میں حضرت مولانا علی میاں صاحب کے ہم درس رہے ہیں۔اور دونوں حضرات، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے شاگرد ہیں، ادھر تین ماہ سے زیادہ علیل تھے، ۸۱ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

مولانا مرحوم کے لیے ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا اور کئی دن تک کیا جاتا رہا۔ مولانا علی میاں صاحب نے مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم کو تعزیتی خط بھی تحریر فرمایا ہے۔

۲۶/اگست ۱۹۹۱ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا کے انتقال پر تعزیتی جلسہ ہوا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مولانا معراج الحق صاحب کی وفات پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک ایسا بڑا علمی ودینی حادثہ ہے جس میں کسی ایک فرد کے رخصت ہو جانے سے پورے کنبہ کا متاثر اور رنجیدہ ہونا فطری ہے یہ بات مولانا مدظلہ نے اپنے تعزیتی خطاب میں کہی۔

مولانا مدظلہ نے فرمایا کہ مولانا مرحوم طالب علمی کے زمانہ ہی سے تہجد تک کے

پابند تھے، نہایت دیانتدار اور اصولی شخصیت کے مالک تھے جس میں کسی کی رو و رعایت نہ کرتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں ان کی خدمات کا عرصہ بڑا طویل رہا، ان کی وفات کا صدمہ دارالعلوم کے اساتذہ و طلبہ کو خاص طور پر بہت ہوا، طلبہ عزیز اور اساتذہ کرام اپنے ایک بڑی مربی، مشفق اور محسن بزرگ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے، فوراً تجہیز و تکفین اور ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا۔ اور ڈیڑھ یوم کی تعطیل کی گئی، جس میں برابر کلمہ طیبہ کا ختم اور ایصال ثواب کا سلسلہ جاری رہا، انتقال ساڑھے دس بجے دن میں ہوا اور اسی روز عصر کی نماز کے بعد طلبہ و کارکنان، اساتذہ حضرات اور اہل شہر نیز قرب و جوار کے مدارس کے ذمہ داران، ہزاروں لوگوں نے نماز جنازہ اور تکفین میں شرکت کی۔ دوسرے دن دارالحدیث میں جلسہ تعزیت منعقد ہوا، متعدد اساتذہ نے حضرت مرحوم کے محاسن ذکر کر کے حاضرین کو صبر کی تلقین کی اور حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی دعا پر جلسہ کا اختتام ہوا۔

حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ تمام علوم اسلامیہ میں کامل دسترس رکھتے تھے، فقہ اور ادب ان کا خاص فن تھا، مرحوم کی تدریس کا زمانہ نصف صدی پر محیط ہے۔

تدریس کے ساتھ حضرت مرحوم انتظامی قابلیت کے لیے بھی مشہور تھے، سابق میں عرصہ دراز تک نائب مہتمم کی حیثیت سے انتظامی خدمات اعلیٰ پیمانہ پر انجام دیں اور اب صدر مدرس کے عہدہ پر فائز تھے، مولانا اپنی وضعداری، شفقت، کریمانہ اخلاق، اصابت رائے اور اصول پسندی میں ضرب المثل تھے۔

دعا ہے کہ پروردگار عالم دارالعلوم کی حفاظت فرمائے اور حضرت مرحوم و مغفور کی جماعت میں جو خلاء پیدا ہو گیا ہے اس کی غیب سے تلافی فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر ملپا علی مرحوم

۱۳۳۸ھ ۱۹۲۰ء تا ۱۴۳۸ھ ۲۰۱۷ء

ڈاکٹر ملپا علی صاحب جن کے دینی فیض سے بھٹکل کے مسلمان اصلاح وارشاد کا فائدہ اٹھا رہے تھے اوران کی اصلاح وارشاد کی کوششوں سے وہاں کے لوگوں کو دینی تربیت مل رہی تھی اب وہ شخصیت وہاں نہیں رہی، وہ رشدو ہدایت کا عمل انجام دے کر اپنے مالک وپروردگار کے پاس پہونچ گئے اوراس طرح وہاں دینی تربیت کی لائن میں ایک بڑا خلا چھوڑ گئے، ''اناللہ وانا الیہ راجعون'' ان کا ارشاد واصلاح کا تعلق مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اور مولانا شاہ ابرارالحق صاحب سے رہا تھا، اوران کی تربیت وارشاد کا انداز بھی ان ہی سے ماخوذ تھا، اور وہ ان کو مرشد جلیل ومربی عظیم حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی سے حاصل ہوا تھا، حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحبؒ اپنے شیخ کے خلفاء کی آخری کڑی اوران کے سلسلہ کے جانشین تھے، اورآخر میں حضرت تھانوی کے دیگر متعلقین ان ہی سے زیادہ استفادہ کرتے تھے۔

بھٹکل صوبہ کرناٹک کی ساحلی پٹی میں واقع ہے، وہاں کے مسلمانوں میں اسلامی خصوصیت زیادہ نمایاں پائی جاتی ہے، اس میں وہاں کے اس آخری مدت میں ڈاکٹر ملپا علی صاحب اوران کے رفقاء کی دینی فیض رسانی کا خاص دخل تھا، اوراب کچھ عرصہ سے وہ وہاں تنہا اس سلسلہ میں فیض رساں کی حیثیت سے دیکھے جارہے تھے، اوران کے اثر سے وہاں متعدد اہل علم ان سے فیض حاصل کرکے ان کے خلافت یافتہ ہوئے، جوان شاء اللہ ان کی یاد کے باقی رہنے کا ذریعہ بنیں گے۔

ڈاکٹر ملپا علی صاحب اوران کے رفقاء کا نصرت دین کے سلسلہ میں ایک اہم کام وہاں اہم دینی تعلیم گاہ جامعہ اسلامیہ کی تاسیس میں شرکت کا رہا، آخر دور میں ڈاکٹر ملپا صاحب نے اس کی خصوصی سرپرستی کی، اس جامعہ کے ذریعہ علوم دینیہ کی اشاعت بھٹکل کے مسلمانوں میں بہت اثر انداز ہوئی، اس کے ذریعہ علمائے دین کی پوری ایک نسل تیار ہوگئی، اوراس سے بھٹکل میں دینداری کی اچھی فضا قائم ہوئی، جو وہاں جانے والوں کونظر آتی ہے، اوراس کے اثر سے بھٹکل کی نئ اٹھتی ہوئی نسل کوخصوصی فائدہ پہونچ رہا ہے، اور یہ اکثر لوگ حضرت ڈاکٹر صاحب سے عقیدت کا تعلق رکھتے اور فائدہ اٹھاتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب میں دین کی نصرت وتقویت کا جذبہ بہت نمایاں تھا، ان کی ہر مجلس دین کے تقاضے کی طرف متوجہ کرنے پر مشتمل ہوتی تھی، اور وہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے سلسلہ میں کسر نفسی کا اظہار کرتے تھے، اور بار بار کہتے تھے کہ دعا کریں خاتمہ بالخیر ہو، ان کی اس بات سے سننے والے کے لیے نصیحت حاصل ہوتی، کہ یہ شخص دینی جذبہ وکیفیت میں اتنا ڈوبا ہوا ہے وہ ایسی بات کہہ رہا ہے تو ہم کوتاہ اور تقصیر دینی میں مبتلا لوگوں کے لیے یہ زیادہ سوچنے کی بات ہے، بہرحال ان کی مجلس دینی نصیحت وتوجہ دہانی کی مجلس ہوتی تھی۔

وہ عمر کی اس منزل میں کمزوری محسوس کرنے کے باوجود دینی ضرورت میں بڑے صاحب ہمت نظر آتے تھے، مجھے جب بھی بھٹکل جانا ہوتا، تو یہ نیت رہتی تھی کہ ان سے بطور خاص ملیں گے، اوران کی فیض رساں باتیں سنیں گے، اس پر عمل کرنے سے قبل وہ خود آجاتے اور محبت واخلاق کا اظہار کرتے، پھر میں موقع پاکر ان کے پاس جاتا اوران کی باتوں سے فائدہ اٹھاتا، اب وہ نہیں رہے اور بھٹکل جانے والوں کوان سے ملنے کا جو فائدہ حاصل ہوتا تھا وہ اب نہیں رہا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت ورحمت ورفع درجات کا معاملہ فرمائے اوران کے جانے سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اس خلاء کودور فرمائے۔آمین۔

مولانا نسیم احمد فریدی

۱۴۰۹ھ؍۱۹۸۸ء

حضرت مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی نے ۵؍ربیع الاول ۱۴۰۹ھ/ ۸؍اکتوبر ۱۹۸۸ء بروز منگل امروہہ میں وفات پائی اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

مولانا نسیم احمد فریدی نابغۂ عصر شخصیت تھے، پوری عمر وہ علم وتحقیق کے جویا بن کر رہے، اوران کے قلم سے بڑی بلند پایہ تحقیقی کتابیں اورلوگوں کی تربیت واصلاح کے لئے مشائخ کے خطوط ورسائل کے ترجمے جوفارسی سے کئے گئے سامنے آئے، خاص طور پر انہوں نے مشائخ نقشبند کوموضوع بنایا اورحضرت خواجہ باقی باللہ اوران کے خلفاء کے احوال اورحضرت مجدد الف ثانی اوران کے جانشین حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی کے مکتوبات کواردو قالب میں اس طرح پیش کیا کہ گویا وہ خطوط اردوزبان میں ہی لکھے گئے ہیں اوران کے بعد کی شخصیات میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱) سے متعلق شخصیات اورمکتوبات پراورخانوادۂ علم

(۱) آپ کانام قطب الدین تھا۱۱۱۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، شاہ ولی اللہ کے نام سے مشہور ہوئے، ۵سال کی عمر میں تعلیم شروع کی، عمدہ وپاکیزہ اخلاق بہادری کفایت شعاری غیرت وحمیت جیسے اوصاف وکمالات اپنے والد سے حاصل کئے، آپ کادوروہ دور ہے جب مغلیہ سلطنت کاشیرازہ بکھر رہاتھا، اورنگ زیب کی لائی ہوئی اصلاحات خطرہ میں پڑ گئی تھی، ایسے میں شاہ صاحب اپنی گہری بصیرت، وسیع علم اور بے مثال جراءت سے مسلمانوں کے عہد تاریک میں اپنی کھوئی ہوئی عظمتوں کودوبارہ حاصل کرنے اوراسلام کومکمل نظام کی حیثیت سے غالب کرنے کی راہ دکھائی، شاہ صاحب کاعظیم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے امت کوبراہ راست قرآن سے جوڑنے کی کامیاب کوشش کی، اس کیلئے آپ نے قرآن پاک کافارسی میں فتح الرحمٰن کے نام سے ترجمہ کیااسی طرح الفوز الکبیر کے نام سے تفسیری اصول مدون کئے، تمام موضوعات میں آپ کی بے شمار تصانیف ہیں، شاہ صاحب=

اللّٰہی کی گل سر سبد شخصیت حضرت شاہ ابو سعید حسنی جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے نانا تھے اور حضرت شاہ غلام علی دہلوی کی شخصیت وملفوظات اور ان کے خلفاء کے احوال پر کتاب تصنیف کی، اور بھی ان کے کئی تصنیفی اور تحقیقی پلان تھے مگر آخر میں وہ نابینا ہو گئے تھے اور پھر صحت نے زیادہ ساتھ نہ دیا جس سے ان کے بعض علمی منصوبے تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔

ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے ان کو صدر جمہوریہ ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا جس سے جدید حلقوں میں ان کی شخصیت کا اعتبار بڑھا اور ان کی تحقیقات کی مزید قدر ہوئی۔

مولانا نسیم احمد فریدی گوناگوں خصوصیات وکمالات کے انسان تھے، ایک ممتاز عالم دین، اور نامور محقق ومصنف اور ایک صاحب نسبت بزرگ کی حیثیت سے معروف ہوئے، ان کے والد مولانا حسین احمد فریدی اور دادا مولانا شبیر احمد فریدی دونوں علم وعمل کی جامع شخصیات اور مشہور بزرگ حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کی طرف اس خاندان کا انتساب ہے، ان کی ہی نسبت سے یہ لوگ فریدی لکھتے ہیں چونکہ وہ فاروقی النسب تھے اس لئے یہ خاندان فاروق اعظم سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی نسل میں شمار کیا جاتا ہے۔

مولانا نسیم احمد فریدی نے پہلے اپنے وطن امروہہ میں تعلیم حاصل کی پھر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور دینی وادبی موضوعات میں کمال پیدا کیا، خاص طور سے فارسی میں ان کو عبور حاصل ہو گیا تھا، انہوں نے بریلی میں مدرسہ اشفاقیہ میں پڑھایا پھر وہ جامعہ اسلامیہ امروہہ تشریف لائے اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہ کر خدمت حدیث میں پوری عمر گزار دی، اور اس مسجد کے جوار میں مدفون ہوئے جس میں انہوں نے علم وعبادت میں یکسو رہ کر زندگی گزاری تھی، انہوں نے شادی نہیں کی تھی تاکہ علم وتحقیق کا کام پوری یکسوئی سے انجام دیں، ان کو صفائی باطن اور ذوق عبادت کا جو وصف حاصل تھا اس نے سلوک کے اونچے مقام پر

= نے اسلام کو پورے فکری اخلاقی شرعی اور تمدنی نظام کے ساتھ مرتب کرنے کی جو کوشش کی تھی اس کا رنگ آپ کی تالیفات میں جھلکتا ہے، علم وآفتاب کا یہ سورج آخر تک اپنی شعائیں بکھیرتا ہوا ۶۳ سال کی عمر میں ۲۹ محرم الحرام ۱۱۷۶ھ کو دہلی میں آسودہ خاک ہوا، (تاریخ دعوت وجہاد ص ۱۲۲ تا ۱۳۰)

فائز کیا، اور انھیں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت وخلافت حاصل تھی جن کے وہ مرید صادق تھے، اور بھی مشائخ سے ان کو اجازت حاصل ہوئی۔

وہ ہمارے ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن بھی تھے، اس طرح ان سے اس موقع سے ملاقات بھی ہوتی، اس سے پہلے ان سے ملاقات کا بڑا ذریعہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ بنے تھے جن سے ان کے بڑے دیرینہ تعلقات تھے اور بریلی کے قیام میں بھی ساتھ رہ چکے تھے اور ان کی کتابیں مولانا محمد منظور صاحب کے کتب خانہ الفرقان سے شائع ہوئی تھیں، وہ شاعر بھی تھے اور ان کا کلام رضوان، الفرقان، تعمیر حیات وغیرہ میں شائع ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کو ان کے لئے صدقۂ جاریہ بنائے اور اعلیٰ مراتب سے نوازے، ان کے قریبی عزیزوں میں ان کے بھتیجے پروفیسر نثار احمد فاروقی اور بھانجہ پروفیسر خلیق احمد نظامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنھوں نے ان سے علم وتحقیق میں بڑا استفادہ کیا اور بڑی حیثیت بنائی۔

وکیل احمد وکیلؔ انصاری جون پوری

۱۳۴۲ھ ۱۹۲۳ء تا ۱۴۳۳ھ ۲۰۱۲ء

افسوس کہ محبّ مکرم جناب وکیل احمد وکیلؔ انصاری جون پوری بھی داغ مفارقت دے گئے، إنا لله وإنا إليه راجعون.

۱۱/ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ کو مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی کی اہلیہ محترمہ کے جنازہ میں شرکت کے لیے اعظم گڑھ جانا ہوا تو انصاری صاحب سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور توقع تھی کہ راستہ میں معمول کے مطابق ان کے یہاں جون پور میں رکنا ہو جہاں وہ شاہی قلعہ کے مرکزی دروازے کے جوار میں ''دارالشفاء'' نام کے مکان میں رہتے تھے، لیکن یہ اس بار اس لیے ممکن نہ ہوسکا کہ ان سے ملاقات جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم میں ہی ہوگئی تھی جہاں وہ بھی نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے، اور پھر رات کا قیام بھی وہیں کیا، اور صبح کچھ وقت گذار کر وہ جون پور گئے، اس ملاقات کو ایک ہفتہ ہی گذرا تھا کہ ایک روز یہ رنجیدہ خبر ملی کہ وکیل احمد انصاری وفات پاگئے، ان کا سانحہ وفات رات کو ۱۲ بجے کے بعد دوشنبہ کے دن ۲۰/ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ ۵/نومبر ۲۰۱۲ء کو اپنے مکان ''دارالشفاء'' میں پیش آیا، بعد میں معلوم ہوا کہ ان کو اس کے آثار محسوس ہونے لگے تھے، اور گھر والوں نے اس کو اس طرح محسوس کیا کہ اس دن انہوں نے غسل کا خصوصیت سے اہتمام کیا، اچھے کپڑے پہنے، خوشبو لگائی، اور دوسروں کو بھی لگانے کو کہا، آب زمزم کا زیادہ استعمال کیا، اور رات میں بھی اٹھ کر زمزم پیا، اپنے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر اختر سعید سے جو شاعر اور سماجی ورفاہی کاموں میں بھی سرگرم ہیں، شعر سنانے کو کہا، انہوں نے ان کے حسب حال کچھ اشعار

سنائے، پھر خود ہی ایک شاعر کا سبق آموز شعر انصاری مرحوم نے سنایا کہ ؎

قسم خدا کی سمجھ لو، اسے خدا نہ ملا
جسے نصیب محبت کی زندگی نہ ہوئی

ان کی طبیعت ٹھیک تھی، رات کو بھی صبح مسجد جا کر نماز ادا کرنے کی بات کہی اور تقریباً ۱۲ بجے رات جان جان آفریں کے سپرد کر دی، اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے، اور اپنے مقربین میں جگہ دے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ اچھے حالات جو پیدا فرمائے، یہ اس کا نتیجہ تھے کہ انہوں نے دین کی خدمت کے لیے دنیوی منصب کی قربانی دی تھی، وہ ایک اچھے مشہور وکیل تھے، حضرت مولانا عبدالحلیم جون پوریؒ سے ان کا تعلق ہوا اور ان کے توسط سے وہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری سے وابستہ ہوئے اور بیعت بھی ہو گئے، اور ان کی خدمت میں آمد و رفت جاری رکھی، یہاں تک کہ حضرت شاہ وصی اللہؒ کو ان سے انس اور تعلق پیدا ہو گیا، ان کی صحبت و تعلق کے اثر سے وکالت چھوڑ دی اور ہومیو پیتھ پریکٹس کرنے لگے، اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا بھی دی اور مطب چل پڑا۔

انصاری صاحب کو کئی بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی، پہلا حج جو ان کا فرض تھا، ۱۹۹۴ء میں اس وقت کیا جب وہ وکالت کے پیشہ سے متعلق تھے، لیکن ان کے ضمیر نے گوارہ نہ کیا کہ اس آمدنی سے وہ اپنا فریضہ حج ادا کریں، اس کے لیے انہوں نے ”تاریخ شیراز ہند“ (جونپور) مصنفہ سید اقبال احمد جون پوری کا ہندی میں ترجمہ کیا، اس پر جو ان کو معاوضہ ملا، اس سے حج کی سعادت حاصل کی، اور چار مہینے قبل حجاز مقدس پہونچ جانے کے باعث مدینہ طیبہ میں جوار رسول میں اعتکاف کی بھی سعادت حاصل کی۔

انصاری صاحب مرحوم پیشہ سے وکیل تھے، نام بھی وکیل رہا، لیکن بعد میں وکالت سے کوئی سروکار نہ رکھا، اور دینی کاموں کو تقویت پہونچانے میں سرگرم عمل ہو گئے، میرا ان سے تعلق محـ [illegible] ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کے توسط سے ہوا، ڈاکٹر صاحب مرحوم کے

ذریعہ ان کا تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے قائم ہوا، اور پھر ان کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی، حضرت مولاناؒ کا اپنے مشائخ کے متوسلین کو بیعت کرنے کا معمول نہیں تھا لیکن کوئی زیادہ اصرار کرتا تو کرلیا کرتے تھے، انصاری صاحب مرحوم کا اس کے بعد سے تعلق بڑھتا گیا، اوران کاموں میں جو وکالت اور عدالت سے متعلق ہوتے فائدہ پہونچانے میں دلچسپی لینے لگے، بعد میں ان کی ان صلاحیتوں سے اورلوگوں نے بھی فائدہ اٹھایا، چونکہ وہ اچھے قانون داں تھے، اس لیے اس سلسلہ میں ان سے دوسروں کوسہولت حاصل ہوجاتی تھی، خاص طور پر مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم نے اپنے ادارے ''جامعۃ الرشاد'' میں ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا، اوران کی قدر دانی کرتے ہوئے کچھ ذمہ داریاں بھی سپرد کردی تھیں۔

مفکراسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے تعلق ان کے ملی کاموں میں قریبی تعاون ومشارکت کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا، اوراس تعلق کی بنا پر حضرت مولانا کے اعزاز سے مولانا کی زیر سرکردگی انجمنوں پیام انسانیت، اوردینی تعلیمی کونسل، مسلم پرسنل لا بورڈ میں اپنی صلاحیتوں کے مطابق معاون بنتے چلے گئے، مسلم پرسنل لا بورڈ کے شاہ بانو کیس میں مطلقہ کے نان ونفقہ کے مسئلہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف حکومت کواحتجاج درج کرانے کے لیے دستخط لینے کی مہم مں حصہ لیتے ہوئے صرف جون پور سے ایک لاکھ لوگوں کی دستخط کرائی۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے بھی خصوصی تعلق رکھتے تھے، اوراگر کسی تعاون کی وہ ضرورت محسوس کرتے، تو اس کے لئے اپنے کو پیش کرتے، پیام انسانیت کے مشن کوفروغ دینے میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اورمؤثر انداز سے اونچی سطح پر یہ کام کئی موقعوں پر کیا، اور ملک کی انتظامیہ اورممبران پارلیمنٹ کو اس کا لٹریچر پہونچانے کا کام کیا، کچھ عرصہ انسانیت کی بہی خواہی اور ملک کی فلاح وبہود کے خاطر سیاست میں بھی حصہ لیا لیکن پھر اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

جناب وکیل احمد انصاری مرحوم ظفرآباد ضلع جون پور میں ۱۰ر جولائی ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم میڈل اسکول تک ظفرآباد میں اپنے گاؤں میں حاصل کی، اورانٹر

میڈیٹ محمد حسن انٹر کالج جون پور سے کیا، پھر گریجویشن ٹی ڈی (T.D) کالج جون پور سے کیا، پھر ایل ایل بی (L.L.B.) الہ آباد یونیورسٹی سے کیا، اور قانون کی ڈگری حاصل کی، گھر کے حالات اعلیٰ تعلیم کے لئے سازگار نہ تھے، لیکن محنت وقربانی سے انہوں نے اپنا علمی سفر جاری رکھا، چنانچہ وہ ٹیوشن کرتے، اوراس کی آمدنی سے وہ تعلیم جاری رکھتے، ٹیوشن سے ان کو ایک فائدہ یہ پہونچا کہ بعض صلاحیت مند لوگ ان کے شاگرد بن گئے، اور اعلیٰ لیاقت کے حامل ہوکر وہ اونچے منصب پر بھی فائز ہوئے ان میں عشرت عزیز جو بعد میں سعودی عرب میں ہندوستان کے سفیر ہوگئے تھے۔

انصاری صاحب مرحوم کوسعودی عرب میں روزگار کے مواقع بھی فراہم ہوئے اوراس سے انہوں نے فائدہ بھی اٹھایا، لیکن دینی وملی جذبے نے ان کو وہاں زیادہ رہنے نہ دیا، اور وطن جون پور آکر تعلیم کے فروغ میں پوری طرح لگ گئے، انصاری صاحب نے جون پور میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک مکتب قائم کیا جوان کی کوشش اور فکرمندی سے ترقی کرکے ''ساجدہ انٹر کالج'' کی شکل اختیار کرگیا، جس میں ڈھائی تین ہزار طالبات زیر تعلیم ہیں، اور مزید لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ''مسلم گرلس کالج'' کی بنیاد ڈالی، اوراس کے آخر وقت تک منیجر رہے۔

خدمت خلق کے دوسرے کاموں میں ''انڈیا الخیر فاؤنڈیشن'' کا قیام بھی ہے، جو انہوں نے رفاہی کام کے لئے قائم کیا، جس کے تحت الخیر ایمبولینس سروس، الخیر موبائیل کلینک ہے، اس کا سرپرست انہوں نے اپنے شیخ ومربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو بنایا تھا، اورانہیں ان کی دعائیں حاصل تھیں، پیام انسانیت اور خدمت خلق کے اس کام کا اثر برادران وطن پر بہت اچھا پڑا، ایک موقع پر الخیر موبائیل کلینک کے افتتاح کے لئے مجھے بھی انہوں نے دعوت دی اوراس موقع پر ایک اچھے اور کامیاب پروگرام کا انعقاد بھی کیا۔

انصاری صاحب مرحوم نے لکھنے لکھانے کا مشغلہ بھی رکھا، اور بعض مفید کتابوں کے ترجمے بھی کئے ''جغرافیہ جون پور'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جو جون پور کے مقامی اسکولوں میں ابتدائی درجات میں پڑھائی جاتی ہے۔

شعر وسخن سے بھی ان کو اچھی دلچسپی تھی، اور خود بھی شعر کہتے تھے اور وکیل تخلص رکھتے تھے، ان کی ایک رباعی ہے جس میں دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا قلبی وجذباتی تعلق ظاہر ہورہا ہے، اور حضرت عمرؓ کی دعا: " اللهم اجعل موتي في بلد رسولك" کا بھی اظہار ہے، یہ شعر انہوں نے اپنے شیخ ومربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو سنایا تو انہیں بھی بہت پسند آیا اور جب مدینہ کے ایک سفر میں مدینہ طیبہ سے جدہ واپس ہوتے ہوئے ساتھ ہوا جو حج کا بھی سفر تھا تو حضرت مولاناؒ نے ان کو ان کے یہ اشعار یاد دلائے، وہ ملاحظہ ہوں۔

ہم مدینہ کو گئے اور چلے آئے ہیں
داغ فرقت جو تھے مدہم وہ ابھر آئے ہیں
مرکے نہ چھوٹے دامان مدینہ ہم سے
ہم تو ذروں سے بھی طیبہ کے یہ کہہ آئے ہیں

انصاری صاحب کا جو تعلق حضرت مولاناؒ سے قائم ہوا تھا، وہ ہمیشہ باقی رہا اور ان کی زندگی میں ہی انہوں نے ان کی قائم کردہ تربیتی نظام میں تکیہ رائے بریلی کی مسجد شاہ علم اللہ میں آخری عشرہ اعتکاف کا معمول بنالیا تھا جو انہوں نے آخر حیات تک قائم رکھا، اپنے آخری رمضان میں بھی انہوں نے اعتکاف کی نیت سے آخری عشرہ کا قیام کیا۔

مرحوم کا مزاج دینی تھا، انہوں نے اپنی اولاد کا مزاج بھی بنایا اور لڑکیوں کے رشتوں میں بھی خیال رکھا، ایک بیٹے جو مولوی انور حفیظ ہیں، ان کو حافظ وعالم بنایا، حضرت مولانا شاہ ابرارالحقؒ کی سرپرستی میں حفظ کرایا اور پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کرا کر عالم بنایا، وہ اچھی لیاقت کے حامل ہیں اور مصنف بھی ہیں اور دو بیٹے ڈاکٹر ہیں جن میں بڑے بیٹے ڈاکٹر اختر سعید ہیں، وہ بھی لائق وفاضل صاحبزادہ ہیں، اردو اور تاریخ میں پی ایچ ڈی ہونے کے ساتھ معالج بھی ہیں اور تعلیمی، رفاہی اور سماجی کاموں میں حصہ لیتے ہیں، تیسرے ڈاکٹر عبدالرحمٰن مجاہد جو سب سے چھوٹے ہیں، ایم ڈی (M.D.) ہیں، اور چار صاحبزادیاں ہیں اور وہ سب ہی تعلیم یافتہ ہیں، اللہ تعالیٰ پسماندگان کو صبر واستقامت عطا فرمائے اور مرحوم کی مغفرت کرے اور درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

ندوۃ العلماء

اساتذہ

احباب و رفقاء

اراکین انتظامیہ

مولوی اسحاق پٹیل ندوی مرحوم

۱۴۱۷ھ ۱۹۹۶ء

عزیز گرامی مولوی اسحاق پٹیل ندوی نے ۸/ جون ۱۹۹۶ء مطابق ۲۰/ محرم الحرام ۱۴۱۷ھ کو ممبئی میں انتقال کیا، دار العلوم ندوۃ العلماء میں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی، اور دوران تعلیم ہی سے ان میں رشد وصلاح کے آثار نمایاں تھے اور صلاحیت مند بھی تھے، ان کے درجہ میں میرے ذمہ بھی اسباق تھے، اور میں ان کو درجہ میں ممتاز دیکھتا تھا، وہ سنجیدگی کے ساتھ حصول تعلیم میں مشغول رہتے تھے، اساتذہ کے ساتھ بہت مؤدب اور ان سے استفادہ کے خواہاں رہتے تھے، جس کی وجہ سے اساتذہ ان سے تعلق محسوس کرتے تھے، جن میں میں بھی تھا، مجھے صرف ان کی قدر ہی نہ تھی بلکہ مستقبل میں مجھے ان سے اچھی توقعات قائم تھیں کہ وہ علم ودین کے کاموں کے لئے ایک مفید تر کارگزار اور ممتاز عالم بنیں گے، دلی صدمہ اس خبر سے پہنچا کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے، اور کم عمری کا داغ مفارقت دیا۔

وہ درجہ کے علاوہ بھی مجھ سے ربط رکھتے وہ اور ان کے ہم درس مولانا ابوسحبان صاحب جو بعد میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے استاد ہوئے، کتابوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں الگ سے مشورہ بھی لیتے، اسی طرح ان کے ساتھیوں میں مولوی امتیاز عبداللہ ندوی بھی مجھ سے ذاتی طور پر ربط رکھتے اور مجھے ان لوگوں سے بڑی اپنائیت محسوس ہوتی تھی، مولوی اسحاق مرحوم میں جذبۂ ہمدردی بہت تھا اس لئے وہ اپنے ساتھیوں میں بڑے مقبول تھے۔ ان کے والد ایک بڑے نیک اور ذاکر وشاغل شخص تھے، اور دعوتی وتبلیغی مصروفیات رکھتے تھے، اور دینی

ودعوتی کاموں میں بڑا تعاون بھی فرماتے تھے، ادھر ایک تبلیغی سفر میں چوٹ کھا جانے سے معذور ہو گئے تھے، پیرانہ سالی میں ان کے لئے قابل رشک فرزند کی موت کا صدمہ ایک بڑا صدمہ تھا، اللہ تعالیٰ ان کے اور گھر کے سبھی افراد کو صبر واستقامت عطا فرمائے، اور عزیز مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے۔

مولوی اسحاق مرحوم کو اپنے مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے بڑا تعلق تھا جو انہوں نے اپنی کاروباری مشغولیات کے ساتھ قائم رکھا اور ادارہ کو تعاون بھی دیتے رہے، اور تدریسی شغل بھی جاری رکھا، وہ مدرسہ امدادیہ چونا بھٹی میں اعزازی طور پر عرصہ تک درس وتدریس دیتے رہے اور اس کے ساتھ تبلیغ میں وقت لگاتے، اس طرح انہوں نے ایک بڑی کارآمد اور قابل رشک زندگی گزاری جس کا حقیقی صلہ انہیں آخرت میں ملے گا۔

غفرالله له ورحمه رحمةً واسعةً.

ڈاکٹر اسماعیل مدراسی ندوی

۱۳۵۴ھ ۱۹۳۵ء تا ۱۴۰۰ھ ۱۹۷۹ء

ڈاکٹر اسماعیل ندوی مدراسی، مئی ۱۹۷۹ء میں ۴۵ سال کی عمر میں انتقال کر گئے، انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں محنت سے تعلیم حاصل کی تھی اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ قاہرہ مصر گئے اور جامعہ ازہر اور پھر قاہرہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور جامعۃ القاہرہ سے فن الجرح والتعدیل پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی، اس سے ان میں تصنیف و تحقیق کا اچھا ذوق پیدا ہو گیا تھا، فن اسماء الرجال ان کا خاص موضوع رہا تھا، اس کے ساتھ فقہ اللغۃ میں انہوں نے اچھی محنت کی تھی، وہ الجزائر کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انہوں نے ۱۹۵۵ء میں داخلہ لیا تھا، وہ ہمارے ندوی حلقہ کے اسی مدت میں انتقال کرنے والے مولانا سید محمد الحسنی اور مولانا اسحاق جلیس ندوی کے تقریباً ہم عمر تھے۔

ڈاکٹر اسماعیل ندوی مدراسی کا سانحہ وفات علمی وادبی خسارہ ہے، امید تھی کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے امت کو بڑا نفع پہنچائیں گے، ان کا اہم علمی کارنامہ سیرۃ النبی از علامہ شبلی نعمانی جلد اول کا عربی ترجمہ بھی ہے، اس کے علاوہ انہوں نے اور بھی علمی کام کیئے اور ترجمے کیئے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو اپنے دامن عفو میں جگہ دے، اور ان کی خدمات وحسنات کو قبول فرمائے۔ آمین

مولوی امین الدین شجاع الدین

۱۳۷۵ھ ۱۹۵۵ء تا ۱۴۳۳ھ ۲۰۱۲ء

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاد اور ایک پختہ کار صحافی عزیز گرامی مولوی امین الدین شجاع الدین شیخ جو ممبئی (مہاراشٹر) سے قریب بھیونڈی کے رہنے والے تھے زبان وقلم کے ذریعہ دین وملت کی اچھی خدمت انجام دے کر ۷؍جون ۲۰۱۲ء مطابق ۱۷؍رجب المرجب ۱۴۳۳ھ کو لکھنؤ میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون.

مولوی امین الدین شجاع مرحوم سے میں عرصہ دراز سے واقف ہوں جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اسی وقت سے وہ رابطہ رکھتے تھے، بعد میں بھی انہوں نے رابطہ رکھا، اور اب تو اسی ادارے سے تدریسی طور پر وابستہ ہو گئے تھے، وہ اچھی طبیعت، اچھی فکر اور اسلامی نقطۂ نظر رکھنے والے صحافی تھے، وہ اسلامی افکار و نظریات کو اچھے اور عصری اسلوب میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے ان کی خدمات مختلف اخبار وجرائد اور مجلّات لیتے رہے، ان میں ہمارے ندوۃ العلماء کا ترجمان ''تعمیر حیات'' خاص طور پر قابل ذکر ہے، مولوی امین الدین شجاع الدین مرحوم استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء نے معروف شخصیتوں کی خصوصیات کا مطالعہ کیا اور بعض بڑی اور اہم شخصیات سے انہیں قرب واختصاص بھی رہا اور ان کے ساتھ رہ کر ان ضرورتوں کو سمجھا جن کی ملت کو زیادہ ضرورت ہے، پھر صحافت کے ذریعہ اس ضرورت سے دوسروں کو آگاہ کیا اور ان شخصیات سے متعلق لکھنے میں بھی اچھا انداز اختیار کیا، دعوت فکر وعمل دینے والے

مضامین کا مجموعہ ''نقوش فکر وعمل'' کے نام سے اور شخصیات سے متعلق مضامین کا مجموعہ ''ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم'' شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے اور جو انہوں نے ملی وملکی مسائل سے متعلق ذمہ دار حضرات سے انٹرویو لئے تھے جو مختلف جرائد واخبارات میں شائع ہوئے ان کا یہ مجموعہ بھی بعض شاگردوں نے مرتب کرلیا ہے، افسوس ہے کہ ان کی حیات میں یہ مجموعہ منظر عام پر نہ آسکا۔ ان کی تقریری صلاحیت کا اندازہ اور مشاہدہ پیام انسانیت کے ایک بڑے جلسہ میں ہوا جو بوڑیہ ہریانہ میں وہاں کی ہردلعزیز شخصیت حافظ حسین احمد صاحب نے منعقد کیا تھا وہاں انہوں نے اس موضوع پر خطاب بھی کیا اور وہ اس میں بہت کامیابی سے گزر گئے، خوشی ہوئی کہ اس میں بھی ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا گیا۔

مولوی امین الدین مرحوم یکم دسمبر ۱۹۵۵ء کو ایک علم دوست اور دین پسند گھرانہ میں پیدا ہوئے جس کے اثرات ان کی زندگی کے مختلف گوشوں میں صاف نظر آتے تھے، اور صرف انہی میں نہیں ان کے بھائیوں میں بھی نظر آتے ہیں، جن میں ان کے ایک چھوٹے بھائی ڈاکٹر خلیل الدین شجاع الدین صاحب کو اللہ نے حرم مکی میں رہ کر خدمت خلق کا اچھا موقع بھی عطا فرمایا ہے، جہاں عیادۃ الحرم (حرم کلینک) میں علاج ومعالجہ کے ذریعہ خدمت انجام دے رہے ہیں، اور دوسری طرف حرم شریف کی برکات سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں (آج کل وہ ٹورنٹو میں مقیم ہیں، اور وہیں پریکٹس کررہے ہیں)۔

مولوی امین شجاع مرحوم میں عصری تعلیم اور دینی تعلیم کا امتزاج تھا، انہوں نے عصری تعلیم حاصل کر کے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں خصوصی کے درجات میں داخلہ لیا جو عصری تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے قائم کئے گئے ہیں، گو مسلسل علالت کی وجہ سے ندوہ کے خصوصی کا کورس پورا نہ کرسکے البتہ دارالعلوم دیوبند میں انہوں نے داخلہ لے کر یہ کسر پوری کی اور انھیں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے خاص تعلق قائم ہو گیا تھا جو عقیدت میں بدل گیا اور بیعت بھی ہو گئے۔ حضرت قاری صاحب کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے تجدید بیعت کی، اور ان کے بعد لاہور پاکستان

کے سفر میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کے ایک دوسرے خلیفہ اور رہبر طریقت حضرت شاہ سید نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ سے اصلاحی تعلق کی تجدید کی، اس طرح انہوں نے اپنے کو کبھی اصلاح واستفادہ سے مستغنی نہیں سمجھا اور کسی نہ کسی بزرگ کے دامن فیض سے وابستہ رہے۔ ان کو جامعۃ الہدایہ جے پور کے بانی اور اول امیر حضرت شاہ عبدالرحیم جے پوری علیہ الرحمہ کی بھی خصوصی توجہ اور شفقت حاصل رہی، اور ان کے ایماء پر انہوں نے وہاں بھی اپنی خدمات پیش کیں۔

ندوۃ العلماء کے ترجمان تعمیر حیات کے زمانۂ ادارت میں وہ ملتے، مشورہ کرتے اور ان کی خواہش ہوتی کہ افتتاحی مضمون ہم میں سے کسی کے قلم سے ہو اور اکثر ان کی فرمائش کی تکمیل میرے حصہ میں آتی، وہ ہم میں نہیں رہے لیکن ان کی یادیں قائم ہیں، اسپتال میں ان کو دیکھ کر یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی صدمہ کی بات نہ سننی پڑے، آخر انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، اور اپنے شاگردوں اور قلمی یادگاروں کے صدقۂ جاریہ کے ساتھ وہ اپنے مالک حقیقی کے حضور حاضر ہوگئے۔ رحمه الله رحمةً واسعةً وادخله في جنت النعيم۔

مولوی برجیس احمد ندوی دربھنگوی

۱۳۷۱ھ ۱۹۵۲ء تا ۱۴۲۰ھ ۲۰۰۰ء

۱۴؍ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ / ۲۱؍مارچ ۲۰۰۰ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لائق استاد مولوی برجیس احمد ندوی دربھنگوی نے صرف ۴۸ سال کی عمر میں لکھنؤ میں وفات پائی، ان کی صحت پہلے سے کمزور تھی لیکن وہ زمانہ طالب علمی سے ہی ممتاز اور سعادت مند تھے، انہوں نے دارالعلوم دیوبند، اوردارالعلوم ندوۃ العلماء دونوں جگہ تعلیم حاصل کی، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہاں استاد ہوگئے، اورنحو، بلاغت اورتعبیر کے اسباق ان سے متعلق ہوئے اور پھر حدیث وتفسیر کے اسباق بھی ان کے ذمہ کردیئے گئے، اس کے علاوہ ادب کی بھی اہم کتابیں ان کے زیرتدریس رہیں، اورطلبہ ان سے بڑے مطمئن رہے، اللہ نے ان کو تفہیم کی اچھی صلاحیت عطافرمائی تھی اوران کو علم وادب میں اچھی استعداد حاصل تھی جس سے انتظامیہ انھیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

شروع میں ان کے قلم سے مضامین ومقالات اورترجمے بھی سامنے آئے لیکن پھر تدریس میں ہی یکسو ہوگئے، اورطلبہ کے لئے اپنے کو وقف کردیا جو طالب چاہتا ان سے استفادہ کرتا وہ طلبہ میں اخلاق وتربیت کی اصلاح کی بھی فکر رکھتے اوران کی یہ کوشش انفرادی ہوتی اورمؤثر ہوتی، ان کی ان خصوصیات اورصفات کی بنا پر ندوۃ العلماء ان کے سانحۂ وفات کو ادارے کے لئے ایک بڑے خسارہ کے طور پر دیکھتا ہے، اوران کے لئے مغفرت ورفع درجات اوران کی خدمات وحسنات کی قبولیت کی دعا کرتا ہے۔

مولانا خواجہ بہاء الدین اکرمی ندوی

۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء تا ۱۴۱۱ھ ۱۹۹۰ء

دنیا میں جو آتا ہے جانے ہی کے لیے آتا ہے، مگر بعض شخصیتوں کے جانے سے قوم وملت کا بڑا نقصان ہوتا ہے، مولانا خواجہ بہاء الدین اکرمی ندوی مرحوم انہیں میں سے ایک تھے، آپ کا انتقال ۷/دسمبر ۱۹۹۰ء کو بروز جمعہ بھٹکل میں ہوا، اور اس طرح بھٹکل اپنے ایک مایہ ناز فرزند سے محروم ہوگیا، وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، تقریباً ۸۸ سال کی عمر پائی۔ ابتدائی تعلیم بھٹکل میں حاصل کی، مدراس کے مدرسہ محمدیہ میں چار سال تعلیم حاصل کی اس کے بعد وہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ آئے اور مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے رفیق درس رہے، زمانہ طالب علمی ہی میں سید الطائفہ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی نظر شفقت انہیں حاصل رہی، تاریخی ذوق اور علمی شغف اور تحقیق وجستجو کی صلاحیت کی بنا پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جنوبی ہند کی تاریخ پر کام کرنے کا مشورہ دیا تھا، جس کی ابتداء زمانہ طالب علمی ہی میں انہوں نے کردی تھی جو بعد میں ایک اہم تصنیف اور علمی حلقوں میں ان کے تعارف کا ذریعہ بنی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بڑا گہرا تعلق تھا جس کا اظہار آپ کے اس تعزیتی نوٹ سے ہوتا ہے جو انھوں نے مرحوم کے داماد محی الدین منیری صاحب کو تحریر کیا ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ

''ہمارے رفیق قدیم ومحترم مولانا خواجہ بہاء الدین اکرمی ندوی

نے سفرِ آخرت اختیار کیا اور ہم سب کو مفارقت کا داغ دے گئے، بڑا افسوس ہوا کہ ہمارے قدیم ترین اور فاضل رفیق ہم سے جدا ہو گئے جب بھٹکل آنا ہوتا تھا تو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر پرانی یاد تازہ کرتے تھے، ان کی محبت اور اخلاق سے سرفراز ہوتے تھے، آپ کے تو بزرگ خاص اور قابل فخر عزیز تھے، آپ بھی تعزیت قبول کریں اور عزیزوں کو ہماری طرف سے تعزیت کر دیں''۔

مولانا کا وطن بھٹکل تھا، شروع ہی سے مولانا علمی اور سماجی کاموں میں دلچسپی لیتے رہے، تحریک خلافت میں مرحوم جوش وخروش کے ساتھ شریک رہے، اچھے مقرر تھے، تحریک کے تعلق سے ان کی تقریریں بڑی مفید اور ولولہ انگیز ہوا کرتی تھیں، وہ مختلف اخباروں اور رسالوں کے مدیر بھی رہے، بمبئی سے شائع ہونے والے ہندوستانی اخبار کی ادارت کافی عرصہ تک کی، النوائط کے نام سے ایک ماہ نامہ جاری کیا جو ایک عرصہ کے بعد بند ہو گیا، شافعی فقہ پر بڑا عبور حاصل تھا، آپ کی تصنیف ''عرب و دیارِ ہند'' ایک شاہکار تاریخی تصنیف ہے جس پر ریاست میسور کی اردو اکیڈمی نے آپ کو انعام سے نوازا تھا، یہ کتاب ہندوستان میں عربوں کی آمد اور جنوبی ہند کے مسلمانوں کے تاریخی کارناموں سے پُر ہے، مولانا نے اس کتاب کو بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔

مولانا نے علمی خدمات کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کی، مرحوم کی پُر ہجوم زندگی اور علمی مشغلہ ایک یادگار چیز ہے وہ بھٹکل کے علمی اور سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے وہ مطالعہ کے بڑے دلدادہ تھے، اس ضعیفی میں بھی علمی کتابوں کے مطالعہ کا ذوق وشوق آخر وقت تک قائم رہا، مرحوم بھٹکل کے قدیم علماء کی آخری کڑی تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین

مولانا سلمان خان ندویؒ

۱۳۴۷ھ ۱۹۲۸ء تا ۱۴۱۲ھ ۱۹۹۱ء

مولانا سلمان خان ندوی بھوپالی کا جو عرصہ سے شکر اور دل کے امراض میں مبتلا تھے، ۱۷ رمئی ۱۹۹۱ء کو انتقال کر گئے۔

مولانا سلمان خان ندوی مولانا عمران خان ندوی کے چھوٹے بھائی اور معتمد خاص تھے، انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دارالعلوم تاج المساجد کی خدمت میں گزارا، اور اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو جو ان کو سپرد کی جاتی رہیں محنت و جانفشانی اور اخلاص و ایمانداری سے انجام دیں۔ دارالعلوم تاج المساجد کی تعمیر کو اس منزل تک پہنچانے میں جن اشخاص کے خون پسینہ بہے ان میں مولانا سلمان خان ندوی کا نام سرفہرست ہے، آپ نے دارالعلوم کے مختلف شعبہ کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیا اور جب آپ کو دارالعلوم کا نائب مہتمم بنایا گیا تو آپ نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے تعلیمی وانتظامی امور کو باحسن وجوہ پورا کیا۔

مولانا سلمان خان ندوی ۱۹۲۸ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم وتربیت وہیں حاصل کی خاندانی روایات کے مطابق دارالعلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا اور اپنے برادر بزرگ مولانا محمد عمران خاں ندوی جو اس وقت جامعہ ازہر سے فارغ ہو کر آچکے تھے اور ندوہ کے اہتمام کی ذمہ داری پر فائز تھے، ان کی سرپرستی ونگرانی اور رہنمائی میں دوسرے بھائیوں کی طرح اپنی تعلیم مکمل کی۔

ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد بھوپال میں مستقل قیام کیا اور اوقاف کے شعبہ کی

ملازمت اختیار کی اور کثیر العیال ہونے کے باوجود اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کا مناسب بندوبست کیا اور اپنے دسوں صاحبزادگان کو حافظ اور عالم بنایا۔

۱۹۷۰ء کے بعد جب مولانا محمد عمران خان ندوی مرحوم کے ذہن ودماغ میں نواب شاہ جہاں بیگم کی نامکمل مسجد کی تکمیل اور اس سے ملحقہ کھنڈرات کو عالیشان مسجد اور مسلمانوں کی تہذیبی علامت بنانے کا تخیل پیدا ہوا تو اسی تخیل کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جن مردان کار کی ضرورت تھی اس کے لیے مولانا کی جوہر شناس نگاہ اپنے چھوٹے اور سعادت مند بھائی مولانا سلمان خان پر پڑی، بلاشبہ مولانا سلمان خان نے جس سعادت مندی اور جس محنت وجفاکشی کے ساتھ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اس کا تصور بھی مشکل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو اعلیٰ ترین انسانی اوصاف سے متصف کیا تھا اور متوازن صفات سے نوازا تھا آپ کے اندر جلالی وجمالی صفات کے حسین امتزاج کی جھلک تھی، ایک طرف رعب وداب، وقار وتمکنت اور جفاکشی تھی تو دوسری طرف ملنساری وخوش خلقی، رواداری واپنائیت تھی، اسی طرح ایک طرف عجز وانکساری اور دوسروں کے احترام نفس کا خیال تھا تو دوسری طرف عظیم ترین انتظامی صلاحیت کا اظہار اور اس کا مشاہدہ ان اشخاص نے تو بخوبی کیا جو ندوہ کے پچاسی سالہ اجلاس میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔

مولانا سلمان صاحب اکثر کہا کرتے تھے، عہدے اور درجات کام کے لیے ہوتے ہیں نام کے لیے نہیں، آدمی عہدوں سے نہیں بنتا، بلکہ عمل اور قربانی سے بنتا ہے، آدمی محنت کرے اور کچھ کر کے دکھائے تو اس کے سامنے عہدے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

مولانا سلمان خان صاحب تبلیغی کاموں میں پیش پیش تھے، ہزاروں میل کے سفر کئے اور حضرت مولانا محمد یوسفؒ سے خصوصی ارادت وبیعت کا تعلق تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو اور جن نعمتوں سے نوازا، ان میں یہ بھی ایک نعمت ہے کہ ان کو دس گیارہ حج نصیب ہوئے، مرحوم کے پسماندگان میں دو بھائی، دو بہنوں کے علاوہ تین بچیاں اور دس اولاد نرینہ ہیں جو سب کے سب ماشاء اللہ حافظ وعالم ہیں۔

شاہ سید تسلی حسن مرحوم رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مجھے اپنے جن ساتھیوں سے تعلق رہا، ان میں ایک شاہ تسلی حسن مرحوم بھی تھے، یہ حضرت مولانا شاہ وارث حسن صاحب جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ اور حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی کے پہلے مربی اور شیخ تھے، ان کے تیسرے فرزند تھے، سب سے بڑے صاحبزادے شاہ واعظ حسن مرحوم اپنے والد حضرت مولانا شاہ وارث حسن کی جگہ ٹیلے والی مسجد کے احاطہ میں مقیم رہے، اور مسجد کی خدمت کو اختیار کیا، اور وہیں وفات پائی، انہوں نے اپنے صاحبزادے مولوی فضل الرحمٰن واعظی کو ندوۃ العلماء میں تعلیم کے لیے داخل کرایا تھا، دوسرے صاحبزادے شاہ تشفی حسن تھے، جو میرے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی حسنی کے ہم عمر اور ہم درس تھے، انہوں نے ندوۃ العلماء میں تعلیمی وقت گذارا، اور بھائی صاحب اور ان کے رفقاء کے ساتھ جن میں خاص طور سے مولانا عبداللہ عباس صاحب اور مولانا مجیب اللہ ندوی وغیرہ قابل ذکر شخصیات ہیں، پھر وہ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے، تیسرے صاحبزادے شاہ تسلی حسن مرحوم میرے ہم عمر اور ہم درس تھے، اور بعد میں جب ہم لوگ اپنے مکان واقع گوئن روڈ امین آباد لکھنو سے قریب کے محلّہ گولہ گنج میں خاتون منزل آگئے، تو شاہ تسلی حسن مرحوم کے پڑوسی بھی ہوگئے جو پہلے سے یہاں مقیم تھے، وہ متعدد دینی خصوصیات کے حامل تھے، جن میں ایک بڑی خر... نمازوں کا جماعت کے ساتھ اہتمام تھا، اور مسجد میں صف اول کا انہیں بڑا

خیال رہتا تھا، اس کے ساتھ وہ ارشاد وتربیت کی بھی خصوصیت رکھتے تھے، اوران کا ایک حلقہ ارادت واسترشاد تھا، جس کے افراد لکھنو میں بھی تھے اور دوسری جگہ بھی تھے، اوراسی تعلق سے ان کا بنارس کا سفر ہوتا، جہاں وہ اعتکاف کرتے اورلوگ ان سے مستفید ہوتے، ان کا انتقال ہوا تو انہیں بنارس لے جایا گیا اوران کی خانقاہ ان کی آرام گاہ بنی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور درجات بلند کرے آمین۔

ان کی اہلیہ کا تعلق ہمارے ہنسوہ فتح پور کے خاندانی اعزہ سے تھا، اس رشتہ سے ان سے رشتہ داری کا تعلق بھی قائم ہوگیا تھا پھر مزید ان کی اولاد میں بعض کے رشتہ ہمارے عزیزوں میں ہوئے، اور پرانے دوستانہ تعلق سے رشتہ داری کا یہ تعلق مزید مستحکم ہوا، اولاد میں دو صاحبزادے سید سلمان اور سید عمران اور دو صاحبزادیاں اپنے پیچھے چھوڑی، سلمان امریکہ میں مقیم ہیں اور عمران نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلیم حاصل کی، اور وہ اپنے والد کے کاموں کو دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر سید ابراہیم ندوی

۱۳۵۵ھ ۱۹۳۷ء تا ۱۴۱۲ھ ۱۹۹۱ء

یہ خبر ندوہ کے حلقہ میں بجلی بن کر گری کہ ایک ذی استعداد و نیک نام، فاضل ندوہ، پروفیسر ڈاکٹر سید ابراہیم ندوی کا حیدر آباد میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے جون ۱۹۹۱ء کو انتقال ہو گیا۔

مرحوم ندوہ کے ہونہار فاضل اور عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویٹ ایم.اے، اور پی.ایچ.ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی، اور اسی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر تھے، ابھی عمر پچاس سال سے بھی کم تھی۔ ڈاکٹر سید ابراہیم ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا سید ہاشم بھی ندوہ کے فاضل تھے، اصل وطن استھاواں (بہار) تھا، حضرت سید صاحبؒ کے قرابت مندوں میں تھے، دارالترجمہ حیدر آباد سے وابستہ تھے اور وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی تھی، ڈاکٹر سید ابراہیم کو انہوں نے ندوہ میں تعلیم دلائی یہ پورا خاندان دینی معاشرت اور اسلامی اخلاق کا نمونہ ہے، ندوہ کی تعلیم نے عربی زبان، فقہ و تفسیر میں جو ملکہ پیدا کیا تھا وہ یونیورسٹی کے ماحول میں بھی بدستور قائم رہا۔ عربی رواں بولتے اور لکھتے تھے، نئے علوم سے آشنا تھے اور اپنی قدیم ثقافت کے دلدادہ تھے، ثقہ اور پابند اوقات تھے صورت و سیرت ایک عالم دین کے شایان شان تھی، حکومت ہند نے ان کو عربی دانی کا ایوارڈ بھی دیا تھا، اور یونیورسٹی نے ان کو ان دانشوروں کی فہرست میں اولین مقام دیا تھا جو بین الاقوامی سیمینار یا مباحثہ میں اس کی نمائندگی کر سکیں، وہ رابطہ ادب اسلامی کے بھی

ممبر تھے اور اس کے ایک اجلاس میں شرکت کے لیے استنبول بھی گئے تھے۔

۱۹۸۸ء میں سعودی عرب کی حکومت نے ان کو حج کا دعوت نامہ بھی بھیجا تھا مگر وہ چاہتے تھے کہ پہلا حج اپنے خرچ پر اور عام حجاج کی طرح ادا کریں، اس لیے اس دعوت سے مستفید نہیں ہوئے، مگر معذرت کا سبب تقویٰ تھا اور یہ جذبہ کہ حرمین شریفین کی پہلی حاضری فدویانہ طریقے پر ادائیگی فریضہ کے لیے تمام شرائط واصول کے ساتھ ہو، زندگی سادہ اور تصنع سے پاک تھی، اپنی مادر علمی (ندوہ) سے عقیدت ومحبت کا تعلق رکھتے تھے، اپنے فرزند مولوی سید راشد نسیم ندوی سلمہٗ اللہ کو تعلیم کے لیے ندوہ بھیجا جو ماشاء اللہ دینی علم واخلاق کا نمونہ اور ذی استعداد فاضل ہیں، ان کے دوسرے صاحبزادوں نے انجینئرنگ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی ہے، مگر سب کی وضع وقطع ظاہری صورت اور اخلاق وسیرت خالص مشرقی اور اسلامی ہے، مولوی سید راشد نسیم ندوی (۱) مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور رائے بریلی میں اہتمام کا کام بھی سنبھالے ہوئے تھے، جس سے ان کا اور ان کے والد کا مقصد یہ تھا کہ حضرت مولانا علی میاں سے قریب رہیں اور ان کی صحبت سے مستفید ہوں، موصوف کو ان کے والد ماجد (ڈاکٹر سید ابراہیم ندویؒ) کی وفات کی اطلاع بھی مدرسہ میں ملی، حضرت مولانا پر بھی اس حادثہ کا گہرا اثر پڑا اور سید راشد نسیم سلمہٗ اللہ کو اپنے عزیز بھتیجے مولوی محمد الحسنیؒ کے ساتھ لکھنؤ بھیجا اور یہاں سے ان کو حیدرآباد کے لیے روانہ کیا گیا۔

---

(۱) مولانا ڈاکٹر سید راشد نسیم ندوی ۱۵ جون ۱۹۶۵ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے، دیندار گھرانہ میں مولانا کی پرورش ہوئی، اسکول کی ثانوی تعلیم کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا، لکھنؤ یونیورسٹی سے ماسٹرز کر کے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی، حیدرآباد کی مختلف مساجد میں آپ کا درس قرآن ہوتا ہے، آپ اپنے درس میں نقلی دلائل کے ساتھ عقلی دلائل سے بھی لوگوں کو قائل کرتے ہیں، قدیم عربی ادب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی بناء پر آپ کو صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے ایوارڈ سے نوازا گیا ہے، مولانا کی نگرانی میں بہت سارے شہروں اور دیہاتوں میں دینی مدارس کام کر رہے ہیں، رابطہ ادب اسلامی حیدرآباد شاخ کے سکریٹری بھی ہیں، بڑے معتدل مزاج اور سادہ طبیعت کے حامل، وسیع فکر والے، بلند اخلاق والے ہیں، عربی میں آپ کی اہم تالیف "مباحث فی الترجمة لمعانی القرآن الکریم" شائع ہو کر علمی حلقوں میں مقبول ہو چکی ہے۔

مولوی سید سعید حسن ندوی بستوی

۱۳۷۴ھ ۱۹۵۵ء تا ۱۴۳۴ھ ۲۰۱۲ء

امیر المومنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مولانا سید جعفر علی نقوی بستوی (۱) کے خاندان والاشان کے فرزندوں میں انتہائی خصوصیت رکھنے والے فرد، مولانا

---

(۱) مولانا جعفر علی نقوی کی پیدائش ۲۰ رمضان ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء کو ضلع بستی کے مجھوا میر نامی گاؤں میں ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے مزید علم کی طلب میں مولانا حیدر علی صاحب کے پاس لکھنؤ جا کر رہے، اسی طرح دہلی میں مولانا شاہ محمد یعقوب اور مولانا اسحاق صاحب سے بھی استفادہ کیا، اور مولانا محمد علی رامپوری کی معیت ومصاحبت حاصل ہوئی، معرکہ بالاکوٹ سے پہلے درس مشکوۃ میں شریک ہوکر براہ راست حضرت علیہ الرحمۃ اور مولانا محمد اسماعیل شہید سے بھی مستفید ہوئے، مولانا نے دو نکاح فرمائے تھے ایک تو حقیقی چچازاد بہن سے ہوئی اور دوسرا نکاح مولانا محمد علی رامپوری کی صاحبزادی بی بی فاطمہ سے ہوا تھا، اور دونوں سے آپ کو دو صاحبزادیاں تھیں، عین عنفوان شباب یعنی پچیس سال کی عمر میں سفر جہاد پر روانہ ہوئے، جو تقریبا دو سال پر محیط تھا، اسی طرح دوسرا اہم اور طویل سفر حج کا فرمایا تھا، مولانا کے اندر علمی تحریری وتقریری صلاحیت بے پناہ تھی، اسی صلاحیت کو دیکھ کر مولانا کو میر منشی کا عہدہ لشکر مجاہدین میں تفویض کیا گیا تھا، مولانا کے ذمہ خاص کام یہ تھا کہ اصل روزنامچہ وواقعات کی تحریر کے بعد اس کی صفائی وتہذیب کریں۔

انہوں نے سب سے پہلے اپنے والد صاحب ہی کے ہاتھوں پر حضرت سید صاحب سے بیعت کی، اس لیے کہ آپ کے والد رحمۃ اللہ علیہ حضرت امیر المؤمنین کے خلفاء میں سے تھے، پھر سفر جہاد میں حضرت امیر المؤمنین سے براہ راست ملاقات ہونے کے بعد جمعہ کے روز خصوصیت سے ان کو اوران کے رفقاء کو بیعت سے سرفراز فرمایا، مولانا ۱۲ رمضان ۱۲۴۵ھ کو حضرت علیہ الرحمۃ کی خدمت میں پہونچے تھے، کمال اخلاق سے متصف، استغناء کی شان رکھنے والے، زہد وقناعت میں بے مثال، تواضع وانکساری میں لاجواب، حلم وعفو میں باکمال، غیبت سے احتراز کرنے والے، اخلاص وللّٰہیت سے معمور، ایمان ویقین سے بھرپور تھے، مولانا لشکر اسلام میں اپنے ساتھ ۳۹ افراد کو لے کر پہونچے تھے، اس وقت حضرت امیر المؤمنین کا قیام امب میں تھا،

سید محمد مرتضٰی نقوی بستوی جامعہ مظاہر علوم سہارن پور کے فاضل اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے سابق استاد و ناظر کتب خانہ ندوۃ العلماء تھے جو برادر مشفق و معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی مرحوم کے مظاہر علوم سہارن پور میں رفیق درس و سکونت اور لکھنؤ کے قیام کے ابتدائی زمانہ میں ہم محلّہ اور پڑوسی تھے، اس طرح ان کے گھرانہ سے ہمارے گھرانہ کا قریبی تعلق قائم ہوا اور ندوۃ العلماء کے تعلق سے بھی ملاقات، تبادلۂ خیال اور رائے مشوروں میں ساتھ ہونے سے اور اس تعلق سے جو ان کو حضرت سید احمد شہید اور ان سے خاندانی نسبت رکھنے والوں سے تھا زیادہ محبت و تعلق کا انداز ظاہر ہوا، اور یہ تعلق ان کے بھائیوں اور اولاد میں بھی منتقل ہوا، ان کے بھائیوں میں برادر عزیز مولوی سید محمد اجتباء حسینی ندوی مرحوم نے دار العلوم ندوۃ العلماء

= امب، مایار اور پھر بالاکوٹ کے معرکہ میں داد شجاعت دی، اور آخر وقت تک حضرت کے ساتھ معرکہ میں رہے، اور گمشدگی کی خبر پھیلنے کے بعد جب مجاہدین قطار در قطار شہید ہونے لگے، اس وقت حوصلے سے کام لے کر شیخ ولی محمد پھلتی کے ساتھ بقیہ مجاہدین کو وہاں سے نکالا، جب امیر المؤمنین کی حیات کے بارے میں کوئی امید نہ رہی، تو گھر جانے کا ارادہ کیا، ۲۶ ذی الحجہ کو وطن کے لیے روانہ ہوئے، سب قیمتی ہتھیار چھوڑ کر ضرورت کے لیے معمولی ہتھیار لے لیے، مولانا کے پاس بطور تبرک مولانا اسماعیل شہید کے چند خطوط اور بعض تحریریں، ایک قلمدان ایک قینچی بھی تھی راستے میں سب چوری ہوگیا، سفر جہاد سے واپسی کے بعد مولانا نے اپنے آپ کو دعوت و تبلیغ اور اصلاح وارشاد کے کام کے لیے وقف فرما دیا تھا، ضلع بستی و گورکھپور، چھپرا نیپال کی ترائی اور اترولہ سے لے کر دیوریا کے حدود تک موجودہ یوپی کے آخری حدود اور ضلع سیوان کے ابتدائی حدود تک حضرت مولانا کی تبلیغی جانفشانی اور اشاعتی سرگرمی کی رہین منت ہے، حضرت کے حالات و خوارق عادات کا اب تک لوگوں میں چرچا ہے، آپ کی تمام تر توجہ مشرکانہ رسوم کے مٹانے اور دینی احکام کے رواج دینے کی طرف منعطف رہی، ۱۲۸۸ھ ۲۰ رمضان المبارک کو یہ علم و تبلیغ کا چمکتا ہوا ستارہ ایک عالم کو اپنے علم نبوت سے منور کرنے کے بعد ستر برس کی عمر میں غروب ہوگیا، اور اپنے وطن ہی مجھوا میر کے مقبرہ میں آسودہ خاک ہوئے۔

مولانا کا عظیم الشان کارنامہ ان کی شہرہ آفاق کتاب "منظورۃ السعداء فی أحوال الغزاۃ والشهداء" ہے، جس کا فارسی نام تاریخ احمدیہ اور یہی تاریخی نام بھی ہے، جس سے تاریخ تالیف ۱۲۷۹ھ نکلتی ہے، والیان ریاست ٹونک نے حضرت امیر المؤمنین کے متوسلین کو ٹونک میں بلا کر آباد کیا، تو مولانا کو بھی دعوت دی، مولانا نے ایک طویل وقفہ کے لیے ٹونک میں قیام کر کے اس کو مکمل کیا، یہ کتاب نہایت مبسوط دو جلدوں میں ہے، لیکن مکمل طور پر کہیں محفوظ نہیں، ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں اس کے تین نسخے موجود ہیں، اسی طرح پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں دونوں جلدوں کی موجودگی کا تذکرہ ملتا ہے۔ (حیات جعفر، کاروان ایمان و عزیمت، ص۔۹۰)

میں پڑھا اور پھر پڑھایا بھی، اور ایک عزیز بھائی کی طرح ہم لوگوں کے ساتھ رہے اور ان سے بڑے اور مولانا سے چھوٹے بھائی مولوی سید عبداللہ صاحب مرحوم میرے ہم عمر بھی تھے، اس طرح ان سے بھی مناسبت و تعلق رہا اور سب سے بڑے ادریس صاحب مرحوم (والد عزیزان مولوی شعیب و مولوی عزیر سلمہما) تھے، وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحب سے بیعت بھی تھے اور ہم سب کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ رکھتے تھے، اس طرح بالکل خاندان جیسا تعلق قائم ہو گیا تھا۔ مولانا سید مرتضیٰ صاحب مرحوم کے فرزندان نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی، ان کے فرزند اکبر عزیز گرامی مولوی مفتی عبیداللہ صاحب اور مولوی سید سعید حسن مرحوم نے امتیازی حیثیت سے تعلیم حاصل کی اور نمبرات حاصل کئے، اور ان دونوں سے اور ان کے تیسرے بھائی مولوی سید محمد عمیر حسینی ندوی سے تعلیم کے رشتہ سے بھی تعلق قائم ہوا، ان بھائیوں نے اس تعلق کو پورے لحاظ کے ساتھ قائم رکھا۔ مولوی عبیداللہ صاحب نے دارالعلوم دیوبند جا کر مزید تعلیم حاصل کی اور حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب سے اصلاح و استفادہ کا تعلق پیدا کر کے دینی ترقی بھی کی اور ان کے تعلق کی بناء پر اسعدی نسبت اختیار کی اور ان کے ممتاز و قابل رشک شاگرد و مسترشد اور نامور خلیفہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی کی خدمت میں رہ کر ان کے مدرسہ جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ میں تدریسی وقت گزارا، اور فقہ و حدیث کے ممتاز استاد کے طور پر ابھرے اور اس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کرتے ہوئے متعدد اہم کتابیں تصنیف کیں اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے رکن اور پھر سکریٹری کی حیثیت سے اور بھی نمایاں خدمات پیش کیں۔

جہاں تک ان کے بھائی عزیزی مولوی سید سعید حسن بستوی کا تعلق ہے، ان کو ندوہ کے بعد سعودی عرب جانے کا موقع ملا، اور وہاں ریاض میں جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ میں تعلیم حاصل کر کے تحفیظ القرآن کے ایک مدرسہ اور پھر بنات کے مدرسہ میں تدریسی خدمات پیش کرنے کا موقع ملا، اور اچھا علمی تعارف حاصل کیا، اور علمی حلقوں نے ان کی قدر دانی کی، اس طرح انھیں ہندوستانی اور عربی دونوں حلقوں میں کام کرنے کا موقع

ملا، اور وہاں رہتے ہوئے بھی ہم لوگوں سے اچھا تعلق رکھا، اور اپنے والد معظم سے جو خوبیاں انہوں نے وراثت میں پائی تھیں ان کا بھی اظہار ان کے طریقۂ کار میں ہوتا رہا، وہ تعطیلات میں ہندوستان آتے تھے اور اچھا ربط ظاہر ہوتا تھا، ان کی موجودگی میں مجھے ریاض جانے کا موقع ملا، تو وہاں ان کی ضیافت میں رہنا ہوا، وہ آخر میں ہندوستان واپس آ گئے تھے، اور یہاں علمی مشغولیت اختیار کر لی تھی، اور وہ اپنے خاندان اور علمی مشغولیت رکھنے والوں کے لئے تقویت اور انس کا ذریعہ رہے، لیکن مقدر میں ان کی عمر زیادہ نہ تھی لہٰذا وہ ہندوستان آنے کے دو تین سال کے اندر دنیا سے رخصت ہو کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، اور اپنے اہل تعلق کو مغموم کر گئے۔ میں اس وقت لکھنؤ سے باہر تھا اور عمرہ کے سفر پر تھا، وہاں یہ رنج دہ خبر ملی کہ وہ دنیا میں نہیں رہے، اچانک ملنے والی اس خبر نے دل ودماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، لیکن ایمان، عمل صالح کے ساتھ زندگی گزار کر دنیا سے جانا ایک مومن کے لئے معراج سے کم نہیں ہوتا، یہ واقعہ جمعہ ۱۵؍جون ۲۰۱۲ء کو پیش آیا، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں بڑے مجمع نے ان کی نماز جنازہ ادا کی۔

مولوی سید مرتضیٰ مرحوم کے کاموں میں متعدد اہم علمی کام ہیں، انہوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتابوں، تصنیفات ورسائل کو جمع کر کے ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں ایک کارنر مخصوص کر دیا، اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر بلاد عربیہ اور برصغیر ہندوستان وپاکستان میں جو کچھ لکھا گیا، تاثرات ومضامین کی صورت میں یا تصنیفات وتحقیقات کے طور پر ان کو بھی جمع کرنے کا کام کیا اور موضوع کے لحاظ سے ان کو تقسیم کر کے کتاب میں پیش کرنے کا بھی ان کا منصوبہ تھا، حضرت مولانا کی سبھی تصنیفات کی فہرست عربی اور اردو میں مرتب کرائی، چوں کہ یہ کام حضرت مولانا کی نظروں کے سامنے آ گیا تھا اس لئے ان کو حضرت مولانا کی خوب دعائیں اور توجہات بھی حاصل ہوئیں، ان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے والہانہ تعلق تھا اور یہ تعلق صرف ان کی شخصیت تک نہ تھا جو ان کے لئے محبوب ترین شخصیت تھے، ان کی دعوت وفکر کو موجودہ

حالات اور دعوت واصلاح کے کام کے لئے سب سے مفید اور اصلاح عوام کے لئے سب سے مؤثر سمجھتے تھے، ان کی فکر اس جذبہ کے ساتھ سامنے آئی کہ وہ حضرت مولانا کی تقریروں اور تحریروں کے اہم اقتباسات کو نمایاں کر کے پیش کرنے کے لیے مختلف طریقہ اختیار کرتے، انھی میں ان کا یہ کام بہت پسند کیا گیا کہ جو انہوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تقریر کا عنوان "أینقص الدین وأنا حی" کی وسلیاں تیار کرا کر جگہ جگہ پھیلائی جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ایک جلسہ میں کی تھی اور اس عنوان کو جو اصلاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ارتداد اور مانعین زکوٰۃ کے فتنہ کو روکنے کے لئے کیا ہوا تھا، مولانا کے اس جملہ کو اس وقت کے وائس چانسلر نے بہت پسند کیا تھا اور اسی جملہ کو وسلی میں نمایاں کر کے ان کو جامعہ اسلامیہ کی طرف سے پیش کیا تھا، جو آج بھی موجود ہے۔

اسی طرح دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے مولانا کی عام مسلمانوں کو وصیت جو دراصل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اپنے صاحبزادوں کو وصیت ہے، جس میں انھوں نے اپنی اولاد واحفاد سے یہ عہد لیا تھا کہ میرے نہ رہتے ہوئے بھی توحید پر مضبوطی سے قائم رہیں گے، جس کا ذکر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔

﴿أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي قَالُواْ نَعْبُدُ إِلَـهَكَ وَإِلَـهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَـهاً وَاحِداً وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ اس کو بھی اس کے درمیانی لفظ ﴿مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي﴾ کو زیادہ نمایاں کر کے اس پوری وصیت یعقوبی کی بھی وسلیاں تیار کرانے کا اہتمام کیا، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وفات سے چند دن پہلے ان کی رہائش گاہ پر بھی آویزاں کرایا، اور اس دور میں عام مسلمانوں کے لئے وصیت کے طور پر پیش کیا جو ان کی وفات کے بعد پوری ملت اسلامیہ کے لئے سب سے اہم وصیت سمجھی گئی اور اس کی خوب نقلیں عام ہوئیں، یہ سب عزیز مرحوم کے لئے ایک بہترین صدقۂ جاریہ ہے۔

اس کے علاوہ بھی حضرت مولانا کی فکرودعوت کے عام کرنے کے طریقے اختیار کئے اوران کے نام سے انٹرنیٹ پر ویب سائٹ بنوائی، یہ سب کچھ خالص دین کی بنیاد پر تھا اورحضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت وتوجہ سے انہوں نے جو فائدہ اٹھایا تھا اس کا اثر اور نتیجہ تھا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی اوران کے کاموں کی بڑی قدر تھی اور تعلق بھی تھا جوان کے نام خطوط سے سمجھا جاسکتا ہے، ان خطوط میں ان کے نام کے ساتھ عزیز سعید کے لفظ کا اضافہ بھی فرماتے تھے جس میں ان کے نام کی مناسبت کا بھی لحاظ ہوتا تھا۔

اسی طرح عزیز مرحوم کو ندوۃ العلماء اوراپنے اساتذہ سے جن سے انھوں نے پڑھا تھا، اوراپنے والدین اوران کے تعلق والوں سے بھی بڑا تعلق جوان کے ساتھ سلوک وبرتاؤ میں ظاہر ہوتا تھا اوراپنے بھائی بہن اوران اولاد کے ساتھ تعلق اور دیگر عزیز واقارب کے ساتھ اچھے برتاؤ میں سامنے آتا تھا، مہمان نوازی، صلہ رحمی، سخاوت، اور خدمت خلق یہ سب ان کی صفات تھیں، اوردین ودعوت اور تعلیم میں لگنے والوں کے ساتھ ان کی حوصلہ افزائی کے بھی ایسے طریقے اختیار کرتے تھے جس سے ان کی خودداری کو ٹھیس نہ پہنچے، اورتعاون بھی ہوجائے، وہ اپنی وفات سے قبل زندگی کے آخری دنوں میں بھی ایسے ہی کسی مفید علمی ودعوتی عمل میں مصروف تھے، اس طرح وہ ایک اچھی اوردوسروں کے لئے مفید زندگی گزار کردینی اور علمی کاموں میں شغل رکھتے ہوئے دنیا سے گئے اوراپنے نہایت رحیم وکریم پروردگار کے حضور میں حاضر ہوگئے، جہاں ان شاء اللہ وہ اپنی نیکیوں کا اچھے سے اچھا صلہ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اوردرجات کو خوب بلند فرمائے، آمین

ان کی عمر ۷۵ سال رہی ہوگی جو تعلیم وتربیت کے کاموں سے عبارت رہی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ

۱۳۰۲ھ ۱۸۸۴ء تا ۱۳۷۳ھ ۱۹۵۳ء

علامہ سید سلیمان ندویؒ ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء کو دیسنہ پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حکیم ابوالحسن ایک سنجیدہ عالم دین، ریاست اسلام پورہ کے شاہی طبیب اور نقشبندی ابوالعلائی سلسلہ کے شیخِ کامل تھے، ابھی آپ نے بڑے بھائی مولانا ابوحبیب سے ابتدائی تعلیم پاکر اپنے والد ماجد سے کچھ کتابیں ختم کی تھیں کہ ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف پٹنہ بھیج دیے گئے، وہاں ایک برس تک مولانا محی الدین سجادہ نشین سے کچھ اور کتابوں کی تکمیل فرمائی، ۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۶ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔ ندوہ میں حضرت علامہ کو اپنے محبوب استاد علامہ شبلی نعمانی کی آغوشِ تربیت میسّر آئی جس سے خداداد صلاحیتوں کو نشو ونما پانے کا بہترین موقع ملا، مولانا شبلی کو اپنے انتقال سے پہلے سیرت النبی کی ناتمامی کا رنج اور اس کی تکمیل کی فکر تھی چنانچہ انھوں نے سیرۃ النبی کے تمام مسودات کپڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کر دیے اور وصیت کی کہ "یہ مسودے حمید الدین فراہی اور علامہ سید سلیمان کے علاوہ کسی اور کو ہرگز نہ دیئے جائیں" اس سے استاد کا اپنے شاگرد پر خصوصی اعتماد ظاہر ہے۔

حضرت سید صاحب فارغ التحصیل ہونے کے فوراً بعد الندوہ جیسے بلند پایہ علمی ماہنامہ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، اس ڈھائی تین سالہ دور میں انھوں نے علوم وفنون پر ایسے بلند پایہ مضامین لکھے کہ جدید وقدیم حلقوں میں ان کی دھاک بیٹھ گئی، ان مضامین میں

اسلام اور اشتراکیت۔علم ہیئت اور مسلمان۔ اسلامی رصد خانے۔مفردات القرآن اور طبقات ابن سعد کا تعارف شامل ہیں۔

اسی زمانہ میں آپ کو ندوہ میں استاد مقرر کیا گیا اور پھر آپ پونہ کالج گئے اور وہاں بھی تحقیقی و تصنیفی مشغولیات جاری رکھیں، پھر علامہ شبلی نعمانی کا ۱۹۱۴ء میں حادثہ وفات پیش آیا، اور ان کی جگہ آپ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ناظم اور ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم مقرر ہوئے، اور اپنے استاذ کے چھوڑے ہوئے کاموں کی تکمیل میں لگ گئے اور ان سارے کاموں میں سیرۃ النبی کی تکمیل کو ترجیح دی اور دارالمصنفین سے علمی تحقیقی مجلّہ معارف نکالا جس نے بہت جلد بڑی شہرت حاصل کرلی، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ برصغیر ہندوپاک کی ان عظیم علمی شخصیتوں میں تھے جنہوں نے آزادئ ہند سے قبل حصول آزادی کے لئے کی جانے والی کوششوں میں سنجیدہ علمی وادبی دائرہ میں رہتے ہوئے مؤثر انداز میں شرکت کی، وہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کے ساتھیوں میں تھے، اور موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو سے بھی ان کا ربط وضبط تھا، وہ ملک کی اہم علمی وادبی اکیڈمی دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ذمہ دار رکن اور منتظم تھے، اس اکیڈمی کو جو اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے پُرمغز اور مؤثر لٹریچر تیار کرنے کے لئے قائم ہوئی تھی اس وقت کے نامور مفکر ومؤرخ علامہ شبلی نعمانی نے قائم کیا تھا، علامہ شبلی سے مولانا ابوالکلام آزاد بھی ربط رکھتے تھے، اور علامہ سید سلیمان ندوی تو ان کے خاص شاگرد ہی تھے، علامہ شبلی نعمانی اردو ادب کے اساطین میں تھے، اور تاریخ وادب پر ان کے لٹریچر نے ہندوستان کے اردو داں طبقہ کو ہمت وحوصلہ دیا، یہ ہمت وحوصلہ اسلامی دائرہ میں بھی تھا اور وطنی دائرہ میں بھی تھا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس سلسلہ میں اپنے استاد کی بہت اچھی نیابت کی، اور تاریخ وادب کے موضوع پر اچھا لٹریچر فراہم کیا، ان کا اسی کے ساتھ ساتھ صحافتی دائرہ میں بھی خاصہ حصہ رہا، وہ کچھ عرصہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ ان کے مشہور صحافتی کام ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں شریک ادارت بھی رہے، اور ان کے قلم سے بعض اہم اور اثر انگیز مضامین

ایسے بھی نکلے جن کا اچھا شہرہ ہوا، ان میں مشہد اکبر کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے آرگن ''معارف'' کے چیف ایڈیٹر رہے، اور ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''الندوہ'' کے ادارۂ تحریر کے سرپرست بھی رہے۔ ان دونوں پرچوں کے اداریوں کے ذریعہ سے انہوں نے اپنے وقت اور ملک کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے تعمیری مقاصد کی اچھی ترجمانی کی، ان کا اسلوب ایک دلکش اور متوازن اسلوب نگارش تھا، جس میں علم وادب کی باہم آمیزش ہوتی تھی، وہ ایک طرف علمی سطح پر ٹھوس اور سنجیدہ علمی مواد کا سہارا لیتے، دوسری طرف ان کے انوکھے ادبی اسلوب نے اہل علم کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی، اور متعدد شائقین نے اس اسلوب کو اختیار کرنے کی کوشش کی اور اس کی نقل کی، اور ان کے شاگرد اس سلسلہ میں ان کے خوشہ چیں بنے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کو لکھنے لکھانے کا شوق اوائل عمری ہی سے تھا، ندوہ آنے سے قبل ہی مضمون نگاری کا آغاز کر چکے تھے، الندوہ کی ادارت جو درحقیقت علامہ شبلی کی زیر سرپرستی نائب مدیر کی سی تھی، علامہ شبلی کے رنگ وآہنگ اختیار کرنے کا اچھا نمونہ رکھتی ہے، ان کو علامہ شبلی کا اعتماد حاصل رہا، اور ندوہ نے اس وقت کے مسلم علمی صحافت کا ایک نیا راستہ بنایا، مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ الہلال میں جب علامہ نے شرکت کی تو بعض ایسے مضامین بھی لکھے کہ جو کسی کا نام نہ دیئے جانے کی وجہ سے مولانا آزاد کے قلم کی تحریر معلوم ہوتے تھے، اس میں مشہد اکبر کو خاص طور پر بتایا جاسکتا ہے۔

مولانا شبلی کے انتقال کے بعد جب مولانا سید سلیمان ندوی دارالمصنفین سے پورے طور پر وابستہ ہوگئے تو معارف کی ادارت کی پوری ذمہ داری انہوں نے سنبھال لی، جس کا سلسلہ ان کے انتقال کے قریب تک رہا، معارف نے ماہانہ صحافت کا ایک اونچا معیار قائم کیا، اور ذہن سازی میں اس نے ایک اچھا کردار انجام دیا، سید سلیمان ندوی صاحب کے شذرات اس میں ممتاز حیثیت کے ہوتے تھے، جو اپنا مخصوص اسلوب رکھتے تھے، اپنی اس خصوصیات کی بنا پر وہ ماہانہ صحافت کا ایک الگ اسکول قرار دیا جاسکتا ہے۔

معارف کے شذرات اپنا ایک رنگ وآہنگ رکھتے ہیں جس کے انداز اور معیار کو ان کے جانشینوں نے بعد میں قائم رکھا، اس کو دیکھ کر اس کی خوبی اور نفاست کا بڑا احساس ہوتا ہے، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس خصوصیت کو ان کے شذرات سے دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا سید سلیمان رحمۃ اللہ علیہ نے تصنیفی اور تحقیقی میدان میں بڑا نام اور اونچا مقام بنایا ان کی بلند پایہ تحقیقی وعلمی کتابوں میں ''ارض القرآن'' ایک بڑا علمی کارنامہ ہے، کتاب ارض القرآن، قرآنی جغرافیہ پر ایک غیر معمولی کتاب ہے، اور یہ اس ضرورت سے تصنیف کی گئی کہ علاقائے عرب خصوصاً اس کے وسطی علاقہ کی جغرافیائی تحقیق جدید محققین جغرافیہ وآثار قدیمہ کی کامل توجہ حاصل نہیں کرسکی تھی، اور مواد کی کمی تھی، اس کمی کا مداوا سیّد صاحبؒ نے اپنے ممکنہ مطالعہ وتحقیق کے ذریعہ کیا، اور اس کمی کو کمی باقی نہیں رہنے دیا، یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو اردو زبان کے حصہ میں آیا، یہ ایسا کام تھا جو دنیا کی دیگر زبانوں میں اور خاص طور پر بین الاقوامی زبانوں میں بھی نقل کیا جانا چاہئے تا کہ یورپ والے دیکھیں کہ علمی تحقیق وکاوش صرف مغربی قوموں میں ہی نہیں ہے بلکہ ان سے بھی بہتر اور دیانت دارانہ طریقہ سے مسلمانوں کے یہاں موجود ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس کتاب میں علمی تحقیق کا وہ اعلیٰ طریقہ اختیار کیا ہے جو تحقیق کے اعلیٰ ترین علمی معیار پر پورا اترتا ہے جس پر عمل کرنے کا دعویٰ یورپ کے معیاری محققین کرتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ نے اپنی تحقیق سے یہ بھی ثابت کیا کہ ان محققین میں سے متعدد دیانت وامانت کے معیار کو پورا نہیں کرسکتے ہیں، جہاں تک ارض الانبیاء اور تاریخ انبیاء کا تعلق ہے تو اس کے سلسلہ میں علمی مواد کا خاصہ حصّہ توریت اور عبرانی زبان کی کتابوں میں ملتا ہے، چنانچہ اس سے استفادہ کے لیے مولانا نے عبرانی زبان سیکھی تا کہ ان دونوں میں موجود معلومات کا براہ راست مطالعہ کرسکیں، انگریزی زبان سے ان کو واقفیت پہلے سے تھی جس کے ذریعہ عصر جدید کے محققین یورپ کی تحقیقات اور مقامات کے مشاہدات کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات سے ان کو واقفیت حاصل ہو رہی تھی۔

مولانا نے صرف اسی پر اکتفانہیں کیا بلکہ قرآن وحدیث میں آئے ہوئے اشاروں وتذکروں سے حاصل کردہ معلومات سے ان کا موازنہ بھی کرتے رہے، چنانچہ یورپ کے محققین کے متعدد اندازوں یا تبصروں کی غلطیاں بھی نکالیں اور سب کو انہوں نے جمع کیا، اس طرح انہوں نے اعلیٰ علمی کام انجام دیا جو علم کے زیادہ سے زیادہ غیر جانبدارانہ تقاضوں کے مطابق کیا جاسکتا ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کام کی معنویت وضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے مقدمۂ کتاب میں تحریر فرمایا ہے" اس تصنیف کا مقصد یہ ہے کہ قدیم وجدید معلومات کی تطبیق کے ساتھ ارض القرآن وعرب کے حالات مذکورہ کی اس طرح تحقیق کی جائے کہ قرآن مجید کی صداقت اور متقدمین کی لغزشیں علی الاعلان آشکارا ہوجائیں"۔ اوراس موضوع کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس موضوع کی اہمیت اورضرورت سے شاید کسی مسلمان کو انکار نہ ہوگا، قرآن مجید میں عرب کی بیسیوں قوموں، شہروں اور مقامات کے نام ہیں، جن کی ہر قسم کی صحیح تاریخ سے نہ صرف عوام بلکہ علماء تک ناواقف ہیں، اور نہایت عجیب بات ہے کہ تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی، اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک طرف خود مسلمانوں کو ان حالات سے ناواقفیت رہی، اور غیروں کو انہیں افسانہ (LEGEND) کہنے کی جرأت ہوئی"۔

قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام اوران کی قوموں کے تذکرے آئے ہیں جو نصیحت وعبرت کا سامان رکھتے ہیں، اور بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ان کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان میں صحیح واقعہ بیانی کے ساتھ بڑی تاثیر بھی ہے، اور وہ واقعتاً عام انسانی قصوں اور کہانیوں کی طرح نہیں ہیں، وہ عبرت واصلاح حال کا کام کرتے ہیں، قرآن مجید میں صرف سبق آموز واقعات کو ان کے صرف سبق آموز پہلوؤں کے اندر محدود رکھتے ہوئے بیان کیا گیا ہے، ان کی تفصیلات اوران کے متعلقات کی وضاحت قرآن مجید میں نہیں کی گئی ہے، بلکہ قرآن مجید کے پڑھنے اور سننے والوں کی واقفیت اور مزید واقفیت کے لیے ان کو ان کی

صلاحیت وجستجو وتحقیق پر چھوڑ دیا گیا ہے، قرآن مجید میں ذکر کیے گئے قصّے اور واقعات زیادہ تر انہی علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو قرآن مجید کے اوّل مخاطبین یعنی عربوں کے زیر قدم رہے، وہ ان کی ضروری معلومات سے واقفیت رکھتے تھے، لہٰذا اصل بات کو سمجھنے میں ان کو آسانی ہوئی اور مقصد پورا ہوا، لیکن بعد میں آنے والوں کے لیے موقع ومحل وپس منظر اتنا واضح نہیں رہا جتنا اگلوں کے لیے تھا، کیونکہ مرور زمانہ سے بعض جگہوں کے نام بدل جاتے ہیں، بعض راستوں اور مقامات میں بھی فرق آجاتا ہے، دوسری قومیں اور علاقہ والے چونکہ قرآن مجید سے بلاواسطہ کچھ بھی واقفیت نہیں رکھتے تھے، ان کو قرآن مجید کے ان اشاروں اور حوالوں کو پوری طرح سمجھنے کے لیے جو علاقہ کے حالات سے تعلق رکھتے ہیں دشواری تھی، اور ان کو ان کی مزید وضاحت وتشریح کی احتیاج تھی اور وہاں کے علاقوں سے تعلق رکھنے والی مختلف باتیں ان علاقوں کی جغرافیائی وتاریخی حقیقت جاننے کے لیے بھی ایک حد تک محتاج تھیں، اس سبب سے قدیم مسلم علماء نے اس موضوع کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا تھا، اور تحقیق وجستجو بھی کی پھر اس سلسلہ میں اپنی معلومات قلمبند کیں، جن سے نئے پہلو سامنے لائے اور مرور زمانہ کے ساتھ یہ سلسلہ قائم رہا، اور اس کو اس موضوع پر تصنیف کی جانے والی متعدد کتابوں میں یا تاریخ اور قوموں کے حالات پر مشتمل مختلف کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ان کتابوں میں تفسیری کتابیں، سیرت کی کتابیں، پھر جغرافی اور تاریخی موضوع کو سامنے رکھ کر لکھی جانے والی کتابیں ہیں لیکن اس سلسلہ کی معلومات کے لیے عموماً توریت اور یہودی کتابوں سے استفادہ کیا گیا، کیوں کہ گزشتہ انبیاء اور ان کی قوموں کے حالات کا تذکرہ یہودی مصنفوں نے خاصہ کیا ہے، لیکن یہودی روایات میں جگہ جگہ مبالغہ بھی ملتا ہے، اور تغیر وتبدل کا عمل بھی خاصا ہوا ہے، اس لیے متعدد معلومات شک پیدا کرتی ہیں، اسی لیے عباسی عہد میں جو مسلمانوں کے علمی عروج کا زمانہ ہے مزید تحقیق وجستجو کے ذریعہ اور قدیم زمانوں کے مکتوبات کے ذریعہ قرآن مجید میں مذکور قوموں کے واقعات وحالات سے نسبت رکھنے والی نئی معلومات حاصل کرنے کی کوششیں کی گئیں، اور کتابوں میں درج کی

گئیں، پھر گذشتہ آخری صدیوں میں یورپ نے جو علمی و عملی زندگی کے لحاظ سے عروج پر تھا، اپنے علمی شغف رکھنے والے متعدد اہل علم و تحقیق کے ذریعہ مزید باتیں معلوم کیں، اس طرح اس موضوع پر موجود قدیم سرمایہ میں اضافہ ہوا، ان معلومات میں جہاں تک یورپ کی تحقیقات کا تعلق ہے تو ان کے علماء کی اسلام اور عربی خصوصیات سے عدم واقفیت کی وجہ سے متعدد مقامات میں مطلب اخذ کرنے میں ان سے غلطیوں کا ارتکاب ہوا۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ علم قدیم وجدید کے جامع مولانا سید سلیمان ندوی کو ایک ایسی کتاب تیار کرنے کا جذبہ پیدا ہوا جو ایک طرف قرآن مجید کے جغرافی اشاروں اور حوالوں کے سمجھنے میں مدد دے اور دوسری طرف اسلام مخالف محققین نے جو غلط نشاندہیاں کی ہیں اس کے ذریعہ ان کا ابطال بھی ہو، مولانا نے اپنی اس کتاب میں تاریخی وجغرافی معلومات کے سلسلہ میں گتھیاں سلجھائیں جن میں سامیوں کا اصل مسکن، عاد وارم کا تعلق، عاد وثمود کا اولیٰ وثانیہ ہونا، اوران کے قبائل کے علاقوں کی وسعت اوران کا صحیح تعین، عیسائیت و یہودیت کا جزیرۃ العرب میں داخلہ اوران کے اثرات، سبا کے عروج وترقی اوران کی نسلی اقسام، اوراس طرح کی دیگر معلومات قرآن کے بہت سے اشاروں کے سمجھنے میں معاون ہیں۔

مولانا نے یورپین محققین کے متعدد دعوؤں اور اندازوں کا ابطال کیا اور یہ ابطال محض دینی بنیاد پر نہیں بلکہ ان کی ناواقفیت اور عقلی قرائن اور علمی بنیادوں پر کیا، اور جگہ جگہ یہ نشاندہی بھی کی ہے کہ یورپین کی تحقیق ان کی ناواقفیت یا تعصّب پر مبنی ہے دراصل یورپ کے غلبہ وعروج کے زمانہ میں ان کے متعدد محققین نے اسلامی خوبیوں کو دبانے کی مصلحت کو بھی سامنے رکھا، اوراس کے زیراثر جو لوگ اپنی تحقیقات کے نتائج نکالے یہ لوگ مستشرق کہلاتے تھے، اوراپنے علمی انداز تحقیق کے رعب سے علم میں کمی رکھنے والوں کو متاثر کرتے تھے، چنانچہ بہت سے مسلمان ذہنوں کو انہوں نے متاثر کیا، سیّد صاحبؒ اپنے مقدمہ میں ان کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

”وہ مسلمان نہیں یہودی اور عیسائی ہیں انہوں نے نہایت بے دردی سے قرآن

کے فوائد کو پامال کیا ہے، بعض متعصب مستشرقین نے ان معلومات کو غلط طور سے قرآن کی مخالفت میں استعمال کیا ہے"۔

سیّد صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ......

"آثار قدیمہ کے اکتشافات نے ادیان عرب قبل اسلام کے معلومات میں نہایت انقلابات پیدا کر دئے ہیں، جن سے اسلام کے مناقب وفضائل کا ایک نیا باب پیدا ہو گیا ہے"۔

بہر حال نہایت ضروری تھا کہ ہمارے دشمن جن جدید معلومات کو ہماری مخالفت میں صرف کر رہے ہیں ان سے اپنی موافقت کے پہلو پیدا کیے جائیں۔

سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان غلط کار محققین کی تشریحات کو جگہ جگہ بے نقاب کیا اور صحیح تشریحات پیش کیں، اس طرح سید صاحبؒ کی یہ کتاب صرف قرآنی جغرافیہ ہی نہیں بلکہ جغرافی علم کلام کی حیثیت اختیار کر گئی ہے، جس کے ذریعہ اسلامی چہرہ پر ڈالے گئے غبار کو صاف کیا گیا ہے، اور غلط کاروں کی معاندانہ حکمت عملی کی حقیقت ظاہر کی گئی ہے۔

سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں تذکرہ اظہار خیال کرتے ہوئے ذکر فرمایا ہے کہ: یہ عجیب امر ہے کہ غیر مسلم اہل علم نے اپنی توجہ ہماری مقدس کتاب کے مطالعہ وتحقیق پر صرف کی، جرمن، فرانسیسی اطالوی اور انگریز مستشرقین نے عربوں کی ماقبل اسلام تاریخ پر تحقیقی کتابیں لکھیں جن میں ان کی علمی وتحقیقی محنت کا اظہار ہوا ہے، اور رومی اور یونانی کتابوں کی تلخیص پیش کی جس کے ذریعہ عربوں کے قدیم زمانے کی جو باتیں ان میں تھیں ان کو موجودہ عہد کے سامنے لائے اور ان قوموں کے بارے میں معلومات وتحقیقات پیش کیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور کتبے اور نقوش جو پرانی جگہوں میں ملے ان کو حل کیا اور ان سے معلومات لیں، لیکن یہ مستشرقین مسلمان نہ تھے، بلکہ یہودی یا عیسائی تھے، انھوں نے اپنے مطالعہ وتحقیق کے ذریعہ متعدد حقائق کو بگاڑا اور متعدد مستشرقین نے اپنی حاصل کردہ معلومات سے ان کے دلوں میں جو معاندانہ جذبہ تھا، اس کے تحت کام کیا۔

اٹھارہویں صدی کے وسط میں ''اڈورید فارسٹر'' نے عربوں کے تاریخی جغرافیہ پر کتاب لکھی اس کے حقائق میں ایسی تحریفات کیں کہ مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں، نولد یکی نے عمالقہ اور عاد کے سلسلہ میں یہ اظہار خیال کہ یہ خیالی نام اور قومیں ہیں، تاریخ سے ان کا ثبوت نہیں ملتا، اور رابرٹ اسمتھ نے عربوں کے صحیح النسب ہونے سے بھی انکار کر دیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ معاملات مستشرقین نے اٹھائے ہیں یہ بظاہر تو تاریخی وادبی مباحث ہیں، لیکن ان کا اثر براہ راست قرآن مجید کی طرف سے ظاہر کیے ہوئے حقائق پر پڑتا ہے، اس طرح اس کو ایک ایسی سازش قرار دیا جاسکتا ہے جس کے ذریعہ قرآن مجید پر اعتماد کمزور کیا جانا مقصود ہو اور عربوں کو جو خدا کی طرف سے اسلام کے حاملین اوّل بنائے گئے ناقابل اعتبار قرار دینا ہے۔ لیکن ان مستشرقین کی ان آراء کا علمی جائزہ لینے پر پتہ چلتا ہے کہ یہ ان مستشرقین کی عربی زبان میں کمزوری اور عربی زبان کے ادبی ذوق کے فقدان کی وجہ سے ہوا ہے، مزید یہ کہ ان میں جو اسلام کے خلاف تعصب تھا اور اپنے عیسائی مذہب کے جو تصورات تھے وہ ان کا باعث بنے۔

عربوں کے حسب ونسب پر مستشرقین نے جو شک وشبہ ظاہر کیا ہے اور ان کے قبائلی انتساب کو بتوں اور ان کے تراشیدہ خداؤں سے متعلق کرنے کی ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سخت تردید کی اور ثابت کیا ہے کہ ان کو اپنے باپ دادا کی طرف جو نسبتیں حاصل تھیں انہیں سے وہ موسوم ہوئے، اور ان ہی کی طرف وہ منسوب ہوئے، اور یہ کہ نولد یکی نے عرب انساب کو جو خرافات قرار دیا یہ ان کی غلط رائے ہے۔

سامی قوموں کے وطن اصلی کے سلسلہ میں بھی مستشرقین نے طرح طرح کی باتیں لکھی ہیں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل سے ثابت کیا کہ جزیرۂ عرب کا وسطی شمالی علاقہ ان کا وطن اصلی رہا ہے، اور اس کی تائید میں متعدد محققین عرب کے اقوال پیش کیے ہیں۔ اور قرآن مجید سے بھی دلیل پیش کی ہے کہ "لتنذر أمّ القرىٰ ومن حولها" کے یہ الفاظ بھی وسط عرب کو مرکز قرار دیتے ہیں، بعض مستشرقین نے اکثر عرب شعراء کو عیسائی قرار دے دیا ہے، مولانا

رحمۃ اللہ علیہ نے اسکی سخت تردید کی جن شعراء کے یہاں عیسائیت کی باتیں یا الفاظ ملتے ہیں وہ عیسائی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ عیسائی بادشاہ کے دربار میں اپنی شاعری کو باوَزن بنانے کے لیے تھے، ورنہ عربوں میں عیسائی بہت ہی کم تھے اور یہودی ان سے بھی کم تھے۔

جزیرۃ العرب میں قبل اسلام کے مذاہب کے عنوان سے بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اہم تفصیلات بیان کی ہیں، خاص طور پر عیسائیت، یہودیت کے جزیرۃ العرب میں درآنے کی تفصیل پھر ان دونوں کی آویزش پھر اس آویزش کے نتیجہ میں پیش آنے والے واقعات مثلاً اصحاب الاخدود، اسی طرح اَصحاب الفیل کے واقعات، اسی طرح صائبیت اور حنفیت کے الفاظ اوران کے اصل محل استعمال پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور یہ خاص بات بتائی ہے کہ عراق کے ستارہ پرست دراصل اپنے لیے صابیٔ کا لفظ اچھے مفہوم میں استعمال کرتے تھے، جس کے معنی دھونے اور غسل کرنے کے تھے، اور ستارہ طلوع ہونے کو بھی صبا کہا گیا ہے۔ اصل عراق کا سابق مذہب ستارہ پرستی اس لفظ کا بنیادی مفہوم بنا، اور پھر یہ مذہب بتدریج نئی پرانی خصوصیات کا مذہب بن گیا جس کے ماننے والے عربوں کی سوسائٹی میں بعد بھی ملتے ہیں، ان میں سے بعض نے علمی شہرت بھی حاصل کی۔

صابئیت کے ساتھ حنفیت کی تحقیق بھی سید صاحبؒ نے دلچسپ پیش کی، یہ لفظ بھی قدیم اہل عراق کے صابئیت کے لفظ کا معاصر تھا اس کے معنی اعراض کے یعنی ستارہ پرستی سے اعراض کے تھے، اور یہ اہل عراق نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مذمت کے طور پر ان کے لیے استعمال کیا تھا، جو غیر اللہ سے اعراض وصرف نظر کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا، اور حضرت ابراہیمؑ کے لیے اچھا وصف بنا اور خالص اسلام کے مفہوم میں استعمال کیا جانے لگا، جس طرح اسلام کا لفظ چھوڑ دینے اور دوسرے کے حوالہ کردینے کے معنی میں ہونے کی وجہ سے غیر اللہ کو چھوڑ کر اپنے کو اللہ کے حوالے کردینے کے ہوگئے، اور وہ خالص دین اسلام کے معنی میں ہوگیا۔

سید صاحبؒ نے قرآن مجید میں ذکر کی گئی قوموں کے سلسلہ میں تحقیق وعلمی جستجو

سے کام لیتے ہوئے ان کا نسلی سلسلہ اور ان کے قیام و عمل دخل کے علاقے، پھر زمانے کے فرق سے ان کے تمدنی و سیاسی عروج و زوال کا اچھا جائزہ پیش کیا ہے، اور متعدد ایسی تحقیقات پیش کی ہیں، جن سے ان کی سابقہ معلومات کی تعیین میں بڑی مدد ملتی ہے، اور بعض ردوبدل کی صورت سامنے آتی ہے۔

خارق عادت معاملات میں سیّد صاحبؒ نے عقلی قرینہ کو بھی خاصہ استعمال کیا ہے، اور کئی جگہ عام مفسرین کی رائے سے اختلاف بھی کیا ہے، مثلاً قوم ثمود کے لیے لائی گئی اونٹنی کے پتھر سے پیدا ہونے کی بات کو قطعی قرار نہیں دیا ہے، بلکہ اسکو اونٹنی ہی سے پیدا شدہ اونٹنی قرار دینے کو اختیار کیا اور اس میں قرآن مجید کے الفاظ سے استشہاد کیا ہے۔

اسی طرح اصحاب فیل کے واقعہ میں پرندوں کے کنکریاں مار کر ہلاک کرنے میں بھی کئی اقوال نقل کیے ہیں، اسکی تشریح خارق عادت کے طور پر نہیں کی ہے، اسی طرح ملکۂ سبا کے تخت کے لانے میں جو عجلت ظاہر ہوئی تھی اس میں بھی خارق عادت کے علاوہ بات بھی ذکر کی ہے۔

سید صاحبؒ نے عالمانہ اور تحقیقی معاملات کے طریقہ تحقیق و بحث کو ہی اپنایا ہے لیکن مذہبی و اسلامی معاملات میں جگہ جگہ مغربی محققین کی تحقیقات کی علمی و عقلی غلطیاں نکالی ہیں اور متعدد معاملات میں ان کی جہالت کو آشکار کیا، اس طرح علمی دنیا میں ان مستشرقین کی علمی شہرت و عظمت کے خلاف ثبوت فراہم کیا جس سے ان کے پڑھنے والوں کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اہل تحقیق جن کی باتیں پہاڑ کی طرح مضبوط معلوم ہوتی رہی ہیں، ہر جگہ اپنی تحقیق و علمی موشگافی میں دیانت و امانت کو قائم نہیں رکھ سکے۔

ارض القرآن کی تصنیف مولانا رحمۃ اللہ نے اس عہد میں کی جس میں خاص طور پر حجاز کی مقامی معلومات اور وہاں بسنے والے قبائل کے سلسلہ کی بعض ایسی معلومات جن سے قرآن مجید اور حدیث شریف میں آنے والے متعدد علاقائی یا قبائلی اشاروں کی بالجزم تحقیق کا ہونا نظام نہیں تھا، اس علاقہ کے حکمرانوں کے مالی وسائل کی کمی، علم سے اشتغال کی کمی اور

علاقہ کے صحرائی ہونے اور وسیع رقبوں میں پھیلے ہونے کی وجہ سے معلومات کا حصول خاصا دشوار بنا ہوتھا، حجازی مقامات کے تقدس کی وجہ سے یورپ کے اہل تحقیق بھی پوری دلچسپی کا ثبوت نہ دیتے تھے، اور حجازی مقامات کے تقدس کی وجہ سے بعد کے دور میں وہاں کی تفصیلی اور گہری معلومات حاصل نہ کی جاسکیں، حالانکہ قرآن مجید میں آئے ہوئے ایسے مضامین جن کا تعلق علاقہ کے باشندوں کے صلح وجنگ اور مقامی یا قبائلی حال سے تھا، ان میں موجود اشاروں کو سمجھنے کے لیے علاقہ کے مقامات اور باشندوں کی خصوصیات وحالات سے زیادہ واقفیت کی ضرورت سامنے آتی ہے، مقامات کے جائے وقوع سے متعلق امور سفر ہجرت میں پڑنے والے مقامات کی جگہوں کا تعین، غزوۂ بدر میں جانے کے لیے سفر میں پڑنے والے مقامات کا تعین، جن کے لیے قدیم کتابوں میں فرسخ اور منزل کی صورت میں ذکر کیا جاتا ہے، جائے وقوع کے صحیح تعین میں دشواری ہوتی ہے، ضرورت تھی کہ اس کو تحقیقی سفر کرکے سمجھا اور متعین کیا جاتا لیکن حجاز کے حالات اس کے مساعد نہ بنے تھے کہ یہ کام ہوتا، وہاں کی مادی اور علمی صورت حال کے بہتر ہونے کے بعد اس کام کو بعض محققین نے کیا اور اس سلسلہ میں کتابیں تصنیف کی ہیں، اسی طرح حرم مکی کے حدود جو مقامات کے ناموں سے بتائے جاتے ہیں ان کا جائزہ سفر کرکے لینے کا تھا جس کو ابھی صرف چند سال پہلے ایک حد تک جو حدود کے تعین میں مدد کرتے ہیں، متعدد مقامات کے ناموں میں تبدیلی ہو جانے کی وجہ سے ان میں سے کئی کا تعین مشکل بن گیا تھا ان میں سے متعدد کو باقاعدہ تحقیقی جائزے سے اب سمجھا گیا، یہ لٹریچر اگر ارض القرآن کی تصنیف کے وقت آگیا ہوتا یا تحقیق کا یہ کام انجام پا گیا ہوتا تو ارض القرآن میں اس کو بھی جگہ ملتی، ضرورت ہے کہ کتاب میں بعض نئی تحقیقات شامل کی جائیں تاکہ کتاب کی معلومات مزید تازہ اور زیادہ ہوں اور اس کو انفرادیت کا مقام حاصل رہے۔

جہاں تک ان کی کتاب سیرۃ النبیؐ کا تعلق ہے، اس کی ابتدائی دو جلدیں ان کے استاد و مربی علامہ شبلی نعمانی کی تصنیف کردہ ہیں اور بعد کی پانچ جلدیں خود ان کے قلم سے

ہیں، شروع کی دو جلدوں میں بھی جو ان کے استاد محترم علامہ شبلی نعمانی کی ہیں ان کی علمی تحقیقات ہیں، جو تعلیقات کی صورت میں پیش کی گئی ہیں، جس میں انہوں نے کسی جگہ اپنے استاد سے اختلاف بھی کیا ہے، لیکن پورے آداب کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی تحقیق پیش کی ہے، تیسری جلد خود ان کی مرتب کردہ ہے اور اس میں معجزات انبیاء کی بحث مولانا شبلی نعمانی کے ایک دوسرے مایہ ناز شاگرد مولوی عبدالباری ندویؒ سے لکھوائی ہے جو مستقل رسالہ کی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے، سیرت کے مضامین ومقالات میں مدراس میں دیئے گئے ان کے خطبات بھی بڑے موقع سے ہیں، پونہ کالج کے زمانۂ قیام میں اپنی مشہور کتاب ''عمر خیام'' تحریر فرمائی جس کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا کہ عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا، الحمد للہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا۔ علامہ اقبال حضرت سید صاحب کے بے حد معترف اور گرویدہ تھے اور کئی مسائل میں آپ سے استفادہ کیا کرتے تھے۔

ایک خط میں علامہ اقبال لکھتے ہیں ''مولانا شبلی کے بعد آپ استاذ الکل ہیں، علومِ اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد آج کل ہندوستان میں سوائے سلیمان ندوی اور کون ہے''۔ اس کے علاوہ ان کی کتاب ''عرب وہند کے تعلقات'' اور معارف کے ان کے قلم سے نکلے شذرات اور تحقیقات پر مضامین جو ''یاد رفتگان'' کے نام سے شائع ہوئے اپنی الگ اہمیت رکھتے ہیں، قضا کے کام کے لئے ان کی خدمات والیہ ریاست بھوپال نے لیں، اور وہ وہاں کے قاضی مقرر ہوئے، ان کے فیصلے دین وشریعت پر ان کی گہری نظر کے غماز ہیں، سماجی اور سیاسی طور پر بھی ان کا قد بلند تھا، جو ان کی کتابوں ''برید فرہنگ'' اور ''سیر افغانستان'' سے بھی ظاہر ہوتا ہے، جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے بھی ان کی خدمات سامنے آئیں، اور اس کے اجلاسوں میں ان کی قائدانہ شرکت ہوتی تھی، جب حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے دعوت وتبلیغ کا کام خواص وعوام کو شریک کر کے شروع کی، تو اس کی تائید اور تقویت پہونچانے میں بھی وہ آگے رہے۔

سید صاحب کو تلاشِ شیخ کی جستجو میں حضرت تھانوی سے کس طرح تعلق پیدا ہوا۔ وہ بھی ایک دل چسپ واقعہ ہے، جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلفاء کے حالات وتذکرہ پر مشتمل کتاب ''بزم اشرف کے چراغ'' سے نقل کیا جاتا ہے، مفتی عبداللطیف (مفتی ریاست حیدر آباد دکن) نے ایک رسالہ الاستفتاء شائع کیا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ رباء (سود) صرف بیع وشراہی میں محقق ہوتا ہے قرض کی صورت میں اس کا تحقق نہیں ہوتا، چونکہ اس رسالہ سے نہ صرف عام مسلمانوں بلکہ خواص کی بھی گمراہی کا خدشہ تھا، اسی لئے حضرت حکیم الامت نے اس کے رداور نفس مسئلہ کی تحقیق میں ایک جوابی رسالہ مولانا ظفر احمد عثمانی سے لکھوایا اور انہیں اس پر علماء عصر کی تصدیقات حاصل کرنے کا مشورہ دیا تاکہ اس کی اہمیت بڑھ جائے، مولانا ظفر احمد عثمانی نے کتاب کا ایک نسخہ سید صاحب کی خدمت میں بھی بھیجا، آپ نے یہ خیال کیا کہ شاید رسالہ حضرت تھانوی کی طرف سے آیا ہے اس لئے مندرجہ ذیل خط حضرت تھانوی کی خدمت میں بھیجا۔

حضرت العلامہ المفضال متع اللہ المسلمین بطول بقائکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

رسالہ النور متضمن رسالہ کشف الدجیٰ مع ہدایت نامہ سرفرازی کا باعث ہوا، میں اس کو اپنے لئے سعادت کا طغریٰ سمجھتا ہوں کہ آپ اس ظلوم وجہول سے تقریظ لکھنے کو فرمائیں، خدا گواہ ہے کہ میں اپنے آپ کو اس سے کمتر سمجھتا ہوں کہ آپ کی کسی تحریر پر تقریظ لکھوں، مجھے یہ بھی شک ہے کہ میرا طریقۂ تحریر اور طرزِ استدلال خاطرِ اشرف ہو مگر بحکم ''الامر فوق الادب'' تعمیل کر دوں گا، حضرت مشفقی میرے استاد وشیخ ہیں، یہ رسالہ انہوں نے مجھے حیدر آباد دکن میں دیکھنے کو دیا تھا، میں نے پڑھ کر ان کو ان الفاظ کے ساتھ واپس کر دیا تھا کہ آپ جس کو مکروہ سمجھتے ہیں میں اس کو عین ربا سمجھتا ہوں، رسالہ کشف الدجیٰ کے مطالعہ سے بہرہ مند ہوا، طرزِ عبارت اور انشاء

کی سلاست اور جاذبیت نور علیٰ نور ہے، بارہا جب میرا دل زمانہ کے فتن وحوادث سے گھبرا اٹھتا ہے اور بے اختیار کسی سکینت وطمانینت کی تلاش ہوتی ہے تو خانقاہ امدادیہ کی یاد آتی ہے، لیکن ڈر تھا کہ معلوم نہیں کہ اجنبیت وبیگانگی سے میرے متعلق کیا کیا اب تک پہنچا ہو اور مجھے تخاطب کا اہل سمجھے یا نہیں، میں تو اس رسالہ استفتاء کا ممنون ہوں کہ اس اجنبیت وبیگانگی کی جگہ دانست ویک جہتی کی صورت پیدا ہوئی، اب میں اس کشمکش کی منزل میں ہوں جس میں علوم ظاہری دل کی تسکین کا باعث نہیں بنتے، دعا کا طالب اور ہمت کا خواستگار ہوں۔
والسلام سلیمان ندوی''۔

ان کا اس عریضہ کا جواب حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے اس طرح دیا کہ:

''مولانا المحترم دامت فیوضہم السلام علیکم، عجیب بات ہے کہ انبساط کا مقصد نہ میرا تھا نہ جناب کا، دونوں طرف اتفاقاً ہی اس کے اسباب پیش آ گئے، اس طرف کا واقعہ تو جناب نے ہی تحریر فرما دیا، اس طرف یہ واقعہ ہوا کہ میں بالیقین کسی بزرگ کے پاس رسالہ بھیجنے کو نہ کہا تھا، دو وجہ سے ایک تو یہ کہ مجھے بزرگوں کی فہرست ہی غیر مکمل معلوم ہے، دوسری کسی کو ایسے تکلیف دیتے ہوئے ہمت نہیں ہوتی، خصوصاً اگر میرا کلام ہو تو بے حد حجاب ہوتا ہے۔ یہ رسالہ میرے ہمشیرہ زادے نے میرے ہی کہنے سے لکھا، چونکہ عام طبائع کی حالت پر نظر کر کے اس استفتاء کی مضرتِ عامہ کا قوی اندیشہ تھا، اس لئے اس کے انسداد کی سب سے انفع تدبیر علماء کی موافقت حاصل کرنا ذہن میں آیا کہ عوام پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے اس لئے میں نے عزیز موصوف کو

مصارف دے کر مشورہ دیا کہ جہاں جہاں مناسب ہو بھیج دیا جائے، میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے جناب کو بھی تکلیف دے کر یہ موقع دیا کہ میں جناب کا مخاطب بن سکا۔

بہر حال اب حجاب مرتفع ہونے کے بعد مضامین محبت کا جواب دیتا ہوں، جناب کی تواضع نے ضرور مجھ کو ایک معتد بہ درجہ معتقد بنا دیا، اور غالب یہ ہے اس میں اضافہ اور قوت ہو، باقی طرز استدلال اور عبارت کی پسندیدگی و عدم پسندیدگی، سو اس کے متعلق اعتقاد دلی سے ایک نظیر عرض کرتا ہوں کہ سادے کپڑے پہننے والے کو کسی طرح یہ حق نہیں کہ رنگین کپڑے پہننے والے کو نا پسند کرے، عبارت کے متعلق جو ارشاد ہے اس سے میں کاتبِ عبارت کا زیادہ معتقد ہو گیا کہ ماہر کی شہادت ہے۔

آخر میں جو خانقاہ کے متعلق اپنا انجذاب اور اس کے ساتھ کچھ موانع متحملہ کا ذکر فرمایا ہے، اگر خانقاہ پر حضرت شیخ قدس سرہ رونق افزا ہوتے تو یہ سب مضامین حقیقت پر منطبق ہو سکتے تھے لیکن اب محض حسن ظن پر منطبق ہو سکتے ہیں، اس سے آگے ہیچ۔ البتہ زیادہ تکلف کرنے کو بھی اعادہ حجاب اور انبساط لاحق سمجھ کر پسند نہیں کرتا، اس لئے بلا تکلف معاملہ کی سچی بات کہتا ہوں کہ جناب کا حسن ظن اگر کسی روایت پر مبنی ہے، تو لا یوثق بہ اور اگر ذوق وجدانی ہے تو میں دوستی کرنے کو تیار ہوں، التماس جناب کا الطاف نامہ رکھ لیا ہے اگر اجازت ہو گی تو اس کے بعض جملے جن کا تعلق مسئلہ سے ہے تقریظ کے ساتھ منضم کر دیے جائیں گے، یہ کاتب کی درخواست ہے جس کے قبول کرنے میں آپ بالکل آزاد ہیں، اگر مصلحت یا طبیعت کے ذرا بھی خلاف

ہو، ممانعت پر بھی وہی مسرت ہوگی جو اجازت پر ہوگی۔

فقط

ناکارہ آوارہ، ننگ انام اشرف برائے نام از تھانہ بھون

۲۸/دسمبر ۱۹۲۹ء۔

مکتوب سلیمانی

حضرت ہادی طریقت متع اللہ المسلمین بطول بقائکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

والا نامہ جو الطاف سے بھرا ہوا تھا ورود فرما ہوا، اس سے ایک پریشان حال ومتشت البال کی سکینت ہوئی، مولانا میں آپ کی دعاء ودعوت کا بہترین مستحق ہوں، مسائل علمی کی الجھن سے نجات کا خواستگار نہیں، بلکہ روح کی الجھن سے نجات کے لئے دعاء وہمت کا طالب ہوں۔

میرے لئے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیں کہ مجھ میں استقامت وتثبت ورغبت الی الطاعت پیدا ہو، فرائض کا پابند ہوں، بدعات سے نفور ہوں، کبھی کبھی ذوقِ سجود کی لذت بھی پاتا ہوں، امام ربانی مجدّد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اوران کے سلسلہ سے عقیدت تامہ رکھتا ہوں، خرافات وطاعات صوفیہ کا دل سے منکر ہوں، صالح نہیں مگر اصلاحِ حال کا دل سے خواست گار ہوں، یورپ کے مذہبی وعلمی حملوں کے مقابلہ میں اسلام کی خدمت کا ولولہ ہے، اوراب تک پچیس سال کا زمانہ ان ہی مشاغل میں گذرا، اب آپ سے دعا کا طالب، ہمت کا خواست گاراور حصولِ اخلاص

اور اصلاحِ قلب کے لئے کسی نسخہ کا سائل ہوں۔

رسالہ کشف الدجیٰ پر قلم نے جو یاوری کی ہے مولوی ظفر احمد صاحب کی خدمت میں ارسال ہے۔

سلیمان ندوی ۱۱ر شعبان ۱۳۴۰ھ۔

جواب اشرف

از خاکسار اشرف علی عفی عنہ۔ بخدمت مکرمی محترمی دام فیضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ الطاف نامہ نے مع تقریظ مسرور فرمایا اور تفریظ نے علوم مفیدہ میں اضافہ فرمایا، اللہ ہمیشہ آپ کو مسرور رکھے بمسرت ظاہرہ وباطنہ۔

سب سے اول اس عنوان کے تبدیلی کے متعلق درخواست کرتا ہوں کہ جس سے مجھ کو خطاب فرمایا ہے یعنی ''ہادی طریقت'' اس کو دیکھتے ہی یہ ذہن پر وارد ہوا۔

او خویشتن گم است کہ مرا راہبری کند
صلاح کار کجا ومن خراب کجا
بیا جامی رہا کن شرمساری
زحاف ودور پیش آر آنچہ داری

اگر جامی کا یہ شعر فوراً ذہن میں نہ آجاتا تو عجب نہیں کہ یہی عنوانِ خطابت غایت درجہ کے خجلت زدہ ہونے سے عرضِ جواب سے عذر مانع ہو جاتا، مگر اب صرف درخواست پر اکتفا کرتا ہوں کہ جو عنوان خود میں نے آپ کے لئے اختیار کیا ہے اس سے تجاوز نہ کیا جائے گو میں اس کے بھی ابل نہیں، اس کے بعد الطاف نامہ کا جواب

عرض کرتا ہوں مگر اس کے ساتھ یہ شرط یا درخواست ہے کہ میرے معروضات کو قول فیصل نہ خیال فرمایا جائے بلکہ "خذ ماصفا ودع ماکدر" پر عمل رہے اور اس انتخاب سے مجھ کو مطلع فرمانا بھی ضروری نہیں، اب بے تکلفی سے جواب عرض کرتا ہوں۔

مجھ کو اس بات سے خاص مسرت ہوئی کہ میرا معروضہ کسی درجہ میں موجبِ سکینت ہوا، اور بالیقین یہ اثر میرے عریضہ کا نہیں بلکہ جناب کے حسنِ ظن کا ہے اور عادۃ اللہ یونہی جاری ہے کہ حسنِ ظن کے محل سے عطایا تقسیم فرماتے ہیں، اس حسنِ ظن سے مجھ کو بھی انشاء اللہ تعالیٰ اپنے نفع کی امید ہے۔

جناب نے جو بے تکلف اپنا مسلک تحریر فرمادیا اس سے میری عقیدت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہوگیا، دو وجہ سے ایک صدق وخلوص پر دال ہونے سے اور دوسرے خود مسلک کے پاکیزہ ہونے سے، تمام اہل حق کا یہی مسلک ہے کسی جزئی تفاوت سے حقیقت نہیں بدلتی صرف رنگ بدلتا ہے، چنانچہ احقر پر دو جگہ دوسرا رنگ ہے، ایک یہ کہ میں بوجہ اپنی قلتِ روایت ودرایت کے متاخرین کا بھی متبع ہوں، دوسرے یہ کہ صوفیہ کے اقوال واحوال کو متحمل تاویل سمجھتا ہوں۔

شرف وبرکات خاندانی سے حقیقۃ الحقیقت تک وصول کی بہت جلدی اور قوی امید ہوکر خاص طمانیت ومسرت حاصل ہوئی، اس ضمن میں مَیں نے بھی اپنا کچا چٹھہ اس لئے عرض کردیا کہ آپ کو خذ ماصفا ودع ماکدر پر عمل فرمانے میں سہولت ہو، دوسرے یہ طبعاً چاہتا ہوں کہ اپنے احباب سے اپنا کوئی راز مکتوم نہ رہے، میری رائے میں اس سے تعلق بڑھتا ہے اور یہ خاص نعمت ہے اللہ تعالیٰ کی کہ

دو مسلمانوں میں خاص اور خالص تعلق رہے، اور اس مصلحت سے آج
ہی ایک رسالہ جو میرے رسالہ کی تسہیل ہے، روانہ خدمت کر رہا ہوں،
اس سے میرا مسلک جو طریقت کے متعلق ہے ضروری درجہ کا ہوگا۔

حضرت تھانوی سے پہلی ملاقات

۱۹۳۵ء کے آغاز میں حضرت سید صاحب ڈاکٹر اقبال کی دعوت پر لاہور تشریف لے گئے چونکہ ابھی تک حضرت تھانوی سے ملاقات نہیں تھی اس لئے لاہور سے واپسی پر تھانہ بھون جانے کا پروگرام بنایا اور حضرت تھانوی سے ملاقات کی، اس ملاقات سے خود حضرت حکیم الامت نے جو اثر لیا اس کو خود ان کے ہی پر کیف الفاظ میں سنیئے

''مولانا سلیمان ندوی صاحب دفعۃً تشریف لائے، میں مکان پر تھا سنتے ہی حاضر ہوا میرے ذہن میں ان کا جثہ طویل وعریض تھا، ملا تو معتدل الخلقت پا کر قلب کو بہت انس ہوا پھر ملاقات ومکالمت سے ان کی تواضع وسادگی ورعایت جلیس کو دیکھ کر تو مسخر ہی ہو گیا''۔

جولائی اگست ۱۹۳۰ء میں مولانا عبدالباری ندوی تھانہ بھون میں مقیم تھے، آپ نے حضرت سید صاحب سے تھانہ بھون آنے پر اصرار کیا کہ ''حضرت کا سلسلہ علالت طول پکڑتا جا رہا ہے اور ڈر ہے کہ کہیں یہ آفتابِ رشد وہدایت وتربیت لب بام نہ ہو'' حضرت سید صاحب نے اس پر اپنی آمادگی ظاہر کی اور تھانہ بھون روانہ ہو گئے لیکن اسی دوران میں حضرت حکیم الامت لکھنؤ تشریف لے جا چکے تھے اس لئے آپ بھی لکھنؤ پہنچے، حضرت حکیم الامت کی علالت کے سبب مخصوص حضرات کے علاوہ عام ملاقات کا سلسلہ بند کر رکھا تھا، جب حضرت سید صاحب کی آمد کی خبر آپ کو ملی تو فوراً بلایا گیا اور ان کی درخواست پر تربیت کی خدمت بلا تامل قبول فرمائی۔

ایک موقع پر تھانہ بھون حاضری میں حضرت حکیم الامت سے چلتے وقت عرض کیا

کہ مجھ کو کوئی نصیحت فرمایئے، حضرت کو پہلے کچھ تردد ہوا کہ ایسے فاضل شخص کو میں کیا نصیحت کروں، مگر پھر فرمایا: کہ حضرت آپ جیسے فاضل کو نصیحت تو میں کیا کر سکتا ہوں لیکن ہاں مَیں نے جو اپنی اس تمام عمر میں سارے طریق کا حاصل سمجھا ہے وہ عرض کئے دیتا ہوں، وہ حاصل فناوعبدیت ہے بس جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو مٹایا جائے، اور اسی کے لئے سارے مجاہدات کئے جاتے ہیں، اس تقریر کا ان پر اس درجہ اثر ہوا کہ وہ آبدیدہ ہو گئے۔

اس مناسبت تامہ کے بعد بہت جلد شیخ و مرید میں انسیت پیدا ہو گئی تھی، جب حضرت سید صاحب نے بیعت کی درخواست کی تو حضرت حکیم الامت نے ارشاد فرمایا کہ ''پچاس خط لکھ چکیں تو پھر انشاء اللہ'' پھر فرمایا ''خواہ روزانہ صبح و شام لکھ کر یہ وعدہ پورا کر دیں'' لیکن ابھی چند ہی خط آئے تھے کہ تھانہ بھون کی ایک حاضری میں از خود بیعت سے سرفراز فرمایا اور کہا کہ ''الحمدللہ میرے حصہ میں سارے عقلاء ہی آئے ہیں''۔

سید صاحب کو ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۲ء میں سلاسل اربعہ میں خلافت باطنی عطا فرمائی، خلافت عطا فرما کر حضرت حکیم الامت اس درجہ مسرور و مطمئن تھے کہ بارہا فرمایا کہ الحمدللہ مجھے اب کچھ فکر نہیں میرے بعد ایسے لوگ موجود ہیں''۔

''حضرت سید صاحب نے حکیم الامت کے بغیر کسی اشارہ و کنایہ کے از خود اپنے احساس سے مجبور ہو کر ایک مسئلہ میں رجوع و اعتراف'' کے نام سے جنوری ۱۹۴۳ء کے معارف میں ایک تحریر شائع فرمائی اور یہ شمارہ حضرت والا کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت تھانوی کے قلب مبارک پر اس تحریر کا بڑا اثر ہوا۔ اور انہوں نے اپنی عادت و مزاج کے خلاف پہلی اور آخری مرتبہ اپنے خلیفہِ ارشد کی مدح میں چند اشعار لکھ کر بھیجے۔

اعتراف (یعنی اخذ اعلان) ازاعتراف ُیعنی رجوع سلیمان)
لمثل ھذا فلیعمل العاملون وفی ذالک فلیتنا فس المتنافسون
اقتباس ترغیب دلپزیر از مثنوی رومی بتصرف یسیر
از سلیمان گیر اخلاصِ عمل دان تو ندوی را منزہ از دخل

اے دلت معمور از اسرارِ حق — اے دلت مخمور از آثارِ حق
اے دلت پر نور از انوارِ حق — اے دلت مسرور از اخبارِ حق
صد مبارک باد ایں اظہار حق — صد مبارک باد ایں اقرار حق
لیک باشد ایں طریق نفع خاص — کہ بہ اہل علم دار واختصاص
سعی نفع عام اینجا واجب است — آنکہ نافع بہر ہر ہر طالب است
در کلام خود نظر خود کردنی — یا کہ نقادے بدست آوردنی!
ہمچناں کردم بہ تالیفات خویش — صرف ہم کردم اے او نقد خویش
گرچہ ناظم نیستم ابیات را — نثر کردم لیک ایں جذبات را
مقصد من خیر خواہی ہست دبس — بو کہ بارغبت فتد ورگوش کس

اشرف علی ۲۷؍محرم ۱۳۶۱ھ

حضرت حکیم الامت نے ۱۹، اور ۲۰؍جولائی کی درمیانی رات کو سفر آخرت اختیار کیا، اس واقعہ کا سید صاحب کے قلب پر بے حد اثر ہوا، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی ہو جائے گا، جو سید صاحب نے رحلت شیخ کے عنوان سے موزوں فرمائے۔

داغِ فراقِ یار مٹایا نہ جائے گا
اب دل کا یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
حرفِ دمِ وداع خدا کے سپرد ہو
تا آخر حیات بھلایا نہ جائے گا
اے دل خموش صبر و رضا کا مقام ہے
نقش دوامِ فیض مٹایا نہ جائے گا
یوں ہی بچھا رہے گا یہاں خوانِ فیضِ عام
جب تک ہیں مہمان بڑھایا نہ جائے گا
چاہا خدا نے تو تری محفل کا ہر چراغ

یونہی جلا کرے گا بجھایا نہ جائے گا

اس کے علاوہ معارف میں موت العالِم موت العالم کے زیرعنوان اپنے انداز کا ایک مضمون بڑے سوز وگداز سے لکھا جس کے ابتدائی جملے یہ ہیں۔

محفل دوشین کا وہ چراغِ سحر جو کئی برس سے ضعف ومرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا بالآخر ۸۲ سال ۳ ماہ دس روز جل کر رجب ۱۳۶۲ھ کی شب کو ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سووہ بھی خموش ہے

یعنی حکیم الامت مجدد طریقتِ شیخ الکل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے مرض ضعف و..... میں کئی ماہ علیل رہ کر ۱۹/۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب کو دس بجے نماز عشاء کے بعد اس دارِفانی کو الوداع کہا، اور اپنے لاکھوں مریدوں معتقدوں کو غمگین ومجبور چھوڑا۔ اِنا للہ واِنا اِلیہ راجعون۔

اب یہ دور بالکل ختم ہوگیا جو حضرت شاہ امداداللہ صاحب مہاجر مکی، مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کی یادگار تھا اور جس کی ذات میں حضراتِ چشت اور حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت سید احمد رائے بریلوی کی نسبتیں یک جا تھیں، جس کا سینہ چشتی ذوق وشوق اور مجددی سکون ومحبت کا مجمع البحرین تھا، جس کی زبان شریعت وطریقت کی وحدت کی ترجمان تھی جس کے قلم نے فقہ وتصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا"۔

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ، اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے الگ الگ میدان عمل میں جو حضرت سید صاحب نے اکتساب فیض کیا تھا، اس کے علاوہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی کے لکھنو و کانپور کے دعوتی سفر میں بھی وہ ساتھ رہے، اور ان کی خصوصیات سے بھی استفادہ کیا، اور علم وتحقیق، دردوسوز، انسانیت کی راستی کی

فکر، مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی اور بے چینی خواہ وہ مسلمان دنیا کے کسی حصہ کے رہنے والے ہوں اور ذکر وفکر، عبادت وریاضت اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جن انعامات واعزازات سے نوازا، ان پر شکر اور جن دنیوی حالات سے ان کو گذرنا پڑا ان پر صبر نے آپ کو بڑے اونچے مقامات پر فائز کردیا تھا، اور وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو مقام قرب سے نوازنا چاہتا ہے تو اسے صبر کے مراحل سے بھی گذارتا ہے۔

مولانا شاہ سید شرف عالم ندوی بھاگلپوری

۱۳۴۴ھ ۱۹۲۶ء تا ۱۴۲۶ھ ۲۰۰۵ء

مولانا شاہ سید شرف عالم ندوی بھاگلپوری بہار کی ممتاز شخصیات میں شمار کئے جاتے تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء میں میری اور ان کی زمانۂ طالب علمی کا زمانہ ایک تھا، جو ان سے تعارف و تعلق کا ذریعہ بنا، وہ فراغت تعلیم کے بعد بھی دار العلوم وقتاً فوقتاً آتے رہے، اور بعد میں وہ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے ممبر بھی ہو گئے تھے، اور وہ اس کے جلسوں میں شرکت کا اہتمام کرتے، اخیر میں اپنی علالت اور ضعف کی وجہ سے سفر مشکل ہونے لگا تھا۔

مولانا شرف عالم ندوی مرحوم کا خاندان پیر ڈمٹریا سے معروف ہوا، حضرت مخدوم سید احمد پیر ڈمٹریا ان کے جد امجد تھے، جن کے والد مخدوم سید حسن دانشمند بھی ایک صاحب دل اور بزرگ شخصیت تھے، ان کے جد اعلیٰ سید ظہیر الدین حُسینی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے زمانہ میں دہلی تشریف لائے اور ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، اس خاندان کا نسبی تعلق حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔

مولانا سید شرف عالم ندوی کے والد مولانا سید فخر عالم صاحب بھی بزرگ و عالم شخصیت تھے اور ان کے علامہ سید سلیمان ندوی سے اچھے مراسم تھے، علامہ سید سلیمان ندوی نے ان کے ان صاحبزادے سید شرف عالم صاحب کے لئے دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرنے کی رائے دی، جو بہت اچھی رائے ثابت ہوئی، اس سے قبل انہوں نے اپنے والد کی نگرانی میں حفظ قرآن کریم مکمل کیا تھا، اور بعد میں وہ اپنے والد سے ہی بیعت

ہوئے اور اجازت وخلافت پا کر ان کی جگہ مسند نشین ہوئے۔

مولانا شرف عالم صاحب کا نانیہال لکھنؤ کا تھا، جہاں وہ ۲۹؍شعبان المعظم ۱۳۴۴ھ مطابق ۸؍مارچ ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے، اور اسّی سال کی عمر میں ۲۸؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ مطابق ۶؍جون ۲۰۰۵ء کو اپنے آبائی وطن بھاگلپور میں وفات پائی، بھاگلپور میں ان کی شخصیت عزت ومقبولیت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی اور ان سے دینی فائدہ پہنچتا تھا، ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے عزیز گرامی مولوی محمد حسن مانی ندوی کو ان کی نیابت حاصل ہوئی، انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلیم مکمل کر کے اپنے والد سے روحانی فیض اٹھایا، اور اب وہ ان کی جگہ پر دینی وتربیتی افادہ کا کام انجام دے رہے ہیں۔ بارك الله فى حياته ونفع به۔

شاہ شرف عالم مرحوم کی وفات میرے لئے ایک ذاتی صدمہ کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مراتب کو بلند فرمائے، اور ان کے خیر کے نفع کو جاری رکھے، آمین

حضرت مولانا سید مظفر حسین شاہ ندوی کشمیری

۱۳۴۲ھ ۱۹۲۳ء تا ۱۴۲۲ھ ۲۰۰۱ء

مولانا سید مظفر حسین ندوی کشمیری دار العلوم ندوۃ العلماء کے ان ممتاز فضلاء میں تھے، جو وہاں امتیازی حیثیت سے تعلیم حاصل کر کے پھر استاد بھی مقرر ہوئے، انہوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، ان میں حضرت مولانا علی میاں کا نام خاص طور پر نمایاں ہے، ان کے تبلیغی و دعوتی اسفار میں بھی وہ ان کے ساتھ رہے، اور کشمیر، سرحد و پنجاب کے سفروں میں بھی ساتھ تھے، جن کا تذکرہ حضرت مولانا کے خطوط میں ملتا ہے، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کا دعوت و تبلیغ کا کام جب سامنے آیا، تو اس کو صوبہ سرحد پنجاب و کشمیر وغیرہ میں روشناس کرانے میں انہوں نے بڑا حصہ لیا، وہ پاکستان کے ضلع باغ کے ایک گاؤں سوہاوہ میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے تھے، گیارہ سال کی عمر میں ندوہ میں داخلہ لیا، اور ۱۹۴۱ء میں فارغ ہوئے، اور استاد ہو کر تقسیم ملک سے پہلے تک یہیں پڑھایا، تقسیم کے بعد پاکستان میں ہی رہ گئے تھے، اور انسپکٹر اسکول و کالجس ہوئے، وہ مصنف بھی تھے، ایک سلسلہ کتب تصنیف کیا، جو کشمیر کے اداروں میں رائج ہوا، افسوس ۹ر نومبر ۲۰۰۱ء کو انہوں نے ۷۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔

قاری سید ودود الحی ندوی

۱۴۱۷ھ ۱۹۹۶ء

۲۴؍ربیع الاول ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۰؍اگست ۱۹۹۶ء کو ہندوستان کے دینی وعلمی حلقوں میں یہ خبر بڑے رنج وافسوس کے ساتھ سنی گئی کہ ہمارے قاری ودود الحی ندوی نہ رہے، وہ لکھنؤ کے رہنے والے اور سادات کے گھرانہ کے ایک مقتدر فرد تھے جنہوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور قرآن مجید حفظ کرنے کے ساتھ قرأت وتجوید میں بھی مہارت پیدا کی، چنانچہ جب ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی ۱۹۷۵ء میں منعقد ہوا، اور عرب وعجم کی ممتاز شخصیتیں اس وقت موجود تھیں قاری ودود الحی صاحب نے قرآن مجید کی تلاوت سے افتتاحی جلسہ کا آغاز کیا تو ایک سماں بندھ گیا، وہ اس خصوصیت کے ساتھ اشعار کہنے اور اشعار پڑھنے میں بھی دلوں کو موہ لیتے تھے، وہ اپنی اس خصوصیت سے لوگوں کی اصلاح عقائد کا کام لیتے تھے، چنانچہ ان کی تقاریر اور مواعظ سے لوگوں کو بہت نفع پہنچا اور خاص طور پر ممبئی میں انہوں نے بڑا دعوتی اور اصلاحی کام کیا، لکھنؤ میں بھی جوان کا وطن تھا دینی جلسوں میں بلائے جاتے اور شہدائے اسلام کے جلسوں میں بھی جو حضرت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی کے قائم کردہ ہیں خطاب فرماتے، اور سامعین کی خواہش ہوتی کہ ان کی زبان سے نعت کے اشعار اور مولانا روم کی مثنوی کے نمونے سنیں جس کو وہ بہت ہی مؤثر انداز میں پیش کرتے تھے۔

ندوۃ العلماء سے ان کا تعلق ہمیشہ قائم رہا وہ اس کی مجلس انتظامی اور مجلس نظامت

کے بھی رکن ہو گئے تھے اوراس کی میٹنگوں میں اہتمام سے شرکت فرماتے، اس طرح ان کی خصوصیات کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اوران کے مفید مشوروں سے ندوہ نے فائدہ اٹھایا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے وہ معاصر تھے لیکن بڑے قدرداں اور معترف اورمحبت کرنے والے تھے، اللہ تعالیٰ نے قاری صاحب مرحوم کو صلاح وتقویٰ اور حسن اخلاق اور خیرخواہانہ صفات سے نوازا تھا، وہ دنیا سے گئے اور ہر ایک کو جانا ہے لیکن وہ ایک مصلحانہ اورداعیانہ کردار کے ساتھ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزا عطا فرمائے اور راضی ہو۔

مولانا شاہ شبیر عطا سلونی ندوی

۱۳۵۳ھ ۱۹۳۵ء تا ۱۴۳۶ھ ۲۰۱۵ء

یہ خبر سن کر دل دہک سے رہ گیا کہ برادر عزیز مولوی شاہ شبیر عطا صاحب نہ رہے، اور وہ ایک طویل علالت کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، شاہ صاحب اودھ کے معروف علمی ودینی روحانی خانوادہ کے فرد تھے، جو گذشتہ چار صدیوں سے زائد عرصہ سے عشق ومعرفت اور علم وعمل کی جامعیت کے ساتھ ممتاز رہا ہے، جس کی نامور شخصیات میں شاہ کریم عطا، شاہ پناہ عطا اور آخر دور میں شاہ محمد نعیم عطا اور شاہ محمد حلیم عطا صاحب کی شخصیات زیادہ نمایاں ہوئی، شاہ محمد نعیم عطا صاحب اور شاہ محمد حلیم عطا صاحب حقیقی بھائی تھے، شاہ محمد نعیم عطا صاحب پر سوز عشق کا غلبہ تھا، اور وہ خانقاہ کریمیہ چشتیہ کے سجادہ نشین کی حیثیت سے عقیدت مندوں کے مرجع تھے، جب کہ حضرت مولانا شاہ محمد حلیم عطا صاحب اہل علم وتحقیق کے مقتدا اور مرجع تھے، خاص طور پر علم حدیث میں ان کا طوطی بولتا تھا، ان کو علامہ وقت شیخ حسین بن محسن انصاری خزرجی سے شرف تلمذ واجازت حدیث حاصل تھی، اور جب دار العلوم ندوۃ العلماء میں علامہ حیدر حسن خان ٹونکی کی مسند حدیث خالی ہوئی، تو ان کی جگہ استاد گرامی مولانا شاہ حلیم عطا صاحب نے لی، اور ہم لوگوں کو ان سے صحیح بخاری وغیرہ میں شرف تلمذ حاصل ہوا، اور ہمارے بعد کے لوگوں میں عزیزان مولوی واضح ومولوی سعید الرحمٰن صاحب، مولانا تقی الدین صاحب اور مولوی سید محمد الحسنی مرحوم اور خود ان کے عزیز وچہیتے اور سعادت مند فرزند مولوی شاہ شبیر عطا کو بھی یہ سعادت حاصل ہوئی، یہاں

تک کہ انہوں نے ۱۹۵۵ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولوی شاہ شبیر عطا صاحب کو ان کی خدمت کی سعادت بھی اپنے بھائی بہنوں میں زیادہ ملی، ان کے بڑے بھائی شاہ ہادی عطا نوعمری میں ۲۱ سال کی عمر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں امتیازی پوزیشن کے ساتھ تکمیل تعلیم کر کے وفات پا گئے تھے، اور دوسرے بھائی شاہ حسن عطا جو اچھے مصنف و مترجم کے طور پر ابھرے تھے، صرف چالیس سال کی عمر میں پاکستان میں وفات پا گئے، جہاں وہ ہجرت کر کے گئے تھے، سب سے چھوٹے بھائی شاہ شبر عطا بھی پاکستان چلے گئے تھے، جو بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھے، تیسرے نمبر پر شاہ شبیر عطا تھے، جو ہمیشہ ہندوستان میں رہے، اور اپنے خاندانی ورثے کی حفاظت اسی زہد و فقر کو اختیار کرتے ہوئے کی، اور بعد میں ان کو سجادگی بھی حاصل ہوئی۔

وہ ایک متواضع مزاج، خوش طبع، بے تکلف طبیعت کے حامل تھے، دوست نواز اور سادہ مزاج تھے، ایک بڑی خانقاہ کے سربراہ ہونے کے باوجود سادہ طبیعت تھے، علمی مزاق کے حامل تھے، اور حافظہ بھی غیر معمولی تھا، گویا جو پڑھ لیا تھا وہ ان کی یادداشت میں محفوظ ہو گیا، عبارت تک بجنسہ سنا دیتے، عربی اردو، اور انگریزی کی عبارتیں بھی اس طرح سناتے، جیسے وہ ان کی نظر کے سامنے ہیں اور وہ پڑھتے جارہے ہیں، مطالعہ کے بڑے شوقین تھے، کوئی نئی کتاب ہاتھ لگتی، تو اس کو ختم کئے بغیر نہ سوتے، خود ان کا ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس میں نادر و نایاب کتابیں ورثہ میں پائی تھیں، اور خود بھی کئی کتابوں کو جمع کیا تھا، کتابوں سے دلچسپی اور فنون سے اچھی واقفیت کی وجہ سے ان کی خدمات ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کے لیے بھی لی گئی، اور کچھ وقت انہوں نے اسی تعلق سے دارالمصنفین اعظم گڑھ میں گذارا، ندوۃ العلماء سے انہیں جو گہرا تعلق تھا، اس کے نتیجہ میں انہوں نے اپنے والد کا ذخیرہ کتب اور خود اپنا بھی کتب خانہ ندوۃ العلماء کے مرکزی کتب خانہ کے حوالہ کر دیا تھا، ندوۃ کے دارالعلوم میں انہوں نے کچھ مدت تدریسی وقت بھی گذارا، لیکن اپنی خانقاہی ذمہ داریوں اور اہل عقیدت و زیارت کی نگرانی اور فکر کی وجہ سے وہ کسی ادارہ کو مستقل اپنی

خدمات نہ پیش کرسکے، وہ ذاکر وشاغل اور معمولات کے پابند شخص تھے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو خاص مناسبت تھی، ان کی خدمت میں وہ حاضر ہوتے، اور قیام بھی کرتے، جب تک صحت رہی، ندوہ کی مسجد میں اعتکاف کا معمول بنائے رکھا، اور اس میں بھی ذکر وتلاوت کے ساتھ مطالعہ سے اشتغال رکھا، وہ اعتکاف کے بعد عید کی نماز اپنی خانقاہ میں آکر عیدگاہ میں ادا کرتے، اور امامت کرتے، اور اس کا ہمیشہ اہتمام رکھا کہ اس کے فوراً بعد عید ملنے رائے بریلی حضرت مولانا کے پاس آتے، ان کی وفات کے بعد ان کے افراد خاندان کے ساتھ بھی یہ وضع داری قائم رکھی۔

میرا ان کا تعلق ندوہ کی نسبت سے بھی تھا کہ وہ اس زمانہ میں زیر تعلیم تھے، جب میں ندوہ میں استاد تھا، وہ اس رشتہ کا ہمیشہ لحاظ و پاس رکھتے، اس کے ساتھ ہمارے چھوٹے بھائی ان کے ہم عصر ساتھی ہوتے تھے، اس نسبت سے ان سے برادرانہ تعلق بھی تھا، وہ ادھر دو تین سال سے بیمار تھے، اور ان کو علاج کے لیے متعدد بار اسپتال میں داخل ہونا پڑا، وہ ممبئی علاج کے لیے گئے ہوئے تھے، اور ان کی صحت خاصی بہتر ہوگئی تھی، الہ آباد پہونچ کر وہ پھر بیمار ہوئے، اور عزیزی سید محمد صابر نے اطلاع دی، کہ ۲۹ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ مطابق ۱۷ جون ۲۰۱۵ء بروز بدھ کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، ان سے یہ معلوم ہوا کہ ان کی یہ خواہش تھی کہ ان کی نماز جنازہ میں پڑھاؤں چنانچہ ۳۰ شعبان جمعرات نو بجے عیدگاہ سلون رائے بریلی میں ان کی نماز جنازہ ہوئی، جہاں ان کے عقیدت مندوں اور محبت کرنے والوں کے غیر معمولی ہجوم سے عیدگاہ اور آس پاس کا علاقہ بھرا ہوا تھا، ان میں متعدد ان کی بعض کرامتوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔

وہ ندوۃ العلماء کے فاضل ہونے کے ساتھ اس کی مجلس منتظمہ کے بھی رکن چلے آرہے تھے، اور ایک مقتدر علمی دینی شخصیت سمجھے جاتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اپنے خصوصی رحم وکرم اور فضل وانعام کا معاملہ فرمائے، پسماندگان میں دو بیٹے اور صاحبزادیاں ہیں۔

مولانا ضیاء الحسن اعظمی ندوی

۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء تا ۱۴۰۹ھ ۱۹۸۹ء

۲۳ر جمادی الاولی ۱۴۰۹ھ موافق ۲ر جنوری ۱۹۸۹ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے باکمال فرزند اور بڑے عالم حدیث مولانا ضیاء الحسن اعظمی ندوی کو ان کے سانحۂ ارتحال پرالوداع کہا، انکا حادثہ وفات صرف ندوہ سے تعلق والے حلقوں کے لئے نہیں ہے بلکہ ایک بڑا ملی سانحہ وخسارہ ہے جو ملت اسلامیہ کے علمی حلقوں کے لئے زیادہ سخت ہے، وہ مئو اعظم گڑھ میں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے، اور ابتدائی تعلیم مدرسہ مفتاح العلوم میں حاصل کی، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کر کے وہاں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہو کر عربی ادب ولغت میں عبور پیدا کیا، اور یہاں دو تین سال گزار کر پھر محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی خدمت میں مئو میں رہ کر علم حدیث میں مزید استفادہ کیا، اور تین سال ان کی خدمت میں گزار کر علم رجال حدیث اور فن حدیث میں کمال پیدا کیا، پھر مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں استاد ہو گئے اور وہاں سے دارالعلوم ندوۃ العلماء اس کے ناظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی خواہش کے احترام میں منتقل ہو گئے، اور ان کے ذمہ حدیث شریف کی اعلیٰ کتابیں سپرد کی گئیں، اور آخر میں دس پندرہ سال کی مدت انہوں نے صحیح بخاری شریف کی تدریس وخدمت میں گزاری اور ہمیشہ اس کا اہتمام کیا کہ یہ مبارک کتاب مکمل کریں۔ چونکہ دونوں جلدیں انہی کے سپرد تھیں اور انہوں نے اپنے کو پورے طور سے اس کے لئے یکسو کر لیا تھا

جس کے لئے انہیں الگ اوقات کی ضرورت پڑتی تو اس میں بھی وہ طلبہ کی خدمت کے لئے تیار رہتے، اور پورا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے، اور ندوۃ العلماء میں جو حدیث کا طریقۂ تدریس ہے اس کا بھی وہ پورا لحاظ کرتے، حالانکہ وہ بہت بیمار رہنے لگے تھے لیکن اعذار وامراض کے باوجود وہ اس میں اپنا پورا وقت صرف کرتے اور اس کے علاوہ طلبہ کی خاص طور سے جو ان کے زیر نگرانی تھے بڑی دینی تربیت ورہنمائی بھی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مقام کو بلند فرمائے اور ان کے علم کو ان کے لئے صدقۂ جاریہ بنائے۔

ندوۃ العلماء نے ان کی وفات سے اپنا ایک عظیم مدرس حدیث وعالم ومحقق علم حدیث کھویا ہے اور ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اسی طرح ہے کہ ہر شخص جو جاتا ہے اپنی خصوصیات کے ساتھ جاتا ہے، دوسرا الگ خصوصیات رکھتا ہے۔

مولانا مرحوم نے اپنے پیچھے اولاد میں جو صاحبزادگان چھوڑے ہیں وہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ان کے ایک بھائی ہیں جو ان کے زیر تربیت رہ کر حدیث وفقہ کے اچھے استاد بنے اور اب دار العلوم میں استاد ہیں۔

مولانا طیب عثمانی ندوی مرحوم

۱۴۳۶ھ ۲۰۱۵ء

بہار کے عثمانی خاندان کے متعدد افراد نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی، ان میں قدیم ندوی فضلاء میں ایک ممتاز نام برادر گرامی مولانا طیب عثمانی ندوی کا بھی ہے جن کا عصر اور میرا عصر ایک ہے، البتہ درجہ میں وہ مجھ سے دو تین سال پیچھے تھے، لیکن وہ زمانہ طالب علمی سے ہی سنجیدہ اور مطالعہ کے شائق تھے اور انتظامی صلاحیت کا بھی مزاج رکھتے تھے اور طلبہ کی انجمن کے تعلق سے بھی اچھی صلاحیت تھی، جمعیۃ الاصلاح کے ناظم بھی منتخب کیے گئے، اور یہ وہ سال تھا جب دار العلوم ندوۃ العلماء کو جمعیۃ العلماء ہند کے لکھنؤ میں منعقد اجلاس اپریل ۱۹۴۸ء میں اس کے مندوبین اور مہمانوں کی ضیافت کا بھی موقع ملا، اور ان کی تکریم وضیافت کا ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا گیا کہ الاصلاح کی طرف سے ایک علمی و تاریخی نمائش کا انتظام کیا جائے جس سے اچھی ضیافت طبع ہوگی چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی سرپرستی و رہنمائی میں ناظم الاصلاح مولوی طیب عثمانی ندوی مرحوم اور ان کے رفقاء نے اس خدمت کو انجام دیا، اور اس کا بہت مثبت اثر بھی سبھی مندوبین، مہمانوں اور قائدین ملت وعلماء پر پڑا، اور اس کا سب سے زیادہ اظہار قدردانی صدر جمعیۃ العلماء شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور بانی مسلم مجلس مشاورت ڈاکٹر سید محمود نے کی، اور جیسا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ڈاکٹر سید محمود مرحوم کے تذکرہ میں ذکر کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس وقت بہار کے وزیر تعلیم تھے، انہوں نے

ازراہِ قدردانی پٹنہ جاکر اپنے محکمہ کی طرف سے ''انجمن الاصلاح'' کو دوسو روپئے بھجوائے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اس یادگار نمائش کے متعلق جو تحریر کیا ہے، وہ اس طرح سے ہے:

''اپریل ۱۹۴۸ء میں جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ جلسہ لکھنؤ میں ہوا، مندوبین اور مہمانوں کا قیام دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں تھا، مجھے خیال ہوا کہ اگر اس موقع پر معزز وذی علم مہمانوں کی ضیافت طبع کے لیے طلبہ کی ''انجمن الاصلاح'' کی طرف سے ایک علمی وتاریخی نمائش کا انتظام کیا جائے تو ہر طرح موزوں وبرمحل ہوگا، اس وقت عزیزی مولوی طیب عثمانی ''الاصلاح'' کے ناظم تھے، میں نے والد ماجد حکیم سید عبدالحی صاحب کی عربی تصنیفات "نزهة الخواطر" کی آٹھ جلدوں اور'معارف العوارف فی انواع العلوم والمعارف" کی مدد سے ایسے تاریخی معلومات چارٹ تیار کیے جن کو دیکھنے سے ایک نظر میں معلوم ہوجاتا تھا کہ ہندوستان کے ہزار سالہ اسلامی عہد میں ہر علم وفن میں کون کون سی اہم شخصیتیں پیدا ہوئیں، علماء ہند کی وہ تصنیفات کون کون سی ہیں جو بین الاقوامی شہرت رکھتی ہیں، اور تاریخ اسلام کے پورے علمی ذخیرہ میں ان کی امتیازی شان کیا ہے، ہندوستان میں کس کس دور میں کون کون سے علمی وروحانی مراکز تھے اور کہاں کہاں بڑے مدارس قائم ہوئے؟

نظام ونصاب تعلیم میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں؟ مختلف زمانوں میں کیا کیا معیار فضیلت رہے؟ غرض چند نقشوں میں ہندوستان کی علمی ودینی تاریخ کا ابھرا ہوا خاکہ اور ہزاروں صفحات کا عطر کھینچ کر آگیا تھا، سینکڑوں آدمیوں نے اس علمی نمائش کی سیر کی لیکن اس سب سے زیادہ دلچسپی دوصاحبوں نے لی، ایک صدر جلسہ مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے، دوسرے ڈاکٹر سید محمود صاحبؒ نے، ڈاکٹر صاحبؒ اس وقت بہار کے

وزیر تعلیم تھے، انہوں نے ازراہِ قدردانی پٹنہ جاکر اپنے محکمہ کی طرف سے انجمن الاصلاح کو دوسو روپئے بھجوائے“۔

[پرانے چراغ، ج۱/ص۳۳۶]

مولانا طیب عثمانی مرحوم دار العلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہوکر اپنے وطن گیا چلے گئے، اور فکر اسلامی وصحافتی کاموں میں مشغول ہوئے، جماعت اسلامی کے تحت ایک رسالہ ”نئی نسلیں“ جماعت کے ایک مقامی رکن نسیم صاحب کی شرکت سے لکھنؤ میں جاری کیا، جوان دونوں کی ادارت میں لکھنؤ سے نکلتا رہا، اسی وجہ سے انہیں اپنے وطن سے دوبارہ لکھنؤ آکر قیام کرنا پڑا تھا، پھر وہ واپس اپنے وطن بہار چلے گئے تھے، ان کا مزاج تحریکی تھا اور وہ اس سلسلہ میں جماعت اسلامی سے بھی وابستہ تھے اور ان کے مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے، بعض کتابیں بھی لکھیں، اور ان کے چھوٹوں نے ان سے تربیت بھی لی، بہار کے اس عثمانی خاندان کے متعدد افراد اچھے قلمکار بنے، جن میں خاص طور پر پروفیسر محسن عثمانی ندوی، امین عثمانی ندوی اور خود ان کے بیٹے شاہ رشاد عثمانی قابل ذکر ہیں، شاہ رشاد عثمانی نے تدریسی خدمات بھی انجام دیں اور عرصہ تک وہ جنوب ہند میں اس کے مشہور علمی وادبی گہوارہ بھٹکل میں ایک کالج میں استاد رہے، اور اس کے ساتھ لکھنے لکھانے کا بھی سلسلہ جاری رکھا، اور شعر وادب پر ان کی کئی کتابیں سامنے آئیں۔

افسوس ادھر کئی سال سے مولانا طیب عثمانی مرحوم گیا شہر میں اپنے ایک چھوٹے اور سادہ مکان میں اپنی علالت اور اعذار کی بنا پر محصور ہوکر رہ گئے تھے، اور اپنی ملی وتحریکی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہوگئے تھے، اپنے ایک گیا کے سفر میں ان کی عیادت کو جانے کا بھی موقع ملا، وہ اپنے پرانے تعلق کی بنا پر بہت خوش ہوئے اور پرانی یادیں تازہ ہوئیں، وہ قلب کے مریض تھے، بظاہر یہی مرض ان کی وفات کا سبب بنا، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور راضی ہو۔

۱۴/ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۲۹/ستمبر ۲۰۱۵ء کو ان کی وفات ہوئی۔

مولوی عبدالباری ندوی

۱۳۸۱ھ ۱۹۶۱ء تا ۱۴۳۷ھ ۲۰۱۶ء

جنوبی ہندوستان کے صوبہ کرناٹک کے دینی وعلمی شناخت رکھنے والے علاقے کے ایک بڑے صالح اور نیک سیرت اور بڑے منتظم مولوی عبدالباری ندوی بھٹکلی اپنے رب سے جاملے، اوراس دنیا سے رخصت ہوئے، لیکن انہوں نے جو کارنامے انجام دیئے، اور علم ودین کی جو خدمت کی، اس بناء پران کا ذکر جاری رہے گا، ان کے اس دنیا سے رخصت ہونے پر کثرت سے لوگوں کو غم میں ڈوبا ہوا پایا گیا، اوران کو اس طرح رخصت کیا کہ ایک بہت بڑی دولت اور بڑی نعمت ان کے ہاتھ سے جارہی ہے، اوراس میں شبہ نہیں کہ ان سے جو خیر پھیل رہا تھا، اور جس طرح وہ دین کی اور علم دین کی خدمت انجام دے رہے تھے اور جس انداز سے اور حکیمانہ طریقہ سے وہ کام کررہے تھے ان کے نہ رہنے سے اس میں بڑی کمی پیدا ہوئی ہے، اس کمی کو اللہ ہی دور کرنے کی کوئی شکل پیدا فرمائے گا، ان کی جو صفات و خصوصیات تھیں وہ ہر کسی میں نہیں ہوتی، اور ایسے لوگ نادرالوجود ہوتے ہیں، جو لوگوں کے دلوں کو جیت لیں، اور اجتماعی زندگی میں اس طرح کا طریقہ اختیار کریں کہ سب کی تائید ان کو حاصل ہو اوران کے کام کو تقویت حاصل ہو۔

مولانا عبدالباری صاحب اس طرح بڑی علمی صلاحیت کے حامل انسان تھے، اور جمعہ میں بھٹکل کی جامع مسجد میں خطبہ دیتے تھے، عربی پران کو عبور حاصل تھا، عربی خطابت کا انداز دل موہ لینے والا تھا، میں نے ان کے پیچھے کئی مرتبہ جمعہ کی نماز پڑھی اوران کا خطبہ جمعہ

سنا ہے، میری توقع سے زیادہ میں نے ان کو پایا، اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی خصوصیات سے نوازا تھا جس سے بھٹکل واطراف میں ان کو مقبولیت عامہ حاصل تھی، اور وہاں جو دینی ودعوتی تعلیمی کام ہو رہے ہیں، ان کو وہ بھرپور تعاون دیتے اور ہمدردی کے ساتھ ان کاموں کو بڑھانے میں معاون ہوتے تھے، مثلاً عزیز گرامی مولوی الیاس ندوی جو تعلیمی کام کر رہے ہیں، علی پبلک اسکول کا قیام، اسلامی ماحول میں عصری تعلیم کا انتظام، تعارف اسلام کے لیے جلسوں اور مسابقات کا انعقاد اور مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی کا کام اس طرح کے کاموں میں ان کا بھرپور تعاون اور سرپرستی حاصل تھی، اس کے علاوہ دوسرے دینی ودعوتی و تبلیغی کاموں میں بھی مقدور بھر حصہ لیتے تھے، اور خصوصاً انفرادی طور پر عوام ان سے رابطہ رکھ کر اپنے دینی و عائلی زندگی میں ان سے مشورہ لیتے اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے، انہیں اصلاح واسترشاد کے سلسلہ میں حضرت مولانا علی میاں ندوی کے سلسلہ میں اجازت بھی حاصل ہوگئی تھی لیکن وہ اس میں تواضع واخفاء سے کام لیتے تھے۔

جہاں تک جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں ان کی تدریسی خدمات اور پھر منصب اہتمام پر فائز ہو کر ان کی انتظامی صلاحیت کو سب نے سراہا، وہ ایک اچھے صالح عالم دین اور داعی و مربی شخصیت کے حامل و مالک تھے، ان سے مجھے ذاتی طور پر خصوصی تعلق تھا، اور میں ان کے متعلق اچھی رائے رکھتا تھا، جب جامعہ اسلامیہ کے مہتمم بنائے جانے کی بات تھی تو انہوں نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے میں میری رائے پر موقوف رکھا، اور اپنے کو اس کا اہل نہیں سمجھا، لیکن میں ان کی دینی وعلمی صلاحیت اور لوگوں کو ساتھ لے کر کے چلنے کے مزاج اور طبیعت کی نرمی سے واقف تھا، میں نے ان کو اس منصب کے قبول کرنے کی رائے دی، انہوں نے پھر اس منصب کو قبول کیا، اور اس کا حق ادا کیا، ان کے زمانہ اہتمام میں جامعہ اسلامیہ نے بڑی ترقی کی، اور اس کا دائرہ عمل وسیع ہوا، طلبہ کی تعداد بڑھی اور اطراف میں اس کی شاخیں بھی قائم ہوئیں، جس سے اب ہزاروں لوگ مستفید ہو رہے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ جامعہ کو ترقی دینے میں اور اس کو صحیح طور پر کارآمد طریقہ سے چلانے میں مولوی

عبدالباری کا بڑا حصہ ہے۔انہیں جامعہ کی انتظامیہ اور اساتذہ سب کا اچھا تعاون ملا، اور میرا خیال صحیح نکلا کہ وہ اس منصب کے لیے موزوں ہوں گے، اور جامعہ کو ان سے نفع پہونچے گا، انہوں نے جامعہ کی جو خدمت انجام دی، سب اس کو سراہ رہے ہیں، اور اس کی قدر کررہے ہیں، آدمی کی یہ بڑی مقبولیت اور بڑائی کی بات ہے کہ جب وہ دنیا سے رخصت ہو، تو سیکڑوں ہزاروں آدمی ملول ہوں، اور صحیح بات یہ ہے کہ بھٹکل میں اس واقعہ کو بہت غم کے ساتھ دیکھا اور سنا گیا، بھٹکل میں اس سے پہلے کبھی اتنی بڑی تعداد میں مجمع جمع نہیں ہوا، جوان کے جنازے اور تدفین میں دیکھا گیا، ایسا شخص جس سے لوگ اس طرح محبت اور اس کی اتنی قدر کرتے ہوں عام طور پر معدوم ہوتے ہیں، اور ان کے نہ ہونے سے جامعہ اور بھٹکل کا جو نقصان ہوا ہے اس کو دوسرے لوگ بھی محسوس کررہے ہیں۔

لیکن یہ بات اچھی توقع کی ہے کہ ان کے رفقاء جامعہ جو اکثر وہاں کے اساتذہ ہیں اور اچھی لیاقت وصلاحیت کے حامل ہیں، اور دوسرے ان کے تیار کردہ افراد کہ وہ اپنے پیچھے فضلاء اور کام کرنے والوں کی ایک ٹیم تیار کرگئے، یہ ان کے جاری کئے ہوئے کاموں کو آگے بڑھائیں گے، اور جس طرح عزیز مرحوم نئی نسل کی تربیت کا ذریعہ بنے ہوئے تھے تعلیم وتربیت کا اور دین سے جوڑنے کا اور بھٹکل کے لوگوں کو دین سے وابستہ کرنے کا ان شاءاللہ وہ کام جاری رہے گا۔

یہ ان کی سعادت وعزت اور شرف کی بات ہے کہ وہ اپنے پیچھے صرف اپنے گھر کے افراد کو چھوڑ کر نہیں گئے، بلکہ کارگذار افراد کی ایک بڑی جماعت اور ہزاروں طلباء و مستفیدین کو چھوڑ کر گئے، البتہ گھر والوں کے لیے یہ حادثہ زیادہ صدمہ کا ہے، خصوصا ان کے والدین کے لیے جن کی خدمت کو خود وہ اپنے لیے سعادت دارین سمجھتے تھے، معلوم ہوا کہ انہی کے علاج کے سلسلہ میں وہ منگلور دو تین ماہ قبل گئے تھے، اور خود ان کے پیروں کی تکلیف کم نہیں ہورہی تھی، ڈاکٹروں سے جب ان کا بھی چیک اپ ہوا اور پھر اس مرض کا انکشاف ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے، گذشتہ ماہ جنوری کے پہلے ہفتہ میں بنگلور کے سفر

کے دوران ان کی عیادت بھی کی تھی جہاں وہ ایک اسپتال میں زیر علاج تھے، پھر دوبارہ جب وہ اپنی بہن کے گھر پر تھے اس وقت بھی جا کر عیادت کا اتفاق ہوا، بالکل اندازہ نہ تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے، بلکہ امید تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت دے گا، اور ابھی مزید دین کے کام ان سے لے گا، انہوں نے اپنی عمر کی ۵۵ بہاریں دیکھیں، یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ یہ پوری عمر دین سے متعلق کاموں میں لگائی اور زندگی کے آخری ایام جیسا کہ تفصیلات سننے میں آئیں بہت قابل رشک تھے، اللہ تعالیٰ سے ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ انہیں وہاں بھی بلند مقام عطا کرے گا۔

انہوں نے جس طرح لوگوں کو دین اور دینی تعلیم کی طرف راغب کرنے کا کام کیا، اور خود ایک معیاری زندگی پیش کی، اس کو دیکھ کر باہر کے لوگوں میں اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلانے کا شوق پیدا ہوا، اور خود انہوں نے اپنی اولاد کے لیے اس کو اختیار کیا، ان کے تینوں بیٹے جامعہ اسلامیہ سے فارغ التحصیل ہو کر دارالعلوم ندوۃ العلماء سے بھی کسب فیض کر چکے ہیں، اور ایک صاحبزادی بھی جامعات الصالحات سے فارغہ ہیں اور ان کا نکاح بھی بھٹکل کے ایک دیندار گھرانے میں نیک سیرت نوجوان بلال سلمہ سے ہو چکا ہے۔

میں اللہ تعالی سے دعا کرتا ہوں کہ انہیں اعلیٰ مراتب نصیب ہوں، اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، ان کے اعزہ واقارب وسبھی پسماندگان اہل تعلق کو صبر کا ثواب عطا فرمائے۔

مولانا عبدالرشید اعظمی ندوی

۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء تا ۱۴۲۵ھ ۲۰۰۴ء

مولانا عبدالرشید اعظمی ندوی ۱۹۲۸یا۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے تھے، اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے، تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حاصل کی تھی اور ۱۹۴۸ء میں فارغ ہوئے، علمی اور دعوتی کاموں میں مشغول ہونے کے ساتھ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ربط قائم کیا، اور ان کے ساتھ حجاز مقدس اور پھر مصر کے سفر میں بھی ساتھ رہے جو ۵۰-۱۹۵۱ء میں پیش آیا تھا، ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ طالب علمی کے زمانہ میں ہی ان کا عربی خط بہت اچھا اور خوش نما تھا، حضرت مولانا سے جب وہ قریب ہوئے تو ان کو حضرت مولانا کی بعض تحریروں کی تبییض کا شرف حاصل ہوا، اور وہ اپنی اس خصوصیت سے معروف ہوئے، اور حضرت مولانا سے اس قدر قریب ہوئے کہ ان کے سکریٹری بلکہ پرائیویٹ سکریٹری کا تعلق ہوگیا، اور پھر فراغت تعلیم کے بعد عرصہ تک حضرت مولانا کے ساتھ ان کی قیام گاہ میں رہے، اس دور میں لکھنؤ میں حضرت مولانا کا زیادہ تر قیام مرکز دعوت وتبلیغ کچہری روڈ امین آباد میں ہوتا تھا، حضرت مولانا سے اس قریبی تعلق کی وجہ سے ان کے عزیزوں سے بھی ان کا تعلق تھا، اس لئے میرا بھی ان سے اچھا ربط تھا، اور حجاز مقدس میں ساتھ رہنے کی وجہ سے یہ تعلق اور بڑھ گیا تھا، اور حجاز ومصر کے دعوتی کاموں میں ان سے حضرت مولانا کو اچھی مدد ملی، وہ حضرت مولانا کے نہ صرف مزاج شناس تھے بلکہ ایک عملی اور کارگزار شخص کی صفات رکھنے کی وجہ سے ان کے کاموں کی انجام دہی میں پیش پیش رہتے

تھے، بعد میں ان کی عائلی اور کاروباری مصروفیات ومسائل نے وہ قرب قائم نہ رہنے دیا، لیکن وہ یادیں اور نقوش برابر قائم رہے۔

حضرت مولانا کے ایک دوسرے عزیز شاگرد مولانا معین اللہ ندوی سے بھی ان کا اچھا ربط وتعلق تھا اور حجاز ومصر کے دعوتی سفر میں یہ دونوں ہی حضرت مولانا کے بڑے معاون رہے تھے۔ آخر میں ان کا قیام لکھنؤ میں ہوگیا تھا، اس طرح ملاقات کے مواقع بھی ملنے لگے تھے، ان کے بیٹے ارشد اعظمی صاحب بھی اس تعلق کو محسوس کرتے ہوئے ہم لوگوں سے ربط رکھتے ہیں، اور لکھنؤ میں ہی قیام پذیر ہیں، جہاں مولانا عبدالرشید صاحب نے اقامت اختیار کی تھی، افسوس کہ وہ کچھ سالوں سے زیادہ علیل ہوگئے تھے اور نشاط ہاسپٹل میں زیر علاج بھی رہے، پھر گھر میں علاج چلتا رہا، آخر ۸/اگست ۲۰۰۴ء کو لکھنؤ میں ہی وقت موعود آ گیا، وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، ان کی عمر تقریباً پچھتر سال تھی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور راضی ہو۔

مولوی عبدالسمیع جعفری ندوی

۱۳۵۵ھ ۱۹۳۷ء تا ۱۴۳۶ھ ۲۰۱۵ء

مولوی عبدالسمیع جعفری ندوی اس مجاہد اور علمی خاندان کے فرد تھے جس کو عظیم آباد اور صادقپور پٹنہ بہار کی نسبت سے جانا جاتا ہے جہاں ان کا مستقر تھا اور ان کے اصلاحی اور تحریک جہاد کے عمل کی بناء پر انگریز حکمرانوں نے نہایت ظلم و بربریت سے ان کے مستقر کو توڑا اور ان کو ملک بدر کیا تھا، یہ مجاہد حضرات مولانا ولایت علی و مولانا عنایت علی، مولانا احمداللہ، مولانا عبدالرحیم صادق پوری اور مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی کے نام سے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے جاں بازوں کی حیثیت سے معروف ہوئے (۱)، انہوں نے اپنی مجاہدانہ کوششوں کے سلسلہ میں بڑی قربانیاں دیں، برٹش حکومت نے انہیں اپنی حکومت کا باغی قرار دیا، ان پر اور ان کے رفقاء کرام پر بڑے مظالم ڈھائے، اس خاندان کی آخری یادگار مولانا عبدالخبیر صادق پوری تھے، جو بہترین عالم دین، مفسر قرآن، مجاہد آزادی اور

(۱) حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد و اصلاح میں آپ کے نقش قدم پر چلنے والوں اور آپ کے ارادت مندوں میں سب سے بڑا حصہ خاندان صادقپور کا ہے، اس خاندان کے ایک ایک فرد نے جس وفاداری، جاں نثاری، عقیدت واحترام اور راہ حق میں قربانیاں دینے کا جو نمونہ پیش کیا، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، ایک یہ خاندان ہے جس کو راہ خدا میں سب کچھ قربان کرنا پڑا، اپنی جان و مال سے لے کر مکان و دیار تک سب کچھ لٹا کر یہ لوگ رب کی بارگاہ میں سرخرو ہوئے، وہ آج بھی تاریخ کے صفحات میں زندہ و تابندہ ہیں، لیکن ان کی کسی یادگار کا وجود نہیں ملتا، اور دوسرا خاندان سرحد کے سادات ستھانہ کا ہے، جس نے مجاہدین کی نصرت و اعانت اور شریعت و جہاد کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں پیش کی، حادثہ بالاکوٹ کے بعد مجاہدین کو سہارا دینے والے اسی خاندان صادقپور کے چشم و چراغوں نے مدت تک جل کر ایک امت کو روشنی دینے کا کام کیا، اور اپنے خون سے اس چمنستان جہاد کی آبیاری کی، جس کی بنیاد حضرت سید احمد شہید رکھ گئے تھے۔

ہمارے ندوۃ العلماء کے رکن مجلس انتظامی بھی تھے، ان کے بعد ان کے بڑے صاجزادے مولانا عبدالغنی جعفری نے نمائندگی کی اور ان کی وفات کے بعد ان ہی کے بھائی مولانا عبدالسمیع جعفری ندوی اس خاندان والاشان کی آخری یادگار رہے، وہ ندوۃ العلماء کے رکن مجلس انتظامی منتخب ہوئے، افسوس کہ وہ بھی ہمارے درمیان نہیں رہے۔

مولوی عبدالسمیع جعفری مرحوم کا خاندان حضرت جعفر طیار بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نسبت رکھتا ہے، اسی لیے وہ جعفری لکھتے تھے، انہوں نے ان نسبتوں کا ہمیشہ خیال رکھا، اور بڑی جفاکشی، محنت وریاضت اور دلجمعی سے حصول علم میں مشغول رہے، حصول علم میں اشتغال کے ساتھ وہ نماز واذکار وغیرہ کے بھی بڑے پابند رہے تھے، اور انہوں نے علم وعمل اور جہاد وعزیمت کی جامعیت کو قائم رکھا تھا، جس سے یہ خاندان ہمیشہ معروف وممتاز رہا ہے، انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حصول تعلیم کے بعد مدینہ منورہ کے جامعہ اسلامیہ میں مدینہ پاک کے عطر بیز ماحول میں بھی اچھا وقت گذارا تھا اور حجاز مقدس میں

= اس خاندان کا سلسلہ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے واسطے سے حضرت زبیرؓ بن عبدالمطلب سے جاملتا ہے، اس خاندان کے سربراہ مولوی فتح علی کو حضرت شہید نے اپنی اجازت وخلافت سے نواز کر ہجرت سے قبل ان کی کبرسنی کی وجہ سے گھر بھیج دیا تھا، وہ عمر بھر مجاہدین کی مالی وجانی مدد کرتے رہے، حادثہ بالاکوٹ کا غم برداشت نہ کرسکے اور انتقال کرگئے، اس خاندان کے افراد باوجود مرفہ الحالی کے دین کی خاطر اپنی جانوں، مالوں اور عزت وناموس کو قربان کرنے والے تھے، وہ جب تک جیتے رہے دین حق کے لیے قربانیاں دیتے رہے، جاں فروشی کرتے رہے، اور جہاد کی آگ روشن کرتے رہے، ان میں وہ بھی تھے جن کے عزم جواں اور یقین محکم نے بہتے ہوئے دھارے کو موڑا، ان میں وہ بھی تھے جو سراپا عشق ومستی بنے، اور ان کے قدموں کو دار ورسن نے چوما، ان کے گھروں کو مسمار کیا گیا، محلّہ کو کھیت بنادیا گیا، ان کو پھانسی گھر پہونچایا گیا، اور ظلم وبربریت کے پہاڑ توڑے گئے، مگر ان کے پائے ثبات کو لغزش نہ آئی، ان میں سب سے بڑے امام ومقتدا مولانا ولایت علی عظیم آبادی، مولانا عنایت علی عظیم آبادی، مولانا یحییٰ علی، مولانا عبداللہ جیسے لوگوں نے مجاہدین کی کمان سنبھالی، اور ایک مدت تک دشمنوں سے برسرپیکار رہے، اسی طرح مولانا فیاض علی، مولوی اکبر علی، مولوی قمر الدین، اور تحریک مجاہدین میں راہ خدا کے پہلے شہید مولوی باقر علی جنھوں نے انمٹ نقوش کے ذریعہ سے راہ جہاد کو آراستہ کیا، مولانا عبداللہ کے دور امارت میں اس خاندان کو وہابیت سے موسوم کرکے اس کے خلاف ہندوستان کے طول وعرض میں بغاوت کے مقدمے چلاکر گرفتاریاں وپھانسیاں ہوئیں، اور ماخوذین کی ایک تعداد کو جلاوطن کردیا گیا، اور ان کے محلات میں ہل چلاکر اس کا وجود تک مٹادیا گیا، ان کی مفصل داستان، سرگزشت مجاہدین، صادقین صادق پور، الدرالمنثور فی احوال صادقپور میں پڑھی جاسکتی ہے۔

مزید وقت گذار کر اپنے وطن عظیم آباد پٹنہ میں صادق پور کے مدرسہ اور امارت اہل حدیث کے امیر منتخب ہوئے تھے، اور ان کے خاندان کے جہاں جہاں اثرات تھے، وہ لوگ ان سے مرتبط اور ان کی امارت میں ان کی باتوں پر عمل کرنے والے تھے، انہیں اپنے والد مولانا عبدالخبیر صادق پوری مرحوم سے اپنے آبائی سلسلہ میں سلوک واحسان میں اجازت بھی حاصل تھی جو ان کے خاندان کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے توسط سے حاصل ہوئی تھی۔

مولوی عبدالسمیع جعفری مرحوم جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں زیر تعلیم تھے، تو کئی باران کے والد ماجد مولانا عبدالخبیر مرحوم ندوہ آئے، اور مولوی عبدالسمیع کے اساتذہ سے محبت وتعلق سے ملے، میں علیل تھا تو بطور شفقت مجھ کو دیکھنے شہر میں میری قیام گاہ پر تشریف لائے، اور مزاج پرسی کی، وہ رائے بریلی بھی گئے اور وہ جگہ دیکھی جہاں ان کے خاندان کے عالی مرتبت حضرات اپنا وقت حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ گذار چکے تھے، اور یہیں سے وہ جذبہ وولولہ لے کر گئے تھے جس کی اس خاندان نے ہمیشہ پاسداری کی۔

مولوی عبدالسمیع جعفری مرحوم کو بھی بعض آزمائشوں سے گذرنا پڑا، ایک بار کچھ دشمنوں نے ان کو ایک فرضی سازش کا الزام لگا کر گرفتار کرانا چاہا، اور سیکورٹی فورس کے لوگ انہیں گرفتار کرنے بھی آگئے اور وہ بھی جانے کو تیار ہوگئے، لیکن ان کے ارادت مندوں اور عقیدت مندوں نے ایسا احتجاج کیا کہ پھر ان کو لے جانے کی ان لوگوں کو ہمت نہ ہوئی، ان کی وفات پر جو تاثرات سامنے آئے ہیں، اس میں ان کی خوبیوں میں انکساری، سادگی، شخصیت کا توازن، نرم گوئی، حق پسندی اور ورع وتقویٰ اور عقیدہ کی صلابت خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کی وفات سے جو خلا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو پر فرمائے، اور ان کی خدمات کو قبول فرما کر ان کے مقام کو بلند فرمائے آمین، ان کا انتقال ۴-۵/اکتوبر ۲۰۱۵ء مطابق ۱۹-۲۰ ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ کی نصف شب میں پٹنہ میں ہوا جس کے ایک اسپتال میں وہ ۱۷، ۱۸ دن سے بستر علالت پر رہے، دوشنبہ کو ان کی نماز جنازہ ہوئی، جس میں غیر معمولی ہجوم تھا، یہ ان کی محبوبیت اور مقبولیت کی ایک علامت تھی، اللہ تعالیٰ ان کے مقام کو بلند کرے اور راضی ہو۔

مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ

۱۳۳۷ھ ۱۹۱۹ء تا ۱۴۳۱ھ ۲۰۱۰ء

مولانا محبوب الرحمٰن ازھری کیرانوی اس آخری عہد کی ممتاز عالم شخصیتوں میں سے تھے، ان کا مختصر علالت کے بعد ۹۱ سال اور قمری لحاظ سے ۹۴ سال کی عمر میں ۴؍ جمادی الاول ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۰/ اپریل ۲۰۱۰ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

ان میں امت مسلمہ اور دعوت دین کے معاملات سے دلچسپی لینے کا خصوصی جذبہ تھا، اس کے لیے انہوں نے اپنی علمی وعملی صلاحیتوں سے کام لیا، خاص طور پر قادیانیوں کے مقامات مقدسہ میں پہونچنے کی کوشش کا علم ہونے پر اس کے روکنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کیں، سعودی سفارتخانہ کو اس بات سے آگاہ کیا، اور قادیانیوں کے اس مضر اقدام سے واقف کرا کے اس کے روکنے کا ذریعہ بنے۔

اسی طرح دیگر باطل تحریکوں پر ان کی نظر تھی، اور اس کے ساتھ علمی وتعلیمی کاموں کی انجام دہی کو انہوں نے اپنی زندگی کا مشغلہ بنایا، عربی کی رائج الوقت زبان سے آغاز کیا، اور دیگر علمی موضوعات کو بھی اختیار کیا، اس سلسلہ میں فن کی تخصیص نہ تھی، ندوۃ العلماء میں انہوں نے عربی زبان کی تعلیم کو فنی انداز سے رائج کرنے میں خصوصی حصہ لیا، اور اس کے لیے ایک نصابی کتاب بھی تیار کی، جو تدریسی نصاب میں داخل ہے، ندوۃ العلماء میں ایک مدت تک تعلیم دینے کے بعد وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں منتقل ہوئے، وہاں مدت تعلیم گذار کر ریٹائر ہوئے، اور ندوۃ العلماء سے دوبارہ تعلق قائم کیا، وہ اسی مرحلہ میں ندوۃ العلماء

میں باقاعدہ مدرس تو نہ ہوئے، بلکہ آزادانہ طریقہ سے دو یا تین سبق پڑھاتے تھے، اس کے لیے وہ بڑے اہتمام سے پابندی کے ساتھ ندوہ آتے تھے، اپنی علالت کی دشواریوں کو بھی نظر انداز کر دیا کرتے تھے، وہ متواضع اور خدمت کے جذبہ کے ساتھ سب سے تعلق رکھتے تھے، اپنے سے چھوٹے اور شاگردی میں رہے افراد سے بھی وہ محبت وشفقت کا برتاؤ کرتے تھے، اس طرح ہر ایک ان سے ملنے والا ان سے مل کر خوش ہوتا تھا، وہ عملی انسان تھے، اپنی صحت کی کمزوری کو بھی نظر انداز کرتے اور کام کا جو معمول تھا اس کو قائم رکھتے تھے۔

وہ دینی علوم اور عربی زبان وادب میں امتیاز رکھتے تھے، اور عربی زبان کی تدریس کا ان کو اچھا تجربہ اور اس سلسلے میں مہارت حاصل تھی۔ اس کے ساتھ انھوں نے دینی علوم میں بھی کمال پیدا کیا تھا، اور اس سلسلہ میں بھی دارالعلوم ندوہ میں انہوں نے دینی کتابوں کا درس دیا، اس میں صحیح بخاری اور مسلم شریف جیسی عظیم کتابوں کا درس بھی شامل رہا، اسی کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طلبہ کی نگرانی اور رہنمائی کی ذمہ داری بھی کچھ عرصہ انجام دی، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کو اپنے علمی تعاون اور گراں قدر مشوروں سے تقویت پہنچانے کا سامان فراہم کیا، انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اپنے آغاز جوانی سے تدریسی خدمت کی تھی، چنانچہ آج دارالعلوم کے بعض سینئر اور ذمہ دار اساتذہ ان کے شاگردوں میں ہیں، مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تدریسی خدمات کے دوران ان کی رفاقت معروف اسلامی محقق ومصنف مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی سے رہی، جو عزیزانہ روابط کی شکل اختیار کرگئی تھی، اور ان کا یہ تعلق آخر تک قائم رہا، جب کہ وہ کلکتہ اور یہ لکھنؤ میں رہنے لگے تھے۔

مولانا محبوب الرحمٰنؒ کو مکہ مکرمہ سے بھی گہری علمی مناسبت رہی، وہاں کی مشہور درسگاہ مدرسہ صولتیہ میں انھوں نے پڑھایا اور پڑھا بھی اور کئی بار مکہ مکرمہ میں منعقد عالمی مسابقۂ قرآنی میں حکم کی حیثیت سے بھی شرکت فرمائی، اور حصولِ علم کے جذبے سے انھوں نے جامعہ ازہر سے بھی ڈگری لی، قرآن مجید کی ابتدائی تعلیم مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں حاصل کی تھی، اور قرآن مجید سے تعلق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ ستر محرابیں انھوں نے قرآن مجید کی

سنائیں، مولانا کے والد مولانا فضل الرحمٰن صاحب کیرانویؒ ندوۃ العلماء کے اولین فارغین میں تھے اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ہم زمانہ تھے۔ دینی دعوتی خدمات میں قادیانیت کے خلاف ان کی کوششیں مؤثر ثابت ہوئیں اور انھوں نے ''سفر قادیان'' کے نام سے کتاب بھی تصنیف کی۔ عربی زبان وادب کی تعلیم کے لیے ''ألـمـحـاورة الـعـربية ودروس الأشيـاء ''لکھی، اس طرح ان کا فیض شاگردوں، کتابوں اور صالح اولاد کے ذریعے پھیل رہا ہے۔ (اللہ تعالیٰ قبول فرمائے)۔

اولاد میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، بڑے بیٹے مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی کناڈا میں دعوت کے کام میں مصروف ہیں، دوسرے خالد محبوب ندوی جدہ ریڈیو کی اردو سروس سے متعلق ہیں، اور تیسرے بیٹے اسعد محبوب بھوپال میں انجینئر ہیں۔

ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی کچھ کچھ مدت کے لیے اپنے والد کی خدمت میں آتے رہتے تھے، اور والد محترم کی توجہ اور دعا لیتے تھے، ان کے داماد مولوی ابوسحبان روح القدس ندوی دار العلوم ندوۃ العلماء میں استاد حدیث ہیں، اور کئی کتابوں کے مصنف اور بڑی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔

مولانا محبوب الرحمٰن صاحبؒ کی پیدائش ۱۹۱۹ء کی تھی، اس طرح شمسی اعتبار سے ۹۱ سال اور قمری لحاظ سے ۹۴ سال کی عمر پائی، ڈالی گنج لکھنؤ کے قبرستان میں مدفون ہوئے، جہاں عموماً دار العلوم ندوۃ العلماء اور ڈالی گنج وقرب وجوار کے مرحومین کے متعدد احباب مدفون ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، اور ان کے درجات کو بلند تر فرمائے، إنه هو الغفور الرحيم۔

حضرت مولانا مرنجاں مرنج طبیعت اور علمی مذاق کے حامل تھے، انہوں نے صحت جہاں تک برداشت کرتی رہی تدریسی مشغولیت کو قائم رکھا، اس کے ساتھ ہمت اور بلند حوصلگی میں بھی بڑھے ہوئے اور مرض کی صعوبتوں کو سیر چشمی سے گوارا کرتے رہے اور اپنے کو صحت مند کی صورت میں ظاہر کرتے تھے، آخری دن تک گفتگو اور باتیں صحت مند شخص کی طرح کرتے رہے، حالانکہ اندر سے طبیعت خاصی ناساز تھی، اور اس طرح وہ

دوسروں کے لیے اچھی مثال چھوڑ کر گئے، علمی ذوق کے حامل ہونے کی وجہ سے علم کی راہ میں ان کی بڑی خدمات ہیں۔

مولانا سے مجھے بھی خاصی موانست حاصل تھی، میں عملی طور پر ان کا شاگرد تو نہ ہوسکا، لیکن ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمات کے لحاظ سے مجھے معاصرت کا شرف حاصل ہوا، اور عربی زبان وادب سے مشترکہ دلچسپی کی بناء پر بھی ان سے قربت محسوس ہوتی تھی، اور اس قربت کو مجھ سے زیادہ وہ نباہتے تھے، یہ ان کی نرالی بات تھی، ان کی وفات کو میں نے خصوصی رنج کا واقعہ محسوس کیا، اور میرے دل میں ان کی برابر قدر ہے، ان کے صاحبزادگان سے میں بہت تعلق محسوس کرتا ہوں، اور ان کے لیے دعا گو ہوں۔

مولانا محمد ابراہیم ندویؒ

۱۳۷۵ھ ۱۹۵۶ء تا ۱۴۳۱ھ ۲۰۱۰ء

وکیل کلیة اللغة العربیة وآدابها واستاد دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا محمد ابراہیم ندوی ردولوی کا ۲۰ رجب ۱۴۳۱ھ مطابق ۳ جولائی ۲۰۱۰ء شنبہ کی صبح حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون، روز کے معمول کے مطابق فجر کی نماز باجماعت ادا کی، بعد فجر اساتذہ کے ساتھ چہل قدمی کی اور ندوہ کینٹین میں چائے نوشی کی، گھر واپسی پر سینہ میں تکلیف محسوس کی، اسپتال لے جائے گئے لیکن وقت موعود آچکا تھا۔

مولانا مرحوم ۱۹۵۶ء میں قصبہ ردولی ضلع فیض آباد میں پیدا ہوئے، مولانا محمد یعقوب ندوی کے فرزند تھے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلیم حاصل کی، خوش قسمتی سے وہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ بھیجے جانے والے طلباء میں منتخب ہوگئے، جامعہ کے ممتاز اور نمایاں طالب علم رہے، ۱۹۸۳ء میں فراغت کے بعد دارالافتاء ریاض سے مبعوث ہوگئے، مدنیہ منورہ سے واپسی کے بعد دارالعلوم سبیل الرشاد (بنگلور) میں کئی برس تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء آگئے، تا وفات مادر علمی میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، دارالعلوم میں مولانا سے بالعموم تفسیر، ادب وانشاء کے گھنٹے متعلق رہے، اپنی صلاحیت سے بڑے متاثر رہے یہاں تک کہ "کلیة اللغة العربیة" کے وکیل بنائے گئے، مولانا کا علم بہت پختہ، مطالعہ بہت گہرا اور ذہن بہت صاف ستھرا تھا، تکلف سے بہت دور تھے، علم نحو سے خاص سے دلچسپی تھی، ادھر کئی برسوں سے

تخصص ادب عربی کے درجات زمخشری کی ''المفصل'' اور جاحظ کی ''کتاب البخلاء'' کی تدریس مولانا ہی کے ذمہ تھی، مضمون نویسی وترجمہ نگاری کے فن پر بھی دستگاہ حاصل تھی، البعث الاسلامی اور الرائد میں ان کے مضامین وترجمے شائع ہوتے تھے، درس وتدریس کے علاوہ مولانا مرحوم طلبہ دارالعلوم کی تربیت ونگرانی میں بھی حصہ لیتے اور جو کام سپرد کیا جاتا بڑی ذمہ داری سے انجام دیتے۔

مرحوم کی نماز جنازہ اور تدفین میں ایک جم غفیر موجود تھا مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا ڈاکٹر سعیدالرحمن اعظمی ندوی نے نماز جنازہ پڑھائی۔

مولانا مرحوم کو قرآن مجید بڑا پختہ یاد تھا، نمازوں کے بعد کثرت سے تلاوت کرتے، تسبیحات ووظائف پڑھتے، انتقال سے قبل ان میں انابت ورجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، ذمہ داران دارالعلوم مولانا کی ناگہانی موت سے بڑے صدمہ سے دوچار ہوئے، حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء نے اس کو ذاتی حادثہ قرار دیا، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔

حضرت مولانا محمد اویس نگرامی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء تا ۱۳۹۵ھ ۱۹۷۶ء

ندوۃ العلماء میں سید الطائفہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے عہد میں ندوہ کے جن فارغین نے ان سے قریبی ربط رکھا، ان کو علم وادب کے سلسلہ میں اور قرآن فہمی کے سلسلہ میں سید صاحب سے بہت فیض حاصل ہوا، انہی میں ایک شخصیت حضرت مولانا محمد اویس نگرامی ندوی کی بھی ہے جن کو قرآن فہمی کا اچھا ذوق حاصل ہوا جس سے انہوں نے ندوۃ العلماء میں شیخ التفسیر کے منصب پر رہتے ہوئے طلبہ کو بہت فیض پہنچایا، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی نے ندوۃ العلماء کی طالب علمی میں جو علمی فائدہ اٹھایا اس کے ساتھ ساتھ دینی لحاظ سے بھی ان کو خصوصیت حاصل ہوئی، وہ خاندانی طور پر دعوت وارشاد کے کام کو سمجھے ہوئے اور اس کے حامل تھے، خاص طور پر ان کی جدی شاخ میں علم وفضل کی حامل اور دعوت واصلاح کا مزاج رکھنے والی متعدد اہم شخصیتیں گزریں جن میں ان کے حقیقی دادا حضرت مولانا محمد اویس نگرامی کو علم وفضل اور ورع وتقویٰ میں نمایاں مقام حاصل ہوا، ان کو اچھا قرآنی ذوق بھی حاصل تھا اور ان کی علوم شرعیہ اور ادب وتاریخ اور تذکرہ کے موضوع پر کئی اہم کتابیں بھی ہیں۔

حضرت مولانا محمد اویس نگرامی ندوی نے اپنی ان خاندانی موروثی صفات وخصوصیات کے ساتھ اپنے عصر کے بزرگان دین سے بھی استفادہ کا ربط رکھا اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے اجازت وخلافت بھی ان کو حاصل ہوئی، اور پھر اس دینی خصوصیت سے بھی انہوں نے دوسروں کو فائدہ پہنچایا اور والد اور دادا دونوں نے اصلاح

عوام اور دعوت وارشاد کا کام نگرام اور اس سے جڑے ہوئے علاقوں میں ایسے اچھے انداز سے انجام دیا کہ وہاں بڑی اصلاح ہوئی جس کے اثرات اب بھی محسوس کئے جاتے ہیں، حضرت مولانا محمد اویس نگرامی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اپنے علمی اشتغال اور تدریسی یکسوئی کے باوجود اصلاح عوام کی ان سے رابطہ قائم کرنے کے ذریعہ فکر کی اور اصلاحی دورے جاری رکھے جن سے بدعات ورسوم اور منکرات کی اصلاح کے بڑے کام ہوئے اور اس کے نتیجہ میں دینی تعلیم حاصل کرنے کا بھی لوگوں میں مزاج بنا، اور جن علاقوں کو انہوں نے اپنا میدان عمل بنایا تھا وہاں سے علماء اور داعی نکلنے لگے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ ہونے کی بنا پر ان کا قیام لکھنؤ میں ہی ہوتا تھا اور نگرام کے ملحقہ علاقوں میں لوگوں کی دینی حالت درست رکھنے میں وہ پوری توجہ کرتے تھے۔

مولانا کا علمی مطالعہ صرف اسی دائرہ میں نہیں تھا جو دائرہ ہمارے قدیم مدارس میں بنا ہوا تھا، بلکہ وہ اس دائرہ سے باہر کا مطالعہ خاص طور پر شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ اور ان کے جانشین علامہ ابن القیم کی کتابوں کا مطالعہ اور اس کے ساتھ وقت کے لحاظ سے دین سے ربط رکھنے والے موضوعات کا بھی ان کا مطالعہ تھا جو ان کے درس قرآن سے ظاہر ہوتا تھا، وہ ندوۃ العلماء میں تفسیر کا درس دینے کے ساتھ ساتھ شہر میں دینی ذوق رکھنے والے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے ہفتہ میں ایک روز درس قرآن دیتے تھے جس میں شہر کی مؤقر شخصیتیں جن میں حکومت کے اعلیٰ مسلم عہدے دار بھی شریک ہوتے تھے، اس سے ان لوگوں کی دینی ذہن سازی بھی ہوتی تھی اور یہ فیض بھی اہل شہر کو حاصل ہورہا تھا۔

نگرام کا علاقہ رائے بریلی سے قریب ہونے کی بنا پر نگرام کے بزرگوں کا ہمارے تکیہ رائے بریلی کی دینی شخصیتوں سے بھی تعلق تھا، اس بنا پر میرے ماموں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب سے مولانا کا محبانہ تعلق تھا وہ علاج بھی انہی سے کراتے اور اپنے علمی کاموں میں مشورہ بھی لیتے تھے، انہی نے ان کو امام ابن تیمیہ اور علامہ ابن القیم رحمہم اللہ کی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیا، علمی وطبی استفادہ کی بنا پر ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب اور پورے

خاندان سے وہ بہت اپنائیت رکھتے تھے جوان کے ہم لوگوں کے ساتھ معاملہ میں صورت حال جھلکتی تھی، اور وہ اس کے مطابق اسی کی بنا پر علمی مشورہ بھی دیتے تھے۔ میرے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ سے وہ نیازمندانہ تعلق رکھتے تھے اور ماموں صاحب کی ان پر بڑی نظر عنایت تھی اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا رفاقت کا تعلق اور دونوں نے ایک ہی عہد میں علمی و دینی ترقی کی تھی۔ باہم ایک دوسرے سے بڑے تعلق و محبت کا ربط رکھتے تھے اور ایک دوسرے کی دل سے بڑی قدر کرتے تھے جس کا اظہار خال معظم مولانا سید ابوالحسن حسنی ندوی نے ان کی وفات پر اپنے تاثراتی مضمون میں کیا ہے جو پرانے چراغ میں شامل ہے۔

ہم لوگوں کو بھی ان سے شاگردانہ تعلق کے ساتھ ہمارے بڑوں سے ان کے تعلق کی بنا پر بہت قریبی تعلق تھا، انہوں نے حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس دارالمصنفین میں وقت گزارا تھا اور ان کے شاگرد کی حیثیت سے فائدہ اٹھایا تھا اور ان کے علمی اور وسیع ذہنی خصوصیت کو اس قیام سے بڑی مدد ملی تھی، اور پھر ندوۃ العلماء میں ان کی تدریس اور ان کی مجالس سے طلبہ کو بہت فائدہ پہنچتا تھا، انہوں نے اس وسیع علمی صلاحیت کے استعمال سے کئی اہم کتابیں تصنیف کیں جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

آخر عمر میں وہ بیمار رہنے لگے تھے اس کی وجہ سے ان کا ادھر ادھر آنا جانا کم ہو گیا تھا، لیکن ان کا فائدہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جاری تھا، ان کے انتقال سے دارالعلوم ندوۃ العلماء ایک مؤقر علمی شخصیت سے محروم ہو گیا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ان کی مساعی کو قبول فرمائے۔ آمین

ان کو اللہ نے اولادیں بھی عطا فرمائیں جنھوں نے اپنے والد کی سرپرستی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رہ کر تعلیم حاصل کی اور پھر عصری جامعات سے بھی سندیں حاصل کیں، اور تدریس و تصنیف اور تحقیق کا راستہ اختیار کیا جو ان کے بزرگوں اور آباء و اجداد کا رہا ہے، ان میں مولوی شعیب نگرامی صاحب ندوی، مولوی محمد یونس نگرامی ندوی،

مولوی محمد یوسف نگرامی ندوی، مولوی محمد ہارون نگرامی ندوی کی تصانیف منظرِ عام پر بھی آ چکی ہیں، اور یہ سب اچھا لکھنے والے اور اچھا علمی ذوق رکھتے ہیں، اور بعض صحافت سے جڑے ہیں جن میں عارف نگرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ صاحبزادگان میں طیب نگرامی اور صہیب نگرامی بھی ہیں، طیب نگرامی انڈین کونسلیٹ میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں ان صاحبزادگان کے علاوہ دو صاحبزادیاں بھی اپنے پیچھے چھوڑیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو خاندان کی خیر و برکت عطا فرمائے، اور اس خاندانی ورثہ اور خصوصیت کو آگے بھی جاری رکھے۔ آمین

مولوی محمد غزالی ندوی

۱۳۶۶ھ ۱۹۴۴ء تا ۱۴۳۹ھ ۲۰۱۸ء

مرکز دعوت وتبلیغ بنگلہ والی مسجد حضرت نظام الدین نئی دہلی میں ایک طویل عرصے سے متعلق ومقیم رہ کر دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے والے ایک مخلص، ذی علم، ذی استعداد عالم دین و داعی جناب مولانا محمد غزالی خطیبی ندوی بھٹکلی کا انتقال ۲۳ رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ شب جمعہ گزار کر جمعہ کے دن فجر کی اذان کے وقت ہوا،

مولانا کی ولادت ۱۹۴۴ء میں بھٹکل کی ایک بزرگ شخصیت اور اس وقت کے شہر قاضی، قاضی ابوبکر خطیبی (عرف اوپا خلفو) کے گھر ہوئی، ابتدائی تعلیم میٹرک تک انجمن حامئ مسلمین ہائی اسکول بھٹکل میں حاصل کی، میٹرک میں امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کرنے کے بعد جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں داخلہ لیا، جامعہ اسلامیہ اس وقت اپنے ابتدائی دور میں تھا، وہاں کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں داخل ہوئے، آپ جامعہ اسلامیہ کے اس تین اولین طلبہ میں سے ایک ہیں جنہوں نے جامعہ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا، وہاں سے ۱۹۶۷ء میں عالمیت کی تکمیل کے بعد مختصر سا عرصہ مدراس میں ایک کمپنی میں ملازمت کرتے ہوئے گذارا، چند ماہ جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں تدریس کی خدمت بھی انجام دی۔

پھر دعوت الی اللہ کی نسبت سے مرکزِ دعوت وتبلیغ دہلی سے وابستہ ہوگئے، اور انتقال سے پوری زندگی اسی کام میں وقف کردی، دعوتی نسبت سے آپ نے مختلف مما لک

کے اسفار کیے، شروع میں حبشہ میں ایک مدت تک قیام کر کے وہاں دعوتی کام کو شروع کر کے بڑے اچھے انداز سے وہاں دعوتی مشن کو سنبھالا دیا۔

"الأسماء تنزل من السماء" کہ نام اوپر سے اترتے ہیں اور یہ کہ ناموں کا معنوں سے بھی تعلق ہوتا ہے، عزیز گرامی مولوی محمد غزالی خطیبی ندوی بھٹکلی کے سلسلہ میں بھی یہ بات ایک حد تک کہی جا سکتی ہے، ان کا نام اس عہد کے مشہور و عظیم القدر عالم و مفکر علامہ محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ کے کام سے ایک طرح سے مطابقت رکھتا ہے، یہ مطابقت ظاہری طور پر اس طرح دیکھی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اولاً علمی لائن سے اشتغال اختیار کیا تھا اور اس میں مشغول رہے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈالا کہ وہ اصلاح ودعوت کے کام میں مشغول ہوں اور اس میں انہوں نے پورا انہماک اختیار کیا، اور نام کے لحاظ سے ان کا یہ نام پانچویں صدی کے مشہور امام وجلیل القدر شخصیت امام ابو حامد الغزالی کے نام پر تھا جن کو اللہ تعالیٰ نے بڑے تجدیدی واصلاحی کام کے لیے چنا تھا، جنہوں نے علم میں رسوخ پیدا کرنے کے بعد اصلاح قلب و باطن کی طرف مکمل توجہ کی تھی، پھر اس میں اونچا مقام حاصل کیا تھا، ان کے کام کا اثر ان لوگوں میں دیکھا گیا جن کا نام ان کے نام پر ان کے بڑوں نے رکھا۔

ہمارے مولوی محمد غزالی خطیبی ندوی نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں محنت سے اور اپنے باکمال اساتذہ سے خصوصی استفادہ کے ساتھ اپنے وقت کے لکھنو کے بڑے علماء مولانا عبد الباری ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی وغیرہ کی صحبتوں سے بھی اچھا فائدہ اٹھایا تھا اور خاص طور پر مولانا علی میاں کی خصوصی شفقت حاصل کی تھی اور ان کے مشورے سے انہوں نے دعوت وتبلیغ کا میدان اختیار کر کے اس کے عالمی مرکز بنگلہ والی مسجد نظام الدین دہلی میں مستقل قیام کی صورت اختیار کی تھی اور اس کا پوری زندگی میں خیال رکھا کہ اس کے دائرہ میں رہ کر اس کے نظام کے تابع بن کر ہی زندگی گزاریں، اس کے ساتھ انہوں نے اپنے کو اصلاح واستفادہ سے مستغنی نہیں سمجھا اور اپنے لیے اصلاح باطن کی

راہ بھی اختیار کی، اور اس میں تربیت وارشاد کے مجاز بھی ہوئے، ان کا یہ عمل بڑا لائق قدر اور ان کی زندگی قابل رشک بن گئی، کہ انہوں نے اپنے دائرہ عمل میں یکسوئی وانہماک سے ذاتی طور پر بڑی ترقی کی اور نظام الدین مرکز دہلی میں وہاں کے اچھے معتمد کے طور پر کام کرتے رہے، اور پوری دیانت کے ساتھ مفوضہ امور کی انجام دہی کرتے رہے۔

باہر کے سفروں میں بھی اور حج کے اسفار میں بھی وہ شریک ہوتے اور وہاں بھی اچھے ڈھنگ اور بہتر طرز دعوت کے ساتھ کام کرتے، معلوم ہوا کہ اس سال بھی نظام الدین مرکز دہلی کے حج کے قافلے میں ان کا نام شامل تھا، اگر چہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے، لیکن ''نیۃ المؤمن خیر من عملہ'' کا فائدہ ہونا بہتر صورت میں حاصل ہوگا، پھر ان کو رمضان المبارک کی ۲۳ ویں شب جو ممکنہ شب قدر تھی اور اسی امید واحتساب میں انہوں نے ذکر وعبادت وغیرہ میں یہ رات گزاری تھی، اس رات کے اختتام پر جب کہ وہ روزے کی نیت کر چکے تھے، اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، اس طرح ان کو قابل رشک موت بھی حاصل ہوئی، جو قابل رشک زندگی گزارنے پر ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کا ان کے لیے دنیا میں تحفہ اور ان کے متعلقین واہل خانہ کے لیے تسکین وتسلی کا سامان تھا، کہ انہوں نے گھر والوں کے سامنے اس کا اظہار بھی کیا کہ دیکھو فرشتے آرہے ہیں، انہوں نے دعوت کی راہ میں جس ثبات قدمی کی زندگی ایمان وتقویٰ کے ساتھ گزاری، اس پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی ہے۔

عزیز القدر عالم ورجل صالح محمد غزالی ندوی سے مجھے واقفیت ان کے طالب علمی کے زمانے سے تھی، ان سے تعلق کی بناء پر مجھے ان کے انتقال سے صدمہ ہوا، اگر چہ وہ بڑے نیک جذبہ اور نیک حال کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے اور اپنے مالک حقیقی سے اپنی نیکیوں کی جزا حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوگئے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بڑھائے، اور اجر عظیم عطا فرمائے، اور ان کی اولاد کو ترقیات سے نوازے، جو ان کے لیے مسرت کا مزید ذریعہ بنے، اور ان کے پس ماندگان کو جو ان کے لیے اچھے اخلاف ہیں اور سبھی علم وفضل سے آراستہ اور صالح وسعید ہیں، ان کے راستے پر چلائے۔ آمین۔

ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی

۱۳۶۵ھ ۱۹۴۵ء تا ۱۴۳۶ھ ۲۰۱۵ء

ادھر مہینہ دو مہینہ کے اندر جن قریبی تعلق رکھنے والے متعدد افراد نے داغ مفارقت دیا، ان میں ایک اہم نام عزیز مکرم ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی علی گڑھی کا ہے، جنہوں نے ایک طویل علالت کے بعد اپنے مکان واقع جمال پور علی گڑھ میں ۷۰/سال کی عمر میں ۲۱/ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ موافق ۶/اکتوبر ۲۰۱۵ء کو وفات پائی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی کا اصلاً تعلق بارہ بنکی کے شیوخ خاندان سے تھا اور ان کا خاندانی سلسلہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہونچتا تھا، بارہ بنکی کے متعدد افراد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرتے چلے آرہے تھے، جس میں قرب مکانی کو بھی دخل تھا، ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی نے جس دور میں تعلیم حاصل کی وہ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کا درمیانی حصہ تھا، ان کے ساتھیوں میں امیٹھی لکھنؤ کے ڈاکٹر نوشاد ندوی اور مولانا عبدالقادر ندوی گجراتی استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہاں سے تعلیم مکمل کر کے وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے گئے جہاں انہوں نے ڈاکٹری پڑھی اور پھر پریکٹس کرنے لگے، وہ طلبہ یونین سے وابستہ رہے تھے، اس لیے رفاہی سماجی میدان میں اپنی خدمات پیش کرنے کے ساتھ سیاست کے میدان میں بھی قدم رکھا، اور چیرمینی کے الیکشن میں بطور امیدوار کے حصہ لیا، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان سے اس میدان میں نہیں بلکہ دعوتی اور تعلیمی میدان میں کام لینا تھا، وہ الیکشن نہ جیت سکے، اور سماجی خدمت کے ذریعہ لوگوں کے دل جیتنے کا کام کیا، اس طرح وہ

سماج میں ہر دلعزیز شخصیت کے طور پر ابھرے، انہیں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے بڑا گہرا تعلق تھا، اور ان سے بیعت بھی تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کی یادگار میں ایک فاؤنڈیشن اور مدرسہ کے قیام کے ذریعہ جس میں عزیزی مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی مرحوم نے ان کی اچھی رہنمائی کی تھی، دعوتی و تعلیمی کام کا آغاز کیا۔

وہ مدرسہ ایک اچھا تعلیمی ادارہ بن کر سب کے سامنے ہے، جہاں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب کے مطابق عالیہ ثالثہ شریعہ (عربی ہفتم) تک تعلیم ہوتی ہے، اور ایک سال تکمیل عالمیت کے لیے طلباء وہاں سے دارالعلوم ندوۃ العلماء آتے ہیں، اور بعض اپنی خواہش سے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے فضیلت بھی کرتے ہیں۔

فاؤنڈیشن اور مدرسہ نے ایک اصلاحی، فکری و دعوتی مجلّہ ''ندائے اعتدال'' بھی نکالا، اور فاؤنڈیشن نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی شخصیت اور افکار پر ایک بین الاقوامی سیمینار کا بھی انعقاد کیا، جس میں بلاد عربیہ، مصر و شام اور ترکی کی بھی اچھی نمائندگی ہوئی، ملک اور ملک کے باہر سے آئے ہوئے مندوبین نے فکر انگیز اور تحقیقی مقالات پیش کیے، اگرچہ راقم کی صدارت اس کانفرنس کی افتتاحی نشست میں طے تھی اور خطبہ صدارت بھی لکھ لیا تھا مگر بعض اعذار اور بیماری کی وجہ سے شرکت سے معذور رہا، خطبہ صدارت افتتاحی نشست میں پیش کیا گیا، اور اس کے ذریعہ عدم شرکت کی بڑی حد تک تلافی ہوئی، ڈاکٹر صاحب پر اپنے تعلق کی وجہ سے میری عدم شرکت کا بڑا اثر تھا، اس کی تلافی کی صورت مستقل سفر کے ذریعہ نکالی گئی اور ان کے ادارے جا کر طلبہ و اساتذہ سے خطاب کیا اور ان کے ایک پروگرام میں بھی شرکت کی جو سیرت نبویؐ اور پیام انسانیت کے عنوان سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مشہور اور وسیع کنیڈی ہال میں منعقد ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب اس پر بڑے ہی ممنون اور شکر گزار ہوئے، اسی طرح انہوں نے رابطہ ادب اسلامی کا ایک کامیاب سیمینار بھی منعقد کیا، جس میں شرکاء کی اچھی شرکت تھی اور میں بھی شریک ہوا، وہ اپنے تعلق و محبت میں چاہتے تھے کہ ان کے ہر پروگرام میں میری شرکت ہو لیکن

اسفار اور ہجوم کار کی وجہ سے یہ ممکن نہ تھا، وہ فرط تعلق میں خود آجاتے تھے اور شرکت کا تقاضہ کرتے اور اگر کوئی عذر دیکھتے تو اسی تعلق سے معذرت بھی قبول کر لیتے، ان کے کئی پروگرام ایسے ہوئے کہ انہوں نے میری جگہ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء یا مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی مرحوم کی نیابت کو قبول کیا۔

میں ان کے اس تعلق کا بڑا قدرداں رہا اور قابل عمل حد تک ان کے کام کی حوصلہ افزائی کرتا رہا اور ان کی طلب پر وہاں جانے کی کوشش بھی کرتا، وہ اپنے تعلیمی و دعوتی کاموں میں ہم سے مشورہ لیتے اور ان کی خواہش رہتی کہ ان کے اس طرح کے پروگرام میں تقویت کے طور پر شرکت کروں، بصورت دیگر وہ عزیزی مولوی عبداللہ حسنی ندویؒ سے مشورہ لیتے اور اس پر عمل کرتے، عزیزی عبداللہ حسنی کے انتقال کے بعد اسی طرح کا تعلق انہوں نے ان کے بھائی عزیزی بلال عبدالحی حسنی سے رکھا اور اپنی مشاورتی کمیٹی میں ان کو مشیر بنایا، اس طرح انہوں نے اپنے فکر و عمل میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور ان کے پسماندگان سے خصوصی ربط قائم رکھا۔

اخیر میں جب ان کی علالت کی سنگینی کا علم ہوا تو طبیعت پر بہت اثر پڑا، اور یہ تقاضا ہوا کہ علی گڑھ جا کر ان کی مزاج پرسی کریں، لیکن یہ ان کے غایت درجہ کے تعلق کی بات تھی کہ پروگرام بننے سے پہلے ہی وہ خود عازم سفر لکھنؤ ہو جاتے یہاں تک کہ دماغ کے مشکل آپریشن کے لیے معالجین نے جب رائے دی تو بھی وہ میری رائے لینے کے لیے خود سفر کر کے لکھنؤ آ گئے، اور علالت کی شدت کے باوجود انہوں نے کئی بار لکھنؤ کا سفر کیا، ابھی گذشتہ رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ میں وہ رائے بریلی آ گئے اور ایک روز قیام کر کے جس کا ان کا ۱۵، ۱۶ سال سے معمول چلا آرہا تھا، علی گڑھ واپس ہوئے، اس وقت ڈاکٹروں کی رائے معلوم ہونے کے بعد یہ ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں یہ آخری ملاقات نہ ہو، بعد میں ان کی عیادت کے لیے جو اہل تعلق گئے اور ان کے تیمارداروں اور صاحبزادہ ڈاکٹر محمد سعد صدیقی سلمہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ان کو خیریت کی فکر رہتی اور ہم لوگوں سے تعلق کا اظہار کرتے

رہتے تھے، غالباً اسی لیے ان کے گھر والوں نے ان کی جائے تدفین وغیرہ کے لیے مجھ سے رابطہ کر کے مشورہ کیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کی وصیت تھی کہ میں ان کی نماز جنازہ پڑھاؤں چوں کہ میں وقت مقررہ پر پہونچنے سے معذور تھا اور عزیزی مولوی سید سلمان حسینی ندوی کا سفر طے ہو گیا تھا، وہ وقت پر پہونچ گئے اور انھوں نے ایک بڑے مجمع کو نماز جنازہ پڑھائی اور مدرسہ کے ایک گوشہ میں تدفین عمل میں آئی، قرب وجوار سے بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے جس سے ان کی مقبولیت ومحبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اوران کے مقام کو بلند فرمائے، آمین۔

پسماندگان میں اہلیہ اور صاحبزادگان اور صاحبزادیاں ہیں، بڑے صاحبزادہ ڈاکٹر محمد سعد صدیقی ان کے کاموں کے اب ذمہ دار ہیں، اور وہ اس کے پوری طرح اہل ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی وفات سے جو خلا اور خسارہ ہوا ہے اسے پُر فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل دے، آمین۔

مولانا محمد لقمان خاں ندوی ازہری

۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء تا ۱۴۲۳ھ ۲۰۰۲ء

مولانا محمد عمران خان ندوی سابق مہتمم ندوۃ العلماء کے سب سے چھوٹے بھائی اور ندوہ کے فرزند مولانا محمد لقمان خاں ندوی جمعہ کی نماز کے لیے خطبہ کے دوران اچانک وفات پاگئے، اس طرح وہ اپنے رب کی عبادت کرتے ہوئے جوان کے لیے بڑی مبارک اور زندگی کی آخری اور سب سے اچھی گھڑی تھی، لیکن جنہیں اپنے پیچھے چھوڑ کر گئے، ان کے لیے بڑے صدمہ کی بات ہے، ان کا ہم لوگوں سے بھی بڑی محبت اور تعلق کا انداز تھا، اور وہ اس کا اہتمام رکھتے تھے کہ ندوہ اور اس کے متعلق پروگراموں میں شرکت کا اہتمام کریں، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور عالمی رابطہ ادب اسلامی سے بھی وابستگی تھی، رابطہ ادب اسلامی کے سیمیناروں میں شریک ہوتے اور اس کی کسی ایک نشست کی صدارت بھی کرتے، ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے بھی رکن ہوگئے تھے، ان کے انتقال سے ملت اسلامیہ کا جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی مشکل ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا شاگردی کا تعلق تھا، اور حدیث شریف میں ان سے بخاری شریف کے بعض ابواب بھی پڑھے تھے، اور بعد میں بیعت وارادت کا تعلق بھی قائم کرلیا تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد جامع ازہر مصر پڑھنے کے لیے گئے، پھر وہاں سے لیبیا آکر بحیثیت استاد کے خدمت انجام دی، پھر ہندوستان آگئے اور دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے مہتمم مقرر ہوئے، اور تدریسی

مصروفیت بھی رکھی، وہ اپنی مشغولیات کے باوجود اس معمول کے پابند رہے کہ رمضان المبارک اپنے استاد و شیخ مولانا علی میاں کی خدمت میں کچھ وقت گزارنے کے لیے ضرور آتے، ان کی وفات کا سانحہ ۵ جولائی بروز جمعہ مسجد شکور خاں میں پیش آیا، جہاں جمعہ کے روز وہ خطبہ دیتے تھے، ان کے بیٹوں میں ایک بیٹے حامد خاں نے دارالعلوم تاج المساجد سے تعلیم مکمل کر کے ندوۃ العلماء سے فضیلت کی تعلیم مکمل کی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔

شیخ مستنصر اللہ لکھنوی

۱۴۰۲ھ ۱۹۸۲ء

۲۵/جنوری ۱۹۸۲ء مطابق ۲۹/ربیع الاول ۱۴۰۲ھ کو شیخ مستنصر اللہ صاحب نے لکھنؤ میں وفات پائی، وہ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن اور شہر لکھنؤ کے ایک صاحب وجاہت وصاحب دین شخص تھے، وہ ادھر آخر میں کچھ دنوں سے اپنی علالت اور ضعف پیری کی وجہ سے مجلس انتظامی میں شرکت نہیں فرمار ہے تھے، ورنہ جب تک ان کے قویٰ مضبوط تھے بڑے اہتمام وپابندی سے جلسۂ انتظامی میں شریک ہوتے اور ان کے مشورے بڑے صائب ہوتے تھے، وہ جس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے لکھنؤ میں اس طبقہ کے عمائدین میں خواجہ شمس الدین، منشی اکرام علی، ڈاکٹر فریدی، سید اصغر حسین، سید مصباح الدین نقوی وغیرہ تھے۔

شیخ مستنصر اللہ صاحب مرحوم بڑی اعلیٰ دینی صفات وخصوصیات کے حامل اور مسلمانوں کے مسائل سے گہری دلچسپی رکھنے والے انسان تھے، شیخ صاحب کا مسلمانوں کے مسائل سے بڑا گہرا تعلق تھا وہ ملکی پیمانے کے ہوں یا بین الاقوامی ہوں، جس وقت فلسطین کا وفد شیخ علی طنطاوی اور امجد الزہاوی کی معیت میں آیا تھا تو شیخ صاحب ہی ان کے میزبان بنے تھے، اور اس میں بڑی تندہی سے حصہ لیا تھا اور فلسطین پر جو کانفرنس شام میں منعقد ہوئی تھی اس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نمائندہ کی حیثیت سے شیخ صاحب نے بھی ہندوستان کی نمائندگی کی تھی، شیخ صاحب علماء کے بڑے قدر دان تھے اور ان کی میزبانی اپنے لئے سعادت سمجھتے تھے، شیخ صاحب پر تعلیم نسواں کا جب غلبہ ہوا تو اہل

ندوہ سے انہوں نے درخواست کی کہ وہ طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ طالبات کی تعلیم کا بھی ایک شعبہ قائم کرے۔ ندوہ نے اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے معذوری ظاہر کردی مگر شیخ صاحب نے اس تشنگی کی تکمیل کے لیے اپنے مصارف سے تعلیم نسواں پر ایک مدرسہ قائم کیا اور عصری و دینی تعلیم کا انتظام کیا، اس میں تدریس کا کام بہت اعلیٰ معیار سے ہوتا رہا ہے اور اس کا اندازہ مدرسہ کی امتحانی کاپیوں سے ہوتا ہے جو ہم لوگوں کو تعلق کی وجہ سے ملتی ہیں، اور طالبات کا معیار تعلیم بہتر معلوم ہوتا ہے، شیخ صاحب نے اس مدرسہ کے اخراجات کے لئے ایک جائداد وقف کردی اور اس کے اخراجات اسی جائداد سے پورے کئے جاتے ہیں، اس کی نگرانی کی ذمہ داری بیگم شیخ کرتی ہیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کار خیر کے ذریعہ انہی کے ہاتھوں صدقۂ جاریہ فرمادیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو پورا پورا اجر وثواب عطا فرمائے۔

جناب نصار رفیع صاحب مرحوم

۱۳۵۳ھ ۱۹۳۴ء تا ۱۴۳۷ھ ۲۰۱۵ء

نصار رفیع صاحب کی خبر وفات سے لکھنو کے علمی وادبی حلقہ میں بڑا تاثر ہوا، وہ لکھنو کے علمی ادبی حکیمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جس کے متعدد افراد نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی، جن میں مولانا قاری ودود الحی صاحب، مولانا وصی مظہر ندوی اور مولانا علی احمد کیانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نصار رفیع صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کی ایک مدت پوری کر کے مکہ معظّمہ چلے گئے تھے، جہاں مدرسہ صولتیہ میں انہوں نے تعلیم مکمل کی، اور پھر جدہ ریڈیو کے مشرق السنہ کے ایڈیٹر ہوئے، اور جدہ ریڈیو کے اردو فارسی سیکشن میں ان کی خدمات عرصہ تک بڑی نمایاں رہی، انہوں نے اپنے زمانہ طالب علمی سے ہی تقریر وتحریر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ حصہ لینا شروع کر دیا تھا، انہوں نے اوران کے ساتھیوں نے ایک انجمن اس کے لیے بنائی تھی، جس میں وہ پابندی کے ساتھ شرکت کرتے اور نمایاں نظر آتے تھے۔ آزادئ ہند کے متصل بعد وہ طالب علمانہ پوزیشن کے باوجود اصلاح عوام کا جذبہ رکھتے تھے، اوراس کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے، اوراپنے شوق کے مطابق اپنے ہم عمروں کو جمع کر کے اپنی صلاحیت کے مطابق تقریر کرتے، اردو زبان وادب سے بھی دلچسپی تھی، اور یہ ان کی ہمت کی بات تھی کہ سن ۱۹۵۱ء میں جب کہ باہری سفروں کی دشواریاں تھی، اور تمدنی ترقی نہیں ہوئی تھی اپنی تعلیم کو مزید جاری رکھنے کے لیے مکہ مکرمہ گئے، اور پھر وہیں کے ہو گئے۔

اسی زمانہ سے ان کا مجھ سے اور میرے عزیزوں سے اچھا تعلق تھا، ان کے بڑے بھائی حکیم افتخار صاحب نے علم طب میں خصوصیت حاصل کی، وہ ہمارے ندوہ کے ساتھیوں میں تھے، اور دوسرے بھائی بھی بالکل عزیزانہ تعلق مجھ سے رکھتے رہے ہیں، نصار رفیع صاحب کا تعلق ہمارے ندوہ کے ممتاز فرد مولانا عبدالباری ندوی کے ساتھ بہت گہرا ہوگیا تھا، جہاں ان کے گھر کے بعض افراد کا رشتہ بھی ہوا، اور ان میں احمد الباری صاحب ان کے یہاں جدہ کے سفر میں ساتھ قیام بھی فرماتے تھے، گذشتہ سفر حجاز میں ان کی عیادت اور ملاقات کا موقع ملا تھا، اس سے پرانی یادیں تازہ ہوئی تھیں، ایک دن پہلے ایک دوسرے ممتاز ندوی فاضل مولانا شاہ شبیر عطا ندوی ابن مولانا شاہ حلیم عطا صاحب کے حادثہ وفات سے متاثر ہوئے تھے، ایک دن کے بعد یہ دوسری رنجدہ خبر ملی، وہ بھی نصار رفیع صاحب کے ہی جماعت کے فرد اور ان کے ہی ساتھیوں میں ایک ہونہار ساتھی تھے، اس طرح ایک ہی وقت میں ان دو قریبی حادثوں سے گذرنا پڑا، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ عفو و کرم کا معاملہ فرمائے، اور رفع درجات فرمائے۔

مولوی وجیہ الدین ندوی مرحوم

۱۳۵۱ھ ۱۹۳۲ء تا ۱۳۹۸ھ ۱۹۷۸ء

ہم لوگوں کے لیے یہ بات سخت صدمہ کا باعث ہوئی کہ ۲۱/۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۸ء سنیچر اتوار کی درمیانی رات کو عزیز مکرم مولوی وجیہ الدین ندوی انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ ایک عرصہ سے بیمار چل رہے تھے اور ان کا قیام دار العلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں تھا ان کی نماز جنازہ صبح آٹھ بجے مولانا مفتی محمد ظہور ندوی صاحب نے پڑھائی اور پھر ان کا جنازہ ان کے وطن اسہی اعظم پور ضلع ہردوئی لے جایا گیا اور وہاں تدفین عمل میں آئی۔

مولوی وجیہ الدین مرحوم سندیلہ کے قریب اسہی کے رہنے والے تھے، جہاں وہ خاندان آباد ہے جو اپنا نسبی تعلق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جوڑتے ہیں، مولوی وجیہ الدین ندوی کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا۔ مولانا وجیہ الدین ندوی مرحوم جس درجہ میں پڑھتے تھے اس کا ہم سے بھی تعلق تھا اور اس درجہ کے ان کے اور ساتھی بھی ہم سے تعلق رکھتے تھے جن میں مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی صاحب بین الاقوامی شہرت کے حامل ہوئے اور پروفیسر احتشام احمد ندوی نے بھی اونچا علمی مقام حاصل کیا، اور ہمارے عزیزوں میں مولوی سید احمد علی ندوی مرحوم بھی ان کے ساتھیوں میں تھے، اس طرح ان کا پورا درجہ ہمیں بڑا عزیز رہا، اور مولوی وجیہ الدین نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں پڑھایا بھی اور اسی شغل کے ساتھ وہ رخصت بھی ہوئے، اس لیے ان کے سانحۂ وفات کا اثر ہم سب پر پڑا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کی خدمات کو قبول فرمائے، آمین۔

خانوادهٔ علم اللهی

استاذ سید احمد الحسنی

۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء تا ۱۴۱۰ھ ۱۹۸۹ء

فضیلۃ الشیخ سید احمد الحسنی (۱) لاہور پاکستان میں ۱۶/ جمادی الاولی ۱۴۱۰ھ کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، مولانا سید احمد الحسنی کا تعلق امیر المومنین مجاہد کبیر حضرت سید

---

(۱) احمد الحسنی مرحوم کی تعلیم وتربیت لکھنؤ میں ہوئی، مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء کی نگرانی وسرپرستی ملی، شیخ خلیل عرب یمانی (استاذ لکھنؤ یونیورسٹی) سے عربی زبان وادب میں استفادہ کا موقع ملا، جس سے انہوں نے فائدہ اٹھایا، نامور عرب فاضل شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی جو ندوۃ العلماء میں صدر شعبۂ عربی کے عہدہ پر فائز تھے سے بھی استفادہ کیا، صرف ونحو کی تعلیم انھیں فاضل ماموں مولانا سید طلحہ سے حاصل ہو چکی تھی، مگر عربی زبان پر قدرت وروانی ہلالی صاحب کے زیر سایہ ہوئی، اور اس سلسلہ میں انہوں نے وہ طلاقت لسانی پیدا کر لی جو ہندوستان کے برصغیر میں چند ہی کو حاصل ہوئی، پھر دار العلوم ندوۃ العلماء نے عربی زبان کی تدریس کے لئے ان کی خدمات حاصل کیں، اس کے بعد وہ مزید تعلیم حاصل کرنے لاہور گئے وہاں بھی ان کا جادو چلا اور ایک موقع پر برسر عام وقت کے نامور ادیب وخطیب اور قائد مولانا ظفر علی خاں مدیر ''زمیندار'' نے ان کی مہارت لسانی اور قدرت بیانی کی داد دی۔

۳۱-۱۹۳۲ء میں جب مولانا سید ابو الحسن علی ندوی لاہور میں حضرت مولانا احمد علی صاحب سے تفسیر قرآن کا درس لے رہے تھے تو سید احمد الحسنیؒ بھی شریک درس تھے، انگریزی زبان میں انہیں ایسی لیاقت تھی کہ شملہ ریڈیو اسٹیشن پر عربی تقریروں اور ممالک عربیہ کے ریڈیو اسٹیشن کے ضروری اقتباسات انگریزی میں پیش کرتے یہ دیکھ کر کچھ انگریزوں نے ان سے عربی پڑھنا شروع کی، اسی زمانہ میں ۱۹۴۳ء میں ان کا دہلی آنا ہوا تو وہ مولانا علی میاں کے ساتھ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت کی شفقت وعنایت حاصل کی، اور وہیں حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے ملاقات کی اور ان کی دعائیں لیں، ان حضرات نے حضرت سید صاحب کی نسبت کی وجہ سے احترام واکرام کا معاملہ بھی کیا۔

احمد شہیدؒ سے خاندانی طور پر موجودہ لوگوں میں سب سے مضبوط تھا، ان کے حقیقی دادا سید محمد اسحاق حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی نواسہ اور ان کے مربی بھائی مولانا سید محمد اسحاق حسنی تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے پوتے تھے، اس نسبت کا جوان کو حضرت سید احمد شہید سے حاصل تھی، سبھی لوگ بڑا لحاظ کرتے اور اسی نسبت سے حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کے ساتھ بڑی خصوصیت و امتیاز کا معاملہ روا رکھا تھا، اور تکریم فرمائی تھی جب وہ ان کی خدمت میں اپنے خاندانی بھائی اور درسی ساتھی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ مرکز نظام الدین دہلی میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، خود ہمارے خاندان کی دادیہالی و نانیہالی دونوں شاخوں میں حضرت سید احمد شہید کی نسبت کا بڑا خیال و لحاظ پایا جاتا تھا اس وجہ سے مولانا سید احمد الحسنی رحمہ اللہ کو خاندان میں محبت و عزت کی نگاہ سے ہمیشہ دیکھا جاتا رہا، اور عربی میں لیاقت و صلاحیت میں بھی وہ نمایاں مقام رکھتے تھے، ان پر ان کے ماموں مولانا سید طلحہ حسنی ٹونکی کی بڑی توجہ و عنایت رہی تھی جس سے انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور ترقی کی، ان کے یہ ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے پھوپھا تھے، اور دونوں کے ہی عربی سیکھنے کے ذرائع مشترک تھے اور مرکز عقیدت و محبت بھی مشترک تھا، اس کے ساتھ علمی و ادبی ذوق اور فکر و مزاج میں قربت نے اخوت کے ساتھ دوستی بھی پیدا کردی تھی اور دونوں میں یہ جو تعلق قائم ہوا وہ آخر تک قائم رہا، باوجود یہ کہ دونوں کا میدان عمل مشترک نہ رہ سکا، اور مولانا سید احمد الحسنی کو سرکاری ملازمت مل گئی جس سے انہوں نے تقسیم ملک سے پہلے ہندوستان کے لئے اور تقسیم ملک کے بعد پاکستان کے لئے خدمات پیش کیں، اور پاکستان میں ان کو یہ ترقی بھی ملی کہ

= پاکستان منتقل ہونے کے بعد ۱۹۵۷ء میں انہیں پاکستانی سفیر کے ہمراہ ان کے ترجمان کی حیثیت سے شاہ فیصل شہید سے ملنے کا موقع ملا، اپریل ۱۹۶۶ء میں صدر پاکستان ایوب خاں کے ترجمان کی حیثیت سے شاہ شہید سے ان کے دورۂ پاکستان کے موقع پر پھر ملاقات کی، اور متعدد پروگراموں میں وہی ترجمانی کرتے رہے، بڑے جلسوں میں شاہ شہید کی اردو میں ترجمانی کرتے، شاہ شہید نے ان کی لیاقت و صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی خدمت میں ہدیہ بھی پیش کیا۔

صدر پاکستان نے عرب ممالک کے بعض دوروں میں بھی ترجمانی کے لئے ان کو ساتھ لیا، اور بعض عرب ممالک میں پاکستان کے سفارت خانہ میں بھی ملحق ثقافی کے طور پر وہ عہدے دار رہے، اور اخیر میں پاکستان میں سعودی سفارت خانہ کے مکتب تعلیمی میں رہ کر اپنی خدمات پیش کیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان کی عربی لیاقت وصلاحیت کے بڑے قدرداں تھے اور اس کو موہبت سے تعبیر کرتے تھے، اس کے ساتھ وہ ان کے اخلاق کریمانہ، خاندانی شرافت اور انسانی دوستی کی بھی تعریف کرتے اس لئے انہوں نے اس حادثہ کو اپنا بڑا خاندانی حادثہ خیال کیا اور چونکہ ایک روز قبل ۱۵ / جمای الاولی کو انہیں اپنے عظیم خانگی حادثہ اہلیہ صاحبہ کی وفات کے صدمہ سے گزرنا پڑا تھا اس حادثہ نے ان کو دوہرے صدمہ سے گزارا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور آخرت میں مقام بلند فرمائے، آمین۔

یہ تین بھائی ہیں اور تینوں کے نام ان کے اپنے اجداد پر ہیں، سید احمد الحسنی، سید اسحاق حسنی، سید ابراہیم حسنی اس فرق کے ساتھ کہ ان میں سید احمد حسنی مرحوم اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں اور ان میں حضرت سید احمد شہیدؒ سب سے چھوٹے تھے ان سے بڑے مولانا سید اسحاق اور ان سے بڑے سید ابراہیم تھے۔

مولوی سید احمد علی حسنی ندوی ٹونکی

۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء تا ۱۴۳۴ھ ۲۰۱۱ء

مولوی سید احمد علی خاندان حسنی علم اللہی کی اس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جس کے اجداد میں امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے عالی مرتبت بھانجے تھے، ان کے یہ عالی مرتبت بھانجے مولوی سید احمد علی شہید حضرت سید صاحب سے عمر میں تو بڑے تھے لیکن طریقہ دین میں ان کے تابعدار تھے، اور ان کو بڑے محبوب تھے اور جہادی سرگرمیوں میں ان کے دست راست تھے اور اس میں ان کا ساتھ دیتے ہوئے ایک معرکہ میں بڑی جوانمردی سے شہید ہوئے (۱)، ہمارے مولوی احمد علی ان ہی کی اولاد میں تھے، اس نسبت

(۱) مولوی سید احمد علی مولوی عبد السبحان کے دوسرے صاحبزادہ تھے، ۱۱۹۸ھ میں نصیر آباد میں پیدا ہوئے، اور حضرت سید احمد شہیدؒ کا دامن تھاما، ان کے مرید ہوئے اور شب و روز ان کی خدمت میں رہنے لگے، اور ان سے سلوک کی تربیت حاصل کی، حضرت سید احمد شہیدؒ کی صحبت نے ان کو مرد باخدا اور مجاہد سر بکف بنا دیا۔ بڑے نیک ذی استعداد عالم اور صاحب رعب و وقار تھے، ابتدائے عمر میں لکھنؤ میں ملازم تھے، حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ مع اہل وعیال کے حج کیا، جب حضرت سید صاحب ہجرت کرنے لگے تو یہ بعض مشغولیتوں کی بنا پر ساتھ نہ ہو سکے بعد میں جا کر مل گئے اور جنگ امب میں سپہ سالار رہے، امب فتح کرنے کے بعد ہزارہ میں پیش قدمی کا فیصلہ ہوا تو انہوں نے امیر لشکر ہونے کی پیش کش کی، تو سید احمد شہیدؒ نے اجازت دے دی اپنی سواری کا گھوڑا ان کے سپرد کیا، سید احمد علی جوش جہاد اور شوق شہادت میں سید صاحب سے رخصت ہوئے اور لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر کے دریا پار کیا اور شاہ کوٹ پہونچے اس پر قبضہ کرتے ہوئے پھولڑہ میں داخل ہو گئے۔ تیسرے دن صبح کی اذان ہوئی، مجاہدین نماز کی تیاری میں لگے تھے کہ دشمن کا حملہ ہو گیا، سید احمد علی دعا کر کے آگے بڑھے اور مقابلہ کرنے لگے آخر نیزوں، تلواروں اور گولیوں کے زخموں سے چور ہو کر گر گئے اور اسی حالت میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی، ان کے بیشمار زخم آئے تھے لیکن سارے زخم جسم کے اگلے حصہ پر تھے پچھلے حصہ میں خراش تک نہیں آئی تھی۔=

سے مولوی احمد علی مرحوم میں متعدد خوبیاں آئی تھیں، حضرت سید احمد شہیدؒ ہجرت کر کے اپنے افراد خاندان کے ساتھ جہاد کے لیے پشاور کی طرف گئے تھے، تو ان کی شہادت کے بعد والی ریاست ٹونک نواب وزیرالدولہ کے اصرار اور تقاضے پر حضرت سید صاحب کے پس ماندگان ٹونک (۱) منتقل ہو گئے تھے۔

مولوی احمد علی مرحوم ٹونک میں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے اور تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مکمل کی، عالمیت کے بعد اختصاص فی الفقہ فضیلت میں کیا اور دینی علوم کے ساتھ عصری مضامین کی بھی تحصیل کی، اس کی بنا پر ان کو ایک حکومتی شعبے میں ملازمت مل گئی تھی، جس کو انھوں نے دیانت داری کے ساتھ انجام دیا، پھر اپنے ایک عزیز سید ابراہیم حسنی کے تعلق سے کویت منتقل ہو گئے، وہاں دینی مناسبت سے ان کو خدمت کرنے کی ملازمت مل گئی، اور

= قاصد نے حضرت سید احمد شہیدؒ کو شہادت کی خبر سنائی، محبوب بھانجے کی شہادت کی خبر سن کر آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہوئے فرمایا الحمدللہ وہ جو مراد لے کر آئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی مراد تک پہونچایا، اور جب قاصد نے عرض کیا کہ شمشیر و نیزے کے سارے زخم چہرے پر آئے تو پھر آنسو جاری ہو گئے، آپ الحمدللہ الحمدللہ کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔

(۱) سانحہ بالاکوٹ کے بعد حضرت امیر المؤمنینؒ کی اہلیہ نے سندھ جانے کا فیصلہ کیا تھا، اس لیے اس وقت کے شیخ المجاہدین شیخ ولی محمد پھلتی کی تمام تر توجہ ان کو سندھ میں حضرت امیر المؤمنین کے اہل وعیال کے پاس پہونچانے پر مرکوز تھی، لیکن بڑی کوششوں کے بعد بھی کوئی تدبیر نہ بن سکی، اور کئی سال مختلف مقامات پر گزر گئے، بالآخر ۱۲۵۳ء مطابق ۱۸۳۷ء اکتوبر کو شیخ ولی محمد پھلتی ان کو لے کر پیر کوٹ، سندھ پہونچانے کے لیے روانہ ہوئے، جہاں حضرت امیر المؤمنین کے اہل وعیال موجود تھے، اس کے بعد نواب وزیرالدولہ نے ازواج و متعلقین کو ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء میں سندھ سے ٹونک بلا لیا، اور ہر ایک کے گذارہ کے لیے تنخواہیں یا جاگیریں مقرر کر دیں، ایک زمانے تک اس خاندان کے لوگ اور دوسرے مجاہدین کے اہل وعیال اور بقیہ مجاہدین جو اس سانحہ کے بعد ہندوستان واپس آ گئے تھے وہ ٹونک میں مقیم رہے، اور وہاں انھوں نے دینی ودعوتی کام کا بیڑا اٹھائے رکھا، نواب وزیرالدولہ مرحوم نے حضرت امیر المؤمنین کے اہل تعلق وخدام ومتوسلین کو جمع کر کے مسجد قافلہ میں حضرت امیر المجاہدین کی عظیم الشان سوانح ''وقائع احمدی'' کے نام سے مرتب کی، انہی اہل عزیمت رفقاء ومتوسلین واہل خانہ امیر المؤمنین کے لیے وہ علاقہ رہنے کے لیے دیا جہاں حضرت سید احمد شہید کا قافلہ ہجرت کے سفر میں ٹھہرا تھا، پھر بعد میں وہ محلّہ قافلہ کے نام سے موسوم ہوا۔

وہاں انہوں نے ایک عرصہ گزارا، ان کے عزیز سید ابراہیم حسنی سید احمد علی کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے اور پہلے سے کویت میں خدمت انجام دے رہے تھے اس طریقہ سے وہاں ایک طرح کا ان کے لیے خاندانی ماحول میسر آ گیا، اور کئی سال وہاں رہ کر وہ وطن واپس آ گئے، اور یہاں رائے بریلی ہی میں دارعرفات جس کو ایک اچھے منتظم کی ضرورت تھی، اس میں ان کو بحیثیت مدیر کے ذمہ داری مل گئی، اس ذمہ داری کو انہوں نے بڑی دلجمعی اور توجہ سے انجام دیا، اور انتظام کے ساتھ ساتھ علمی شعبہ میں بھی بڑا حصہ لیا اور متعدد عربی اور اردو کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کیا، جس کی دعوتی اور اصلاحی تعلق سے بڑی ضرورت بھی تھی، اس میں خصوصیت سے خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب قصص النبیین قابل ذکر ہے، جس کے ہزاروں کی تعداد میں کئی ایڈیشن نکلے اور متعدد غیر مسلموں کو ایمان بھی نصیب ہوا۔

انہوں نے قرآن مجید کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا، یہ ان کے لیے سعادت وشرف کی بات تھی، وہ اپنی گزشتہ ملازمتوں کی بنا پر نظم وضبط اور انتظام کی اچھی صلاحیت پیدا کر چکے تھے، اس کی بنا پر دارعرفات جو کہ ایک دعوتی، علمی ودینی ادارہ ہے، اس کو بڑی تقویت حاصل ہوئی، انہوں نے اس کی مالی حالت کو درست کرنے میں بھی حصہ لیا، اور اس کو ترقی دی۔ اور جب اس کا سہ ماہی ترجمان "تعمیر افکار" نکلنا شروع ہوا تو اس کی ذمہ داری بھی انہوں نے لی، اور اس کے وہ آخر تک مدیر رہے جس کے دو نمبر رحمۃ للعالمین نمبر اور پھر حج نمبر بھی نکالے جو ان کی ادارت کی یادگار ہیں۔ رابطۂ ادب اسلامی کے کئی سیمناروں میں بھی انہوں نے اپنے قلمی تعاون کے ساتھ شرکت کی اور ان کے یہ مقالات کاروان ادب میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔

مولوی سید احمد علی ندوی مرحوم کہ جن کو ہم اب تک عزیزی کہتے رہے اب مرحوم کہنا پڑ رہا ہے، ندوہ کے تعلق سے اور خاندانی رشتہ سے خصوصی ربط تھا، اور متعدد اہم معاملات میں ان کے مشورے سے فائدہ حاصل ہوتا تھا، وہ بڑے خوش مزاج، بااخلاق اور فہم وفراست کے ساتھ حوصلہ مند انسان تھے، خاندانی تعلق میں ان کے اس رشتہ سے بھی اضافہ ہو گیا تھا کہ ان کا عقد میری پھوپھی زاد بھتیجی سے ہوا جو دوسرے رشتہ سے میری ماموں

زاد بھانجی بھی تھیں یعنی میرے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کی نواسی اور ان سے نسبت سے اپنی نسل میں سب سے بڑی اور بڑی خصوصیات کی خاتون تھیں، انہوں نے اس عقد کو تعلق اور اچھے طریقے سے نباہا، اور ان کی یہ اہلیہ صاحبہ آخر میں ایک ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہوگئی تھیں، انہوں نے ان کے علاج اور تیمارداری میں غیر معمولی طریقہ سے فکرمندی اور کوشش کا ثبوت دیا، یہ عرصہ بارہ سال کا تھا، ان کے انتقال کے بعد ان کی طبیعت خاصی افسردہ ہوگئی تھی، جس کا وہ کبھی کبھی اظہار بھی کردیتے پھر کچھ مدت کے بعد ان کو ایک حادثہ پیش آیا، وہ تراویح پڑھ کر مسجد سے گھر آنے کی تیاری کر رہے تھے کہ پاؤں پھسل گیا اور فریکچر ہوگیا، جس سے ان کو جسمانی معذوری سے بھی گزرنا پڑا اور آخر میں پھیپھڑے کے پرانے مرض کے عود کرآنے کے نتیجہ میں تقریباً پچھتر سال کی عمر پوری کرکے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

اللہ نے ان کو حج بیت اللہ کی سعادت بھی عطا فرمائی تھی، اور ایک حج میں ان کے ساتھ ان کی اہلیہ بھی تھیں، انتقال سے ایک سال پہلے ان کو زیارت بیت اللہ کا شوق اس قدر ہوا کہ انہوں نے اس کے لیے باوجود معذوری کے سفر کیا اور اپنی اہلیہ کے بھتیجہ عزیزی سید منصور حسن سلمہ کو ساتھ لے کر عمرہ کا یہ سفر کیا اور بہت خوش خوش واپس ہوئے، اس کے بعد انہوں نے ایک سفر اپنے وطن ٹونک کا کیا جہاں امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد ان کے مہاجر و مجاہد افراد خاندان نے طرح ڈالی تھی اور اپنی والدہ مرحومہ کی قبر پر حاضری دی جس کی انہیں بڑی بے چینی تھی اور یہ سفر انہوں نے اپنے اعزہ کے ساتھ بذریعہ روڈ کیا، پھر ان کی طبیعت کمزور ہوتی گئی یہاں تک کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور اپنا قرب خاص عطا کرے۔

سید ابراہیم حسنی مرحوم

۱۳۵۳ھ ۱۹۳۴ء تا ۱۴۳۵ھ ۲۰۱۴ء

عزیزی سید ابراہیم حسنی مرحوم خاندان کے ایک مخیّر اور کارپرداز شخصیت کے حامل تھے، ان کا بچپنے کا دور لکھنؤ میں گذرا، اور محمد علی لین پر خاندان کے بڑوں حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ اور حضرت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی قیام گاہ سے ہی متصل قیام کی بنا پر ان کی سرپرستی اور اپنے ہم عمر عزیزوں سے خصوصی ربط رہا، وہ اسی خاندان کے فرد تھے، ہمارا اور ان کا خاندان اوپر جاکر مل جاتا ہے، میرے جد اعلیٰ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ اور ان کے جد اعلیٰ شاہ سید داؤد حقیقی بھائی تھے، اور ہمارے نانیہالی خاندان سے ان کے نانیہالی خاندان کا تعلق بھی قریبی تھا، ان کی والدہ حضرت مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادیؒ کی پوتی تھیں، اس رشتہ سے وہ ہمارے نانا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کی پھوپھی زاد بہن ہوتی تھیں، اس رشتہ کا ہمارے دونوں ماموں بڑا لحاظ رکھتے تھے، ایک ہی جگہ مقیم ہونے کی بناء پر اپنے تعلیمی زمانہ میں خاندان کے اپنے ان ہم عمروں کیساتھ ان کی رفاقت رہی، تعلیم مکمل کرنے سے پہلے وہ اپنے حالات کے تقاضوں سے ممبئی منتقل ہو گئے اور وہاں سے ان کو کویت جانے کا موقع مل گیا، وہاں ان کو ایک اچھی ملازمت مل گئی، جس کی بنا پر ان کا مستقل قیام کویت میں ہو گیا، اور وہاں انہوں نے جو فائدہ اٹھایا اس سے انہوں نے اپنے خاندان کے افراد کو بھی فائدہ پہونچایا، اور اپنے وطن رائے بریلی میں خیر کے کاموں میں بھی بڑا حصہ لیا، اس طریقہ سے وہ اپنے معاصروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے، ان

کے والد حاجی محمد الیاس مرحوم اور ان کے دادا حکیم سید محمد اسحاق مرحوم دین سے عملی طور پر بڑا تعلق رکھتے تھے، ان کے دادا حکیم سید محمد اسحاقؒ کا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) سے خاندانی ودوستانہ تعلق تھا اور یہ دونوں گنج مرادآباد جاکر حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت بھی ہوئے، ان خاندانی خصوصیات کا اثر عزیزی ابراہیم مرحوم کے مزاج وطبیعت پر پڑا تھا، اور اس کے اثرات عزیزی ابراہیم کے معاملات پر بھی نظر آتے تھے، اور وہ اسی کے ساتھ قوی ہمت اور محنت کا مزاج رکھتے تھے، عمر کی قربت کی بناء پر میرے چھوٹے بھائی واضح رشید ندوی اور محمد میاں مرحوم (فرزند مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی مرحوم) کے ہم عمر ہونے کی وجہ سے زیادہ بے تکلفی تھی۔

مجھ سے وہ چھوٹے تھے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اپنے زمانۂ طالبعلمی میں شاگردی کا تعلق بھی رہا تھا، اس لیے ان سے واقفیت اور تعلق قریبی رہا، اور جب کویت جانا ہوا تو ان کا گھر گویا اپنا گھر ہوتا، اور ندوہ سے بھی کوئی کویت جاتا تو ان سے ربط وتعلق کا معاملہ رہتا۔

وہ بڑی فراخ دلی سے میزبان کے طور پر اپنے مہمانوں کے ساتھ خاص طور سے ندوہ، لکھنؤ اور رائے بریلی والوں کے ساتھ پیش آتے، اور سبھی کی قدر کرتے اور معاون بنتے، ان کا ایک خاص وصف صلہ رحمی بھی تھا اور والدین کی خدمت جس سعادت مندی اور فراخدلی سے کی اس سے انہوں نے اپنے والدین کی خوب دعائیں لیں، یوں بھی وہ خیر کے کاموں میں خاموشی کے ساتھ حصہ لیتے رہتے تھے، وہ اپنے چار بھائیوں میں تیسرے تھے، ان کے بڑے بھائی ادریس حسنی مرحوم میرے ہم عمر تھے، ان سے چھوٹے اسماعیل مرحوم تھے، پھر ابراہیم مرحوم ہوئے اور سب سے چھوٹے عزیزی اویس سلمہ ہیں جو کانپور میں مقیم ہیں، اور کچھ مدت کویت میں بھی ان کے ساتھ رہے، ابراہیم مرحوم جس طرح والدین کے بڑے مطیع وفرمانبردار رہے، بڑے بھائیوں کا بڑا لحاظ کرنے والے اور چھوٹوں پر شفیق اور بہت حسن سلوک کرنے والے رہے، ان کی شادی حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے سید احمد علی شہیدؒ سے خاندانی نسبت رکھنے والی خاتون سیدہ حفصہ مرحومہ

سے ہوئی، جو ہمارے مولوی احمد علی حسنی ندوی مرحوم کی بہن تھیں، ابراہیم مرحوم نے ان کی وفات کا بھی صدمہ اٹھایا، اور اپنی بڑی بیٹی سیدہ فاطمہ مرحومہ کی وفات کا بھی صدمہ اٹھایا، اور بڑے صبر ورضا کی کیفیت کے ساتھ اس کو برداشت کیا، وہ خود بھی بیمار رہتے تھے لیکن بیماری کو سوار نہیں کرتے تھے اور اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے، ادھر دو تین سال سے وہ زیادہ بیمار رہنے لگے تھے۔

ایک سال قبل وہ باقاعدہ کویت سے ہندوستان مستقلاً منتقل ہو گئے تھے، اگرچہ ان کا کاروبار کویت میں تھا جس کو ان کے بیٹے سید محمد یوسف حسنی سلمہ جو کہ اولاد میں تین بہنوں کے بشمول تنہا بیٹے ہیں، دیکھتے ہیں، وہ بڑے ہو کر وہاں ان کی نیابت کرنے لگے تھے جس سے ان کی مشغولیت کم ہو گئی تھی اور اطمینان ہو گیا تھا، انہیں اپنی زندگی کے آخری ایام اپنے وطن رائے بریلی میں گزارنے کی زیادہ خواہش تھی، وہ بہ اصرار دہلی سے رائے بریلی آئے بھی تھے، ماہ رمضان المبارک گزار کر عید کے بعد ان کی طبیعت پھر خراب ہوئی اور کچھ ایام لکھنؤ میں ایک اسپتال میں گزار کر دہلی لے جائے گئے، جہاں ان کے تین داماد عزیزان جاوید فریدی، احمد کمال فریدی، زید فریدی اور بیٹیاں اور نواسے نواسیاں ہیں، اس طرح وہ ان کے درمیان رہ کر تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں جدا ہوئے، بدھ یکم جنوری ۲۰۱۴ء ۲۸ صفر ۱۴۳۵ھ کو یہ سانحہ پیش آیا۔

سید ابراہیم مرحوم بڑے ملنسار، خوش اخلاق صفت کے شخص تھے، اس لیے ان کے انتقال کو سب نے محسوس کیا، اور خسارہ سمجھا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ان کے نیک کاموں کا اضعافاً مضاعفۃً بدلہ عطا فرمائے۔ آمین

پھوپی صاحبہ سیدہ بتول حسنی

۱۲۹۷ھ ۱۸۷۹ء تا ۱۳۸۰ھ ۱۹۵۱ء

پھوپی صاحبہ مرحومہ سیدہ بتول حسنی تکیہ رائے بریلی کے سادات میں محترم مقام رکھنے والی شخصیت سید خلیل الدین مرحوم کی صاحبزادی تھی، اور سید خلیل الدین صاحب خاندان میں بڑے ہوش منداور صاحب جائیداداور باوقار شخصیت کی حیثیت سے معروف تھے، اور خاندان کی بزرگ شخصیت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کے حقیقی پھوپی زاد بھائی تھے، اور دونوں میں بہت گہرا مخلصانہ تعلق بھی تھا، اور بے تکلفی تھی اس طرح وہ عالم دین نہ ہونے کے باوجود ایک بڑے عالم دین کے عزیز ساتھی ہونے کی بناء پر دین سے اچھا تعلق رکھتے تھے، مولانا عبدالحی حسنی نے جو مغربی یوپی کے دوآبے کے علاقہ کا ایک مذہبی انداز کا دورہ کیا تھا، اس میں وہ ساتھ رہے تھے، اور وہاں کے مشائخ اور علماء سے ملاقاتوں میں حصہ لیا تھا، شیخ وقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے شرف بیعت بھی حاصل کیا تھا، اور اسی تعلق کی بناء پر اپنے فرزند کا نام رشید احمد رکھا، حالانکہ خاندانی نام کی مناسبت سے رشیدالدین جو ان کے دادا تھے نام رکھا جاسکتا تھا، اور اسی سفر میں شیخ الھند مولانا محمودالحسن دیوبندی سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور ان کے درس میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا تھا، دل میں ان کی عقیدت ومحبت تھی اس نسبت سے اپنے بڑے پوتے کا نام جو میرے سب سے بڑے بھائی تھے محمود حسن رکھا، یہ مولانا عبدالحی حسنی کے سب سے بڑے نواسے تھے جن کو انہوں نے دیکھا بھی تھا، سید خلیل الدین صاحب کی ہوش مندی اور دینی واخلاقی خوبی سے ان کو

علاقے میں شہرت حاصل رہی، ان کی اولاد میں صرف ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوئی، بیٹے میرے والد سید رشید احمد صاحب تھے، اور بیٹی سیدہ بتول بی تھی، سیدہ بتول صاحبہ عمر میں بہت بڑی تھی، اور اپنی خالہ صاحبہ مخدومہ خیر النساء بہتر کی ہم عمر تھی، اور میرے والد ان سے تقریباً پندرہ سال چھوٹے تھے، میرے والد پیدائشی طور پر سماعت سے معذور تھے، جس کی وجہ سے ان کے والد یعنی میرے دادا ان کے تعلیم و تعلم کے لیے وہ نہ کر سکے جو وہ اپنی فکر مندی اور اپنے محترم دنیاوی مقام کی بناء پر کرنا چاہتے تھے، ان کی بہن سیدہ بتول صاحبہ ان سے بڑی ہونے اور تنہا بہن ہونے کی بناء پر ان سے بہت محبت رکھتی تھی، اور مزید خاندانی بات یہ تھی کہ ان دونوں کی والدہ بھی خاندان کی بزرگ اور صاحب ارشاد شخصیت حضرت شاہ سید ضیاء النبی حسنی رحمۃ اللہ علیہ (۱) کی بیٹی تھی، اس طرح مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب

---

(۱) وحید الدین نام تھا، شاہ ضیاء النبی سے مشہور ہیں، مولانا سعید الدین کے دوسرے صاحبزادہ تھے، ۱۲۴۳ھ کو حضرت سید احمد شہیدؒ کی شہادت سے صرف تین سال پہلے پیدا ہوئے، طفولیت سے رشد و ہدایت و صلاحیت کے آثار ظاہر تھے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی، تحصیل علم کے لئے دہلی پاپیادہ چل دیئے، ۲۰ دن میں دہلی پہونچے، پھر خانقاہ حضرت شاہ ابو سعید مجددی پہونچے اور مولانا احمد سعید مجددی اور مولانا عبید اللہ کی خدمت میں قیام کیا اور ان سے استفادہ کیا اور مولانا حبیب اللہ برمی سے چند کتب درسیہ پڑھیں، دو سال کے بعد لکھنؤ آئے اور مسجد دبیر الدولہ میں مفتی سعد اللہ مراد آبادی اور دوسرے علماء سے کچھ اور کتابیں پڑھیں اور رائے بریلی آکر خاندان ہی کے ایک مرشد برحق حضرت مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی سے بیعت ہوئے اور ایک مدت تک ان کی خدمت وصحبت سے مستفید ہوئے، ان کے انتقال کے بعد مزید تعلیم و تربیت کی ضرورت محسوس کی اور سلوک حضرت خواجہ فیض اللہ سے (جو حضرت خواجہ سید احمد نصیر آبادی کے خلیفہ تھے) حاصل کیا، ۱۴ سال ان کی تربیت میں رہے، خلافت کے بعد حج و زیارت کی نعمت حاصل کی، ۱۲۹۲ھ اور ۱۲۹۳ھ میں واپس ہوئے، شیخ کی توجہ اور ریاضت و مجاہدہ اور اتباع سنت کی برکت سے نسبت قویہ حاصل کی اور بہت جلد ان اطراف میں مرجع الطالبین بن گئے، ساری عمر راہ نبوت پر تزکیہ و تربیت باطنی میں گزار دی اور اپنے خاندان کی روایات و برکات کو زندہ کیا باوجود یہ کہ والد سے بڑی جائداد ترکہ میں پائی تھی اور ضلع کے نامور زمینداروں میں شمار تھا مگر دنیا سے کچھ تعلق نہ رکھا، مزاج میں مشیخت و مخدومیت نام کو نہ تھی، کثرت سے مرید تھے، لیکن خود بازار جاتے اور جو کوئی کچھ منگواتے خرید کر لاتے، نماز و تلاوت میں غرق رہتے، توجہ اکثر دیتے توجہ میں اتنی قوت تھی کہ توجہ لینے والا مرغ بسمل کی طرح لوٹتا۔

اور سید خلیل الدین احمد صاحب ایک دوسرے سے پھوپی زاد اور ماموں زاد بھائی ہونے کے ساتھ ہم زلف بھی تھے، لیکن سید خلیل الدین صاحب کی اہلیہ اپنے والد کی بڑی بیٹی تھی، اور مولانا عبدالحی حسنی کی اہلیہ سب سے چھوٹی بیٹی تھی، اس طرح سیدہ بتول صاحبہ خیر النساء بہتر صاحبہ کی بھانجی تھی لیکن بڑی بہن کی بیٹی ہونے کی وجہ سے عمر میں اپنی چھوٹی خالہ کی ہم عمر تھی، اور دونوں میں ایک دوستانہ ومحبانہ تعلق تھا، اور دونوں حافظ قرآن تھی، ظاہر ہے کہ دونوں کو اپنے بزرگ والد محترم کی تربیت اور ان کی برکات حاصل ہوئیں، جو دونوں کے طرز عمل سے ظاہر ہوتی تھیں، سیدہ بتول صاحبہ کی والدہ کا انتقال جلدی ہو گیا تھا، اس کی بناء پر ان کے بیٹے سید رشید احمد کو اپنی ماں کی شفقتیں زیادہ نہ مل سکیں، جس کی تلافی خود ان کی بہن جو ان سے عمر میں ایک نسل بڑی تھیں، اور اپنی خالہ معظّمہ سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہ کی توجہ اور تربیت وشفقت کا حصہ ملا، سید رشید احمد صاحب سنتے بولتے نہ تھے، لیکن ان کی خالہ سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہ نے مختلف طریقوں سے ان کو اتنا لکھنا پڑھنا سکھا دیا کہ وہ اردو کے اچھے خط میں اپنی بات پیش کر دیتے تھے، اور بارہا ایسا ہوا کہ زبان سے نہ ادا کرنے کی صورت میں اور بات کے اہم ہونے کے موقع سے تحریر سے کام چل جاتا تھا، وہ اردو کتابیں پڑھ لیتے تھے، اور اپنی بات اپنے قلم سے لکھ دیتے تھے، اگر چہ وہ بلند معیار سے نہیں، لیکن ضرورت پوری کرنے کے لائق ہو جاتا تھا، مجھے اور میرے بھائیوں کو اپنے ان والد معظم کی سرپرستی اور ہدایات اور نصیحت اس طریقہ سے بھی حاصل ہوئیں۔

ہمارے والد سید رشید احمد صاحب اپنی اس صلاحیت کی وجہ سے مختلف لوگوں سے ملتے، اور ان سے بات حد ضرورت تک کرنے میں مدد ملتی تھی، اور وہ اپنے اخلاق سے اپنے

= امیروں سے نہایت وحشت تھی، غریبوں سے بے حد انس تھا، باغ پھلتا تو شہر کے غرباء اور غریب مریدوں کو تحائف بھیجتے، بجائے اس کے کہ خود مریدین کے یہاں جاتے، مریدین آتے تھے اور مہینوں مہمان رہتے تھے، آپ کے فضائل ومناقب اخلاق وخصائل کے لئے دفتر درکار ہے۔

بروز جمعہ ۱۶/ ذی قعدہ ۱۳۲۶ھ کو تکیہ شاہ علم اللہ میں اپنے آبائی مکان کے دیوان خانہ میں انتقال ہوا اور مسجد کے شمال مغرب کے گوشہ میں اپنے والد مولوی سید سعید الدینؒ کے پہلو میں بروز سنیچر آسودۂ خاک ہوئے۔

ملنے والوں کی قدردانی کے مستحق بن جاتے تھے، ان کے اخلاق وصفات میں ان کی بہن سیدہ بتول صاحبہ اور ان کی خالہ سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہ کی توجہ کا بڑا دخل تھا، سیدہ بتول صاحبہ اپنے بھائی کی اس معذوری کو دیکھتے ہوئے ان کو بہت عزیز رکھتی تھی، اور بیٹے سے جس طرح محبت ہوتی ہے وہ محبت ان کے لیے ظاہر ہوتی، ہمارے والد صاحب ان کے تنہا بھائی تھے اور وہ ان کی تنہا بہن، اس لیے ان کو اپنی بہن کی محبت کا بڑا حصہ ملا، اس کا تجربہ مجھ کو اس شفقت ومحبت کو دیکھ کر ہوا جب انہوں نے میرے اور میرے بھائیوں کے ساتھ بھتیجے ہونے کے رشتے سے اور اپنے معذوری رکھنے والے بھائی کی اولاد ہونے کی بناء پر کیا، کہ اپنے بیٹوں اور بھتیجوں میں فرق ظاہر ہونے نہیں دیتی تھی، ان کے سب بیٹے اپنے سب بھائیوں میں عمر میں بڑے تھے، وہ بھی ہم بھائیوں کے ساتھ بڑے بھائیوں کی طرح پیش آتے تھے سیدہ بتول صاحبہ خاندان کی بڑی ہوش منداور باقار خاتون تھیں، اور اپنی اس صفت کی وجہ سے وہ خاندان پر بڑا اثر رکھتی تھی، حتی کہ خاندان کے مرد بھی جو عمر میں ان سے چھوٹے تھے، ان کی باتوں کو توجہ سے سنتے تھے، وہ ضرورت کے موقع پر بہتر رائے اور ہوشمندانہ مشورہ دیتی تھی، حافظ قرآن ہونے کی وجہ سے بھی ان کو خیر وبرکت حاصل ہوئی ہوگی، جس نے ان کی شخصیت کو بڑا بنایا، وہ اور ان کے ساتھ خاندان کی بعض خواتین جن میں ان کی خالہ خیر النساء بہتر صاحبہ بھی ہیں حافظ قرآن تھیں، اور وہ سب قرآن مجید تراویح میں بھی پڑھتی تھی جس کا بڑا دلکش منظر ہوتا تھا۔

پھوپی صاحبہ کی شادی خاندان ہی کے ایک باوقار شخصیت حافظ سید عبداللہ حسنی سے ہوئی، جن کو گورنمنٹ کی ملازمت بھی حاصل تھی، جس سے ان کی شخصیت میں مزید وزن پیدا ہوگیا تھا، وہ جید حافظ قرآن تھے، اور وہ اپنی ان اہلیہ سے بڑا تعلق خاطر بھی رکھتے تھے، ان کا انتقال ان کی حیات میں ہوگیا تھا، چنانچہ پھوپا صاحب نے ان کے لیے قرآن مجید کے ایصال ثواب کا غیر معمولی اہتمام کیا، تکیہ رائے بریلی کے اس حسنی خاندان میں عام طور پر اسی اندر کے دائرہ میں رہ کر عموما رشتہ ازدواج قائم ہوتا تھا، اس طرح دوفرد کے

درمیان کئی جہت سے رشتہ داری بن جاتی تھی، ہمارے یہ پھوپا حافظ سید عبداللہ میاں حسنی اپنے خسر سید خلیل الدین صاحب کے داماد ہونے کے ساتھ ساتھ بھانجے بھی ہوتے تھے اس لیے اس طرح خاندان کی اور شاخیں بھی آپس میں ایک دوسرے سے مربوط تھی، بزرگ شخصیت سید ضیاء النبی صاحب سید خلیل الدین احمد کے خسر ہونے کے ساتھ حقیقی چچا بھی تھے، اس کی بناء پر ان شاخوں کی اولاد ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط حیثیت رکھتی ہے، اور اپنے خواتین کے لحاظ سے سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہ اور سیدہ بتول صاحبہ میں ایک دوسرے سے بڑا اچھا ربط تھا، اور دونوں ہی ہوشمندی، تجربہ کاری اور وقار کے لحاظ سے بڑی شخصیت سمجھی جاتی تھیں۔

سیدہ بتول صاحبہ نے اپنے تینوں بیٹوں کی اچھی دینی تربیت بھی کی تھی، حالانکہ بڑے بیٹے سید حسن مجتبیٰ حسنی سنتے بولتے نہیں تھے، لیکن شروع سے ہی نماز وغیرہ دوسری طاعت کے پابند اور خدمت خلق کا اچھا جذبہ رکھتے، اور صلہ رحمی کرتے تھے۔ وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ہم زلف بھی ہوئے، ان کی دونوں کی اہلیہ حقیقی بہنیں تھیں، ان کے دوسرے فرزند جن کو ہم لوگ بھائی جان کہتے تھے سید حسن مثنیٰ حسنی تھے، جنہوں نے ہومیو پیتھ کی کچھ پریکٹس بھی کی تھی اور ان کا رشتہ بھی خاندان میں ہی ایک بزرگ عالم مولانا عزیز الرحمٰن حسنی کی صاحبزادی سے ہوا، اور ان کی صاحبزادی مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے صاحبزادے مولانا سید محمد الحسنی کو منسوب ہوئی، اور دوسری صاحبزادی بھی خاندان میں ہی منسلک ہوئی، تیسرے صاحبزادے جن کو ہم لوگ بھائی جی کہتے تھے، سید محمد مسلم حسنی تھے، جنہوں نے ہم سب بھائیوں اور افراد خاندان میں سب سے اچھی عمر پائی، اور ان کا رشتہ ڈاکٹر عبدالعلی کی صاحبزادی سے ہوا۔

مجھ کو اپنی پھوپی صاحبہ کی شفقت کا خاصہ حصہ ملتا رہا تھا، اور ۱۹۵۱ء میں جب میں حجاز میں تھا تو ان کا ایک طویل علالت کے نتیجہ میں انتقال ہوا، میں جب واپس ہوا، تو مجھے معلوم ہوا کہ ان کو میرے حج سے واپس آنے کی خوشی کا انتظار تھا اور انہوں نے اس زمانے

کے پانچ روپے رکھ چھوڑے تھے کہ وہ مجھے انعام وخوشی کے طور پر دیں گی، جوان کے صاحبزادوں نے مجھے عنایت کیے، اور میں نے ان ہی کے ایصال ثواب کے لیے ان کو صرف کیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور درجات بلند کرے۔

عزیزی سید حسن حسنی

۱۳۶۶ھ ۱۹۴۷ء تا ۱۴۳۴ھ ۲۰۱۲ء

عزیزی سید حسن حسنی ہمارے ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء کے نواسہ اور ہمارے پھوپھی زاد بھائی کے بڑے صاحبزادے اور اپنے بھائیوں اور رفقاء میں بڑے تھے اور ہمارے برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کے داماد ہونے کے رشتہ سے تعلق مزید بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے اپنے نانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی سرپرستی اور توجہ سے فائدہ اٹھایا تھا، دینداری اور دنیاوی نظم وتربیت کا اچھا سلیقہ حاصل کرلیا تھا جس سے خود ان کو بھی فائدہ پہنچا وہ اپنے بھائیوں اور اپنے طبقہ کے عزیزوں کو بھی فائدہ پہنچایا۔

وہ ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے، اس طرح ہندوستان کی آزادی کا آغاز اوران کی عمر کا آغاز ایک ساتھ ہوا، انہوں نے شروع میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ابتدائی درجات میں تعلیم حاصل کی، پھراسی دوران سر میں چوٹ لگنے کی وجہ سے ان کو ذہنی مصروفیت میں کمی کرنی پڑی اس طرح وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم جاری نہ رکھ سکے لیکن تعلیم کو قائم رکھنے کے لیے لکھنؤ کے امیر الدولہ اسلامیہ کالج کے درجات میں شریک درس ہوئے اوراتنی تعلیم حاصل کرلی جوزندگی کی مختلف ضرورتوں اور معاملات کوانجام دینے اور حسن تدبیر اختیار کرنے کا ذریعہ ہوں، اوراس سے انہوں نے شہر میں اپنی عمر کے ہم مذاق لوگوں میں مقبولیت کا مقام حاصل کیا۔ وہ بڑے صاحب فہم اور دوسروں کی دشواریوں میں بھی اچھا تعاون کرنے والے ثابت ہوئے۔ لکھنؤ شہر میں ان کو اچھے قدرداں حاصل ہوئے اور

انہوں نے ان کے ساتھ تعلق کو اچھے انداز میں بنایا، معاشی لحاظ سے انہوں نے سر میں استعمال کرنے والا صحت مند تیل کی تیاری اور ترویج کا کام کیا جوان کے لیے معاش کا اچھا ذریعہ بنا۔

وہ تین بھائی اور دو بہنوں پر مشتمل کنبہ کے اچھے کار پرداز فرد تھے، اور ان کے دونوں بھائی جوان سے کم عمر تھے ان کی بہتری اور ترقی میں بھی ان کا بڑا حصہ رہا۔ بیماروں کی تیمارداری میں بھی ان کو خصوصیت حاصل رہی۔

اپنے والد اور والدہ اور کنبہ کے دوسرے افراد میں جو بیمار ہوتا وہ اس کے علاوہ اور تیمارداری کا فریضہ بہت اچھا انجام دیتے تھے، اور ان کی حسن سیرت اور حسن تدبیر کا اثر ان کی اولاد میں بھی آیا جوان کی طرح تین بھائی (محمود حسن حسنی، مسعود حسن حسنی، منصور حسن حسنی) اور دو بہنوں (عائشہ اور شمامہ) پر مشتمل ہیں۔ ان کے یہ تینوں صاحبزادوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور عالم وفاضل ہوئے اور علم دین کی خدمت میں تینوں کو الگ الگ منصب حاصل ہوئے۔

صحت ان کی اچھی رہی تھی، جسمانی لحاظ سے بھی وہ مضبوط اور فعال حیثیت رکھتے تھے لیکن تقریباً ٦۵ سال کی عمر پر ان کو دل کا عارضہ پیش آیا، جس کی فکر وعلاج میں کئی سال لگے اور تقریباً اس میں صحت کی منزل قریب آجانے کے باوجود دل کے ایک دورے کو وہ برداشت نہ کر سکے اور دنیا سے اچھے کام اور شہرت کے ساتھ اپنے مالک حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

غفر اللّٰہ لہ ورفع منزلتہ وتقبل عملہ.

اہلیہ مرحومہ محمد میاں مرحوم

۱۳۵۹ھ ۱۹۴۰ء تا ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۳ء

محمد میاں جو مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کے نام سے معروف ہوئے ان کی اہلیہ سیدہ ذکیہ حسنی بنت برادر محترم ڈاکٹر سید حسن مثنیٰ حسنی (جو میرے پھوپھی زاد بھائی تھے) کی مختصر علالت کے بعد ۱۷/اپریل ۱۹۹۳ء مطابق ۲۴/شوال ۱۴۱۳ھ صبح ۶ بجے لکھنؤ میں انتقال کر گئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محمد میاں کا انتقال جون ۱۹۷۹ء میں ۴۴ سال کی عمر میں ہو گیا تھا، مرحومہ کی عمر بھی زیادہ نہیں ہوئی اور ۵۳-۵۴ سال کی عمر میں وہ بھی وفات پا گئیں۔ یہ حادثہ مرحومہ کے صاحبزادگان عزیزان مولوی سید عبداللہ حسنی، مولوی حافظ عمار عبدالعلی حسنی اور مولوی سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کے لیے جہاں سخت صدمہ کا ہے، سبھی اہل خاندان کے لیے خصوصاً سرپرست خاندان حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے لیے بڑے صدمہ کا رہا، جن کا دل جواں سال بھتیجے، بھانجے، اور دوسرے کئی خاندانی حوادث اور عزیز ترین رفقائے کار کے صدمہ سے دوچار ہو چکا تھا۔

مرحومہ کے ضعیف والدین کے لیے سوہان روح جو صحت میں ضعف کے مرحلہ میں ہیں، مرحومہ نے اپنے بزرگ صفت خسر خال معظم مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی شفقتیں بھی حاصل کی تھیں اور بہت کچھ ان سے سیکھا تھا، تعلیم و تربیت میں مرحومہ کو اپنے نانا مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی مرحوم (والد مولوی سید ابوبکر حسنی) کی خصوصی توجہ حاصل

رہی اور یہ انھیں بڑی عزیز تھیں۔ ان کے مختصر خاندان میں والدین کے علاوہ ایک بہن (اہلیہ سید ابو طاہر حسینی ہسوی جن کا ۲۰۱۴ء میں انتقال ہوا) اور صاحبزادگان ہیں۔ اللہ تعالیٰ سبھی کو صبر واستقامت سے نوازے۔

جنازہ لکھنؤ سے رائے بریلی لے جایا گیا اور ظہر کی نماز کے بعد خاندانی قبرستان میں اپنی دادی مرحومہ جو حافظ قرآن اور ذی علم وذی فہم خاتون تھیں کے پائینتی مدفون ہوئیں۔ نماز جنازہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پڑھائی۔

رحمها اللّٰه تعالیٰ رحمةً واسعةً وغفرله مغفرة تامة.

مولانا سید طلحہ حسنی ٹونکی

۱۳۰۸ھ ۱۸۹۰ء تا ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء

افسوس کہ مشہور معلم اور استاد مولانا سید طلحہ حسنی ٹونکی نے بھی دار فانی سے دار باقی کو رحلت فرمائی اور وہ کراچی میں جہاں وہ تقسیم ہند کے بعد سے مقیم تھے ۲۵/ستمبر ۱۹۷۰ء مطابق ۲۲/رجب المرجب ۱۳۹۰ھ کو جمعہ کے دن صبح نو بجے کے بعد پندرہ روز کی علالت اور شدید بخار میں رہ کر انتقال کر گئے۔

مولانا مرحوم امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ سے خاندانی طور پر قریبی اور ان کے بھانجہ مولانا سید محمد علی کی اولاد میں تھے، مولانا طلحہ کا نکاح خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی پھوپھی صاحبہ سے ہوا، اس طرح ہم لوگوں کا بھی ان سے قریبی خاندانی تعلق قائم ہو گیا۔ ۱۳۰۸ھ میں ٹونک راجستھان میں پیدا ہوئے جہاں حضرت سید احمد شہید کا اپنا گھرانہ جو تکیہ رائے بریلی سے ان کے ساتھ ہجرت کر گیا تھا حضرت سید احمد شہید کی شہادت کے بعد والی ریاست ٹونک نواب وزیر الدولہ مرحوم (۱) کے اصرار و تقاضے

(۱) وزیر الدولہ امیر الملک نواب محمد وزیر خاں بہادر شیر گڑھ میں ۲۹ جمادی الثانی ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوئے، چار سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہوا، امیر خاں سے انگریزوں کے معاہدہ کے وقت وزیر خاں کی عمر ۱۲-۱۳ سال تھی، انگریزوں نے تعلقات کے استحکام کے لیے وزیر خاں کو دو سال کے لیے دہلی بھیجنے کی شرط رکھی تھی، دہلی کے قیام میں جناب وزیر الدولہ نے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی، بادشاہ وقت اکبر شاہ ثانی سے قریب کی رشتہ داری ہونے کی وجہ سے شاہی محلات میں آنے جانے اور حکومتی تقریبات میں حاضری کا موقع ملتا تھا، اسی بادشاہ نے آپ کو وزیر الدولہ امیر الملک بہادر نصرت جنگ کا خطاب دیا تھا۔=

پر ٹونک منتقل ہو گیا تھا(۱) وہیں راستے میں کلومیاں کی حویلی کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس کو نواب وزیر الدولہ نے حضرت سید احمد شہید کے اہل خانہ کے قیام کے لیے عنایت فرمایا تھا، حضرت علیہ الرحمۃ کا پورا خاندان تقسیم ہند تک اسی میں فروکش رہا تھا، تقسیم کے بعد کچھ لوگ تو پاکستان چلے گئے، بقیہ کچھ لوگ رائے بریلی آکر آباد ہوئے، اس حویلی پر سندھیوں نے آکر

= ۱۲۳۸ھ میں آپ کی شادی ہوئی ۱۲۵۰ھ ۲۷ جمادی الثانی میں ریاست ٹونک کے مسند نشین ہوئے۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے جناب وزیر الدولہ کو بطور وظیفہ تاحیات بارہ ہزار پانچ روپیہ ماہانہ کے حساب سے منکل سالانہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ دینا منظور فرمایا تھا، وہ نواب صاحب کی زندگی تک ان کو ملتا رہا۔

ایک روز نواب امیر الدولہ نے حضرت سید احمد شہید کو ٹونک بلا کر خود اور صاحبزادہ محمد وزیر ان کی اہلیہ اور بعض دوسرے متعلقین کے ساتھ حلقہ بیعت وارادت میں شامل ہوئے، اس طرح سید صاحب سے یہ تعلق اخیر دم تک قائم رہا اور ان کی محبت میں سرشار رہے، سید صاحب نے بالاکوٹ سے نواب صاحب کے نام جو خطوط لکھے ہیں، ان سے اس خصوصی تعلق ونسبت کا اظہار ہوتا ہے، بالاکوٹ کے سانحہ کے بعد انہوں نے سید صاحب کے اہل خانہ اور ان کے اعزہ جو سندھ میں تھے نیز ان مجاہدین ومہاجرین کو جنہوں نے ہندوستان واپس آنا منظور کیا، اپنے پاس ٹونک بلا لیا، نواب وزیر الدولہ مرحوم ریاست وامارت کے باوجود اس شان کے آدمی تھے، جو خانقاہ نشین مشائخ اور عزلت گزیں صوفیوں میں نہیں ملتی، آپ پورے متشرع، متبع سنت، پابند مذہب، باخدا اور متواضع مسلمان تھے، اور صرف رؤساء وامراء ہی کے طبقہ میں نہیں، بلکہ علماء اور دینداروں کے طبقہ میں بھی ممتاز تھے، سید صاحب اور آپ کی جماعت کے ساتھ تو آپ کو عشق تھا، ان کی خاک پا آپ کے سر کا تاج تھی۔آپ کی مایہ ناز تصنیف "وصایا الوزیر علی طریق البشیر والنذیر" میں سید صاحب کی بیعت ومحبت کے اثرات ہر سطر سے ظاہر ہوتے ہیں، جس میں سید صاحب کا بہت کچھ تذکرہ اور اپنے جانشینوں کو آپ کے اتباع اور آپ کے طریقہ کی اقتداء کی تاکید ہے۔

برصغیر کے والیان ریاست میں ان جیسا صاحب علم، پابند شریعت اور متبع سنت بہت خال خال گذرے ہیں، نواب خلد آشیاں کی اس دینداری اور تشرع سے "الناس علی دین ملوکھم" کے مطابق ریاست میں دینداری واتقاء کی ہوا چل گئی تھی، سارے ہندوستان بلکہ شاید اس وقت ساری دنیائے اسلام میں ریاست ٹونک ہی وہ جگہ تھی، جہاں بہت سے شرعی احکام جاری تھے، اور دینی زندگی کے بہت سے آثار نظر آتے تھے، حدود ریاست میں تعزیہ داری کی سخت ممانعت تھی، نواب کا انتقال ۱۳ محرم الحرام ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸ جون ۱۸۶۴ء بروز اتوار کو ہوا، اور نواب امیر الدولہ بہادر کے مزار کے بائیں جانب تدفین عمل میں آئی۔(تاریخ ٹونک، آثار مالوہ، ریاست ٹونک کے حکمران ذیشان، حدیقہ راجستھان، سیرت سید احمد شہید، ج ۱۔تذکرہ علمائے ٹونک، کاروان ایمان وعزیمت ص ۱۲۶ تا ۱۳۰)

قبضہ کیا، لیکن وہ لوگ اس میں آباد نہ ہو سکے، مختلف بلاؤں نے ان کو وہاں سے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، کبھی چارپائی الٹتی تھی، کبھی برتن پٹخے جاتے تھے، کبھی کوئی بیمار ہوتا، کبھی کسی کو دھکہ دے کر گرا دیا جاتا، غرض اس صورتحال سے پریشان ہو کر انہوں نے وہ حویلی واپس مسلمانوں کو بیچ دی، اسی حویلی میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے دوران قیام ٹونک حضرت سید احمد شہید کی زیارت کی تھی، تا حد نگاہ تک پھیلی ہوئی وہ حویلی پورا ایک محلّہ معلوم ہوتی تھی، اب وہ کئی مکانات میں تقسیم ہے، نواب وزیر الدولہ یہاں بنفس نفیس حاضر ہوتے تھے، اور عرض کرتے کہ خادم حاضر ہے، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مہیا کی جائے۔

یہ علاقہ محلّہ قافلہ کے نام سے موسوم ہے، اس لیے کہ مہاجرین کا قافلہ یہیں ٹھہرا تھا، اور واقعہ بالاکوٹ کے بعد اسی جگہ مجاہدین وسادات کے قافلہ کو ٹھہرایا گیا تھا، یہ مسجد اس زمانہ میں شب بیداروں سے بھری رہتی تھی، اہل قلوب کو اس مسجد میں بہت نورانیت اور غیر معمولی تاثیر کا احساس ہوتا ہے، اور دعا کی قبولیت کا بھی اکثر لوگوں کو تجربہ ہے، ان میں حضرت سید صاحب کے بھانجہ مولانا سید محمد علی بھی تھے، جو مولانا سید طلحہ حسنی کے جد اعلیٰ ہیں۔

مولانا طلحہ حسنی دس سال کی عمر میں لکھنؤ آگئے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لے لیا، اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے دو سال ہی گزرے تھے اس وقت مولانا محمد فاروق چریا کوٹی جیسے اساتذہ فن دارالعلوم میں تدریسی خدمت انجام دے رہے تھے، پھر مولانا طلحہ حسنی نے ٹونک کے مدرسہ ناصریہ میں داخلہ لے لیا اور مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی جو بعد میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث ہوئے اور مولانا سیف الرحمٰن ٹونکی کابلی جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے، درسی کتابیں پڑھیں اس کے بعد لاہور جا کر علوم شرقیہ کے امتحانات دیئے، پھر دہلی میں حکیم غلام رضا خاں صاحب شریفی سے طب پڑھی، اس کے بعد چار ماہ میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔

۱۳۳۵ھ میں اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر ہوئے، اور ان کو وہاں بڑی علمی

حیثیت حاصل ہوگئی اور بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر علم میں ان کو حصہ عطا فرمایا تھا، قرآن، حدیث، سوانح، تاریخ فلکیات، ریاضی، علم عروض شعر وسخن ان سب میں ان کو یدطولیٰ حاصل ہوگیا تھا، عربی فارسی، اردو کے بے شمار اشعار نوک زبان رہتے تھے۔ ۱۳۶۸ھ میں پاکستان تشریف لے گئے۔ ۱۳۷۷ھ میں مصر وشام اور قسطنطنیہ کا سفر کیا اور نادر سے نادر کتب خانوں کی سیر کی۔ تصنیفات میں عہد صاحب کا تمدن وثقافت، اور حضرت ام سلمہ قابل ذکر ہیں اور ایک فرزند داؤد کو پیچھے چھوڑا۔

ان کے انتقال سے علم وفضل کی ایک شمع بجھ گئی، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

حضرت مولانا حکیم عبدالحی حسنیؒ

۱۲۸۶ھ ۱۸۶۹ء تا ۱۳۴۱ھ ۱۹۲۳ء

اس آخری عہد میں تکیہ کلاں رائے بریلی میں جو سادات کا خاندان آباد ہے، اس کے اولین بزرگوں میں حضرت شاہ علم اللہ حسنی نقش بندیؒ نے دین وتقویٰ کے داعیہ سے یہاں آکر بستی بسائی، اور ایسا ماحول وہاں پر قائم کیا تھا جو ارشاد وتربیت کے تقاضوں کو پورا کرے، اور آبادی سے کٹ کر اللہ کے ذکر سے وابستہ رہے، اس میں تعلیم وارشاد کا سلسلہ رہا، اور بزرگ پیدا ہوتے رہے، حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ سلسلہ کے بڑے بزرگ تھے، اور حضرت سید آدم بنوری جو حضرت شاہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے اجل خلفاء میں سے تھے، بڑے سادہ زاہدانہ انداز کے ساتھ نمایاں دینی کردار ادا کیا، ان کی اولاد ان کے نقش قدم پر تھی، اور یہ سب علم وروحانیت کے جامع افراد تھے، جن میں اکثر کا تعلق حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے تھا، اور ان حضرات کو ان کا بڑا اعتماد حاصل تھا۔

ان کے بعد کی نسل کا تعلق ان کے جانشین حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سے رہا، جن میں سب سے نمایاں شخصیت امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ کی تھی، ان کے تربیت یافتہ لوگوں میں خاندان کے افراد میں نمایاں نام حضرت مولانا محمد ظاہر حسنی کا ہے، جو ان کے ممتاز خلیفہ تھے ان کے بعد اس خاندان میں انہی کے تربیت یافتہ لوگوں میں ایک بھتیجہ حضرت مولانا شاہ ضیاء النبی حسنی ہوئے، ان دونوں سے خاندان کے جن افراد نے تربیت حاصل کی، ان میں سب سے نمایاں شخصیت کے طور پر حضرت مولانا سید عبدالحئی حسنیؒ سامنے

آئے، جنہوں نے اپنے بعد دو فرزند چھوڑے، جن کے نام اور کام سے اس آخری عہد میں بہت مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی، یہ دونوں ہمارے ماموں تھے، ایک مولانا ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی حسنی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تھے، دونوں کے تعارف کی یہاں ضرورت نہیں، ان دونوں نے ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند دونوں علمی مراکز سے استفادہ کیا، اور ندوۃ العلماء کے یکے بعد دیگرے ناظم ہوئے۔

حضرت مولانا عبدالحی حسنی علوم دینیہ میں پختگی اور کمال حاصل کرنے کے ساتھ اپنے عہد کے بزرگوں سے تعلق اور ان کی قائم مقامی کا مقام حاصل کیا، ان کے علم وادب میں امتیاز کا ثبوت ان کی تین اہم ترین کتابوں میں دیکھا گیا، اور اس موضوع پر لوگوں نے ان کی کتابوں سے بہت فائدہ اٹھایا، اور ہندوستان کے علمی و دینی اور حکومتی امتیاز رکھنے والی شخصیتوں کو تاریخ کی کتابوں میں سے کھنگال کر انسائیکلو پیڈیا کے طور پر پیش کیا، دوسرے ہندوستان میں علمی و ثقافتی جو تصنیفات و تالیفات پیش کی گئیں، ان کو بھی جمع کیا، وہ بھی انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے، اور تیسرے اردو ادب و شاعری پر جو کام ہوا اس کو بھی جامع اور علمی خصوصیت کے ساتھ انہوں نے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں پیش کیا، اس طرح انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے علمی وادبی کارناموں کو اس طرح قابل استفادہ بنادیا، کہ جو بہت قدر دانی کے لائق بنا، اور گجرات کے علماء و مشائخ اور اہل کمال اور ممتاز شخصیتوں اور وہاں کے سلاطین و امراء کے حالات کو پیش کیا، اور وہ معلومات فراہم کیں کہ یہ کتاب اس موضوع پر مرجع بن گئی، اس کے علاوہ تربیت وارشاد کے سلسلہ میں انہوں نے شیوخ دیوبند سے بھی ملاقاتیں کی اور رہنمائی حاصل کی، جن میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے نام اہمیت کے حامل ہیں، اور اویس زمانہ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں گنج مرادآباد حاضری دے کر بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا، اور ربانی خصوصیت حاصل کی اور اجازت حدیث بھی لی، ان کی وفات کے بعد سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ

مہاجر مکی سے مکہ معظّمہ میں خط وکتابت کے ذریعہ بیعت وارادت کا شرف حاصل کیا۔

ان کے علاوہ مشہور قوی النسبت بزرگ اور ماموں حضرت مولانا عبدالسلام ہانسوی کی شفقت وتوجہ بھی حاصل کی تھی، اوران کے ایک خلیفہ کی جانب سے اجازت و خلافت بھی پائی تھی، انہیں اپنے والد سید فخر الدین حسنی اوراپنے خسر شاہ ضیاء النبی حسنی سے بھی اجازت وخلافت حاصل تھی۔

حضرت مولانا عبدالحی حسنی نے اپنے عہد کی ممتاز خصوصیت کی درسگاہ ندوۃ العلماء سے وابستگی اختیار کی، اوراس کے لیے اپنی خدمات پیش کیں، چوں کہ اس کے اکثر ذمہ داروں کا تعلق اولیس زمانہ حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے تھا، جن کے بڑے خلیفہ حضرت مولانا محمد علی مونگیری ندوۃ العلماء کے ناظم اور بانی تھے، انہوں نے مولانا عبدالحی حسنی کواپنا معاون بنایا، اوراس طرح مولانا عبدالحی نے اپنے کوندوۃ العلماء کے لیے وقف کردیا، اور معاون ناظم سے ترقی کر کے نائب ناظم اور ۱۹۱۵ء میں ناظم منتخب ہوئے، ندوۃ العلماء کواپنی متنوع خصوصیات سے بڑی ترقی دی اوراستحکام بخشا، ان کی نظامت کا یہ عرصہ ۸ سال رہا، اورانتقال کے وقت تک اس کے ناظم رہے۔

ندوۃ العلماء کے کے قیام کا مقصد دینی اورعصری تعلیم کے درمیان قربت پیدا کرنا تھا، تاکہ دین ودنیا کی مطلق علاحدگی جو رائج الوقت بن گئی تھی اس کو دور کیا جائے، چنانچہ اس کے اثر سے ندوۃ العلماء کی تعلیم کی پہلی نسل میں علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالباری ندویؒ اور دیگر کئی شخصیتیں سامنے آئیں جو علم میں کمال کے ساتھ ربانی صفات سے متصف تھیں، اورانہی کے طرز کے ان کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ان کے ندوہ کے معاصرین مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ، مولانا محمد عمران خان بھوپالی ندوی کی شخصیتیں ایسی ہیں جنہوں نے وقت کی ربانی شخصیات سے اصلاحی وروحانی تعلق پیدا کر کے ان کا اعتماد اور خلافت بھی حاصل کی۔

انہوں نے اپنے والد کی خاص تربیت حاصل کی تھی، اوران کی وجہ سے مولانا

عبدالحی کو بھی شاہ ضیاء النبی صاحب کی خاص شفقت و تربیت کا حصہ ملا، انہوں نے ان کو قریب سے دیکھا اور ان کے متعلق سرالوجود، برکۃ الدنیا اور لب لباب العرفان جیسے الفاظ لکھے، ان کے مشورہ اور رہنمائی کی بنیاد پر انہوں نے سلوک وارشاد کی اہم کتابیں پڑھیں، مجھے ان سے جو خاندانی نسبت و تعلق حاصل ہے کہ وہ میرے حقیقی نانا تھے، اور میرے دادا سید خلیل الدین حسنی مرحوم کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے، جو ان کے ساتھ دہلی اور اس کے اطراف کے دینی و دعوتی سفر میں ساتھ رہے تھے، مجھے بھی ان کی حسنات و صفات کی برکتوں کا فائدہ حاصل ہوا، میری والدہ ان کی بڑی صاحبزادی تھیں، ان کے بڑے بیٹے کا نام انہوں نے ممدوح عالم حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی کے نام پر سید محمود حسن رکھا تھا، حالانکہ ان کا موضوع اسلامی ثقافت و تاریخ و تذکرہ نگاری تھا، مگر حدیث شریف سے انہیں خاص شغف تھا، اور اس کے مایہ ناز علماء سے استفادہ کا موقع ملا تھا، جن میں علامہ حسین بن محسن انصاری خزرجی یمانی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، ان سے ان کو اجازت حدیث بھی حاصل تھی ان کے علاوہ شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، حضرت مولانا شاہ رشید حسن گنگوہی، میاں سید نظیر حسین دہلوی سے بھی اجازت حدیث حاصل تھی، اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے ان کے کانپور کے قیام میں جامع العلوم میں پڑھا بھی تھا، اس کے علاوہ فرنگی محل کے علماء اور بھوپال کے علماء سے خاص طور پر استفادہ کیا۔

حضرت مولانا عبدالحی حسنی نے علمی کارنامے بہت خاموشی کے ساتھ اور بڑے معیاری و تحقیقی انداز میں انجام دیئے تھے، کہ ان کی کتابوں کے متعلق ان کی وفات کے بعد لوگوں کو علم ہوا، جو کہ قلمی دائرہ میں تھیں، جن کو ان کے صاحبزادگان اور قدر دانوں نے طبع کرا کر دنیا کو روشناس کرایا، یہ ان کا اجتماعی زندگی میں تصنیفات اور ندوہ کی انتظامی خدمت کا مشغلہ تھا، اور اندرونی طور پر انہوں نے اپنے گھر کے اندر اپنی نئی نسل کو بہت صالح اور داعی نسل بنانے کی پوری فکر کی تھی، ان کی زوجیت میں مولانا سید عبدالعزیز ہانسوی کی صاحبزادی تھی جو بہت نیک صفت خاتون تھیں، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی انہی کے

صاحبزادے ہیں، ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا شاہ ضیاء النبی حسنیؒ کی صاحبزادی سیدہ خیر النساء بہتر سے نکاح ہوا، جو بڑی برگزیدہ اور بزرگ اور رابعہ سیرت خاتون تھیں، جن کا گھر کے کاموں کی نگرانی کے ساتھ زیادہ وقت دعا ونماز وذکر وشغل میں گزرتا تھا، ان کی خصوصی تربیت سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت پیدا ہوئی، جس کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اپنی والدہ پر کتاب ذکر خیر سے سمجھا جاسکتا ہے، ان کی خوبیوں کا اثر ان کی صاحبزادیوں میں بھی خوب ظاہر ہوا تھا، بڑی صاحبزادی سیدہ امۃ العزیز جو ہم بھائیوں کی والدہ تھیں اور دوسری صاحبزادی سیدہ امۃ اللہ تسنیم تھیں اور دونوں ہی صاحب دل اور صاحب قلم خاتون تھیں، سیدہ امت اللہ تسنیم کی کتابیں زاد سفر اور قصص الانبیاء خاص طور پر مقبول اور عام ہوئیں، افسوس کہ مولانا عبدالحی حسنیؒ نے قمری اعتبار سے ۵۵ سال اور شمسی اعتبار سے ۵۳ سال کی عمر میں لکھنو میں وفات پائی، اور مشہور بزرگ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ کے پائینتی دائرے بریلی میں تدفین عمل میں آئی۔

اقوال وملفوظات

فرمایا:۔

ارشاد رسول ﷺ ہے کہ جو ''لا الہ الا اللہ'' کی گواہی دیتے ہوئے وفات پائے گا، وہ جنت میں داخل ہوگا، مرید کے لیے ضروری ہے، کہ ان مقامات میں وہ برابر ترقی کرتا رہے، اور ان مقامات کے لیے طاعات اور اخلاص اصل ہے، اس کی بنیادی اور مقدم شرط ایمان ہے، پھر اس کے نتیجے میں کچھ احوال وصفات اور نتائج وثمرات ظاہر ہوتے ہیں، یہاں تک کہ مرید درجہ بدرجہ توحید ومعرفت کے بلند مقام پر پہونچ جاتا ہے، اگر کسی مقام و حالت میں صحیح اور مطلوب ثمرات نہ حاصل ہوں، تو سمجھ لینا چاہئے کہ پہلے والے مقام میں کوئی تقصیر رہ گئی ہے، اور ٹھیک اسی طرح واردات قلبی اور کیفیات نفسی میں بھی سمجھنا چاہئے اس لیے ضروری ہے کہ مرید اپنے ہر قول وفعل کا برابر محاسبہ کرتا رہے اور جائزہ لیتا رہے،

کیوں کہ اعمال کے نتائج وثمرات کا ظہور ضروری ہے، اور اگر نتائج وثمرات ٹھیک طور پر نہیں ظاہر ہورہے ہیں، تو اس کا سبب عمل میں کوئی کمی یا کوتاہی ہے، مرید اپنے اعمال کا محاسبہ اپنے ذوق ووجدان کے ذریعہ کرتا ہے، لیکن یہ صفت بہت کم لوگوں کو حاصل ہے، اور عام طور پر لوگ اس معاملہ میں غفلت کا شکار ہیں۔

فرمایا:۔

مراقبہ یہ ہے کہ انسان اپنے سارے ادراک واحساس کے ساتھ اس ذات مجرد کی طرف متوجہ ہوجائے جس کو لفظ اللہ سے لوگ جانتے ہیں، لفظ سے الگ ہوکر محض ذات کا تصور کرنا بہت کم ہے، مراقب کا کام یہ ہے ذات باری تعالیٰ کی طرف توجہ الفاظ سے الگ ہوکر کرے، اور اللہ کی طرف وساوس اور دوسرے خیال سے اپنے کو علاحدہ کرکے متوجہ ہوجائے۔

فرمایا:۔

حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی نے میری طرف مخاطب ہوکر فرمایا، علم کی غرض عمل ہے، اگر عمل نہ ہوا تو علم حاصل کرنا بیکار ہے، اولیاء اللہ جتنا پڑھتے تھے اس پر عمل کرتے تھے، شاہ مینا شرح وقایہ پڑھتے تھے جب کتاب الزکاۃ تک پہونچے، تو پڑھنا چھوڑ دیا، استاد نے سمجھایا تو کہا کہ علم کی غرض عمل ہے، صوم وصلاۃ مجھ پر فرض ہے اس کا علم حاصل کرنا ضروری تھا زکوۃ مجھ پر فرض نہیں، جب کبھی فرض ہوگی، تو اس کے مسائل بھی سیکھ لوں گا، اس وقت اس کا پڑھنا وقت کو ضائع کرنا ہے، یہاں تک پہونچ کر آپ پر کیفیت طاری ہوگئی، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

فرمایا:۔

حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی علیہ الرحمۃ سے میں نے عرض کیا، کہ مجھ کو اس بات کی تمنا ہے کہ حدیث کی سند آپ سے حاصل ہو، آپ نے ازراہ کرم میری التماس قبول فرمائی اور مجھ کو اجازت دی، اور فرمایا کہ میں تم کو حصن حصین کی بھی اجازت

دیتاہوں، اس کے پڑھنے سے سات سو (یا اس کے قریب قریب کوئی تعداد مجھ کو فرمائی) آدمی اولیاء اللہ بن گئے، فرمایا تیسری بار جب حاضری ہوئی تو عصر کا وقت تھا آپ صحن سے باہر حجرے کے محاذی تشریف رکھتے تھے، نہایت لطف و محبت سے آپ نے شرف پذیرائی عطا فرمائی، اور دیر تک اپنے حالات بیان کرتے رہے، اسی گفتگو میں آپ نے یہ شعر پڑھا۔

دل ڈھونڈنا سینے میں میرے بوالعجبی ہے
ایک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

سلسلہ کلام کے ختم ہونے کے بعد میں نے عرض کیا کہ مجھ کو حدیث مسلسل سنائیں، آپ بہت محظوظ ہوئے، اور فرمایا کہ میں نے اپنے کانوں سے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی زبان سے سنا ہے پھر آپ نے تیمّم فرمایا ایک بار دست مبارک کو مٹی پر مار کر منہ پر پھیرا، اور پہونچوں تک ہاتھ میں مل لیا، اس کے بعد آپ نے یہ حدیث پڑھی،

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

"الرحمون یرحمھم الرحمن ، تبارك و تعالیٰ ، ارحموا من فی الارض یرحمكم من فی السماء"

پھر آپ نے فرمایا کہ میں تم کو حدیث مسلسل بالمحبۃ کی بھی اجازت دیتا ہوں، اس حدیث کو میں نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے سنا ہے،

"یا معاذ انی احبك فقل اللھم اعنی علی ذکرك وشکرك و حسن عبادتك"

فرمایا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے فرمایا کہ مجھ کو حضرت سید احمد شہید سے دو طریق سے نسبت حاصل ہے، میرے دادا پیر میاں جی نور محمد جھنجھانوی ان کے مرید تھے، اور ان کے پیر حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی بھی حضرت کے مرید تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے فرمایا: سب مشائخ طبیب امت ہیں، اپنے اپنے زمانے کے لوگوں کے اعتبار سے طرق انہوں نے رکھے ہیں، سب کا مآل ایک ہے، اور سب کا خلاصہ اتباع سنت ہے، بعد کے لوگوں نے بدعتیں داخل کردی تھیں، ان کے مجدد

حضرت سید احمد شہید ہوئے، جس سے جس کو عقیدت ہو، اس کے طریقہ میں وہ داخل ہو جائے، فائدہ ہوگا۔

مجھ کو حضرت سید صاحب کے ساتھ محبت وعقیدت اعلیٰ درجہ کی ہے، میں یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے پیر شاہ عبدالعزیز صاحب سے بڑھ کر ہیں، باقی خدا جانیں، کون بڑھ کر ہے، لیکن میرے دل میں ہمیشہ یہی آتا ہے، میں اپنے قلب کا مختار نہیں ہوں، یہ کچھ خدا کی طرف سے ہے، پھر میں کہتا ہوں اللہ تو ہی جانے، میں مجبور ہوں، شاہ صاحب کے پہلے سے اس خاندان میں اتباع سنت تھا، مگر حضرت نے نہایت درجہ کو اتباع کیا، ہندوستان میں نور پھیلا دیا، علماء کہتے ہیں کہ وہی کتابیں پہلے تھیں، وہی اب بھی ہیں، لیکن اب خدا جانے کیا بات ہوگئی ہے، جو ان کی صحبت میں ایک گھڑی بیٹھا اس میں وہی رنگ آ گیا، جس میں زیادہ اتباع ہو وہی ولی کامل ہے۔

عزیزی مولوی عبداللہ حسنی ندوی

۱۳۷۷ھ ۱۹۵۷ء تا ۱۴۳۵ھ ۲۰۱۳ء

عزیز القدر مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی مرحوم حسنی خاندان کی اس شاخ سے تھے جو کئی پشتوں سے علم ودین کی خدمت کا امتیاز رکھتی رہی ہے، ان کے والد مولانا سید محمد الحسنی عربی اور اردو دونوں زبانوں کے ذریعہ صحیح اسلامی فکر کی صرف ترجمانی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی اشاعت اور اسلام مخالف فکر کا مقابلہ بھی مؤثر اسلوب میں کرتے تھے، وہ عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" اور ایک اردو پندرہ روزہ پرچہ "تعمیر حیات" کے بانی بھی تھے، انہوں نے عمر کم پائی، صرف ۴۴؍سال میں انتقال ہوا، لیکن اس کم عمری میں بڑا کارنامہ انجام دیا، انہوں نے اپنے چچا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی مفکرانہ اور داعیانہ جدوجہد کے طرز کو اختیار کیا تھا اور ان کے صحیح جانشین بننے کے لائق ہوگئے تھے، لیکن مقدر میں ان سے پہلے جانا تھا، وہ اپنی اس محدود عمر اور دائرۂ عمل میں جو کرسکتے تھے انہوں نے کیا، ان کے صاحبزادہ مولوی سید عبداللہ حسنی نے انہی کے راستے کو اختیار کیا، اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے والد کے چچا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے خصوصی استفادہ کیا، اور ان کی صحبت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور تزکیہ اور خدمت دعوت دونوں میں ان کے طریقہ کو اختیار کیا۔

حضرت مولاناؒ نے "پیام انسانیت" کے عنوان سے غیر مسلموں میں اسلام کے تعارف کا جو حکیمانہ طریقہ اختیار کیا تھا، اس کو انہوں نے ان کی وفات کے بعد آگے بڑھایا اور اس سلسلہ میں صرف بڑی خدمت ہی انجام نہیں دی، بلکہ تھوڑی مدت میں اچھے رفقاء

کارتیار کردیئے، جنہوں نے ملک کے مختلف حصوں میں کام کو پھیلانے میں ان کا ساتھ دیا اوراس کام کا انداز انہوں نے ایسا اختیار کیا کہ مذہبی دل آزاری سے بچتے ہوئے انسانی سطح پر اسلام کی محبوبیت پیدا ہو، اس کی وجہ سے ان کی کوششوں کا بہت فائدہ ہوااوراس کوفروغ ملا، اور یہ اندازِ کار وہی تھا جوان کو اپنے اسلاف سے ملا تھا، ان کے دادا مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ اوران کے بھائی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ دونوں دعوت کے اسی اصول کے قائل تھے، اور دونوں اس کام کو صرف علاقائی نہیں؛ بلکہ بین الملکی اور بین الاقوامی سطح پر کیا جانا پسند کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب مریضوں کے ازالہ کے لیے مرض کی کوششوں میں زیادہ وقت دیتے تھے، لیکن بھائی کو مذکورہ کام کی طرف متوجہ کرتے۔

چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے جو کام انجام دیئے ان میں ان کے بڑے بھائی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کے مشوروں اور رہنمائیوں کا بھی دخل تھا، ان دونوں کے والد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ ندوۃ العلماء کے ناظم رہے تھے اوراس کے ساتھ گوناگوں دینی وعلمی خصوصیات کے حامل تھے، تاریخ، ثقافت اور ادب کے ماہر تھے، ان سے اوپران کے والد مولانا سید فخر الدین خیالی جو مولوی سید عبداللہ حسنی کے دادا کے دادا تھے وہ بھی بڑے عالم دین تھے اور مرشد وربّانی شخصیت کے مالک تھے اوران کے والد مولانا سید عبدالعلی حسنیؒ امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ کے مرید وخلیفہ تھے، خاندان کے مشہور بزرگ اور تکیہ کلاں کے مورث خاندان حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ (جدامجد حضرت سید احمد شہیدؒ) سے ان کی خاندانی شاخ کا تعلق اس طرح بہت گہرا تھا کہ یہ لوگ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ (م۱۰۹۶ھ) کی صاحبزادی کی بھی اولاد میں ہیں جو سید عبدالرحیم شہید بن مولانا سید ہدایت اللہ حسنیؒ (برادر عم زادہ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ) کی زوجیت میں تھیں اوران کی نانیہالی شاخ میں بھی علم وعمل کی جامع شخصیات پیدا ہوئیں، جن میں مولانا سید محمد معین کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جو مولانا محمد ظاہر حسنی کے خلیفہ اور برگزیدہ شخصیات میں سے تھے، مولانا محمد ظاہر حسنی حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ کی نسل میں بڑی ربانی شخصیت گذرے ہیں،

انہیں حضرت سید احمد شہیدؒ سے نسبت حاصل تھی اور ان سے ان کے نواسے مولانا سید فخر الدین خیالیؒ نے تعلیم وتربیت پائی اور اجازت حاصل کی، اس طرح خاندان کی صفات و خصوصیات اور علمی و دینی امتیازات عزیز مرحوم کو مختلف جہتوں سے حاصل ہوئے اور ان بڑوں سے انکے چھوٹوں میں مولوی عبداللہ حسنی کو خاصی حد تک ان کے اثرات کا حصہ ملا۔

مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی میرے قریبی بھتیجے اور مزید تعلق کے حامل تھے، ان کی ابتدائی عمر کے ۲۰-۲۲ سال اپنے والد ماجد مولانا سید محمد الحسنیؒ کی سرپرستی میں گذرے، شروع کے چار سال میں اپنے دادا کی بھی شفقت ومحبت حاصل ہوئی، ان کی پیدائش ۲۹ رجنوری ۱۹۵۷ء کو ہوئی اور ان کے دادا ڈاکٹر صاحب مرحوم کی وفات ۱۹۶۱ء کو پیش آئی، ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کے انتقال کے بعد ان کی سرپرستی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی رہی اور ان کی تربیت ورہنمائی میں انہوں نے علمی و دینی ترقی کی، انہی کے کہنے سے ابتدائی عمر میں وہ سہارن پور جا کر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے بیعت ہو گئے تھے، لیکن اصلاح وتربیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی رہی اور آخر میں اپنی وفات سے کچھ روز پہلے اجازت وخلافت سے بھی سرفراز کیا اور اس خصوصیت سے بھی انہوں نے لوگوں کو فائدہ پہنچایا، خاص طور پر یہ بات رمضان میں زیادہ محسوس کی جاتی تھی، ان کے حدیث کے درس کے موقع پر جس میں وہ اپنے دادا مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کے والد مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کی کتاب " تهذيب الأخلاق "کو پیش نظر رکھتے تھے، ایسے سبق آموز واقعات اور دل پر اثر کرنے والی مثالوں کے ذریعہ سمجھاتے جس سے لوگوں میں عمل کا جذبہ پیدا ہوتا، خاص طور پر عقیدۂ توحید پر جمنے کا حوصلہ اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اضافہ ہوتا۔

عزیزی مولوی سید عبداللہ حسنی مرحوم اپنی نوعمری میں جن مراحل سے گذرے تھے، ان کے اثر سے ان میں عمل کی قوت اور احساس ذمہ داری آئی تھی، خاص طور پر جب ان کے والد ماجد محمد الحسنی کا سانحہ وفات پیش آیا، اس وقت ان کی عمر ۲۲ سال تھی اور ان کے

دونوں چھوٹے بھائی ان سے بھی چھوٹے اور ابتدائی تعلیم میں تھے، ان کے لیے فکرمندی اور صحیح راہ پر قائم رکھنے کی ذمہ داری بھی ان پر آپڑی تھی، اس ذمہ داری کو انہوں بہت اچھے طریقہ سے نبھایا، یہ ایک اہم خدمت تھی کہ انہوں نے صرف اپنے ہی کو بنانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اپنے چھوٹے بھائیوں کو بھی صاحب علم اور اسلامی فکر ودعوت کا حامل بنانے کی طرف توجہ رکھی جو کہ ماشاءاللہ مولوی حافظ سید عمار عبدالعلی حسنی ندوی اور مولوی سید بلال عبدالحی حسنی ندوی میں لوگ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، وہ دونوں دین کے صحیح راستے پر گامزن ہیں اور مولوی سید بلال عبدالحی حسنی ندوی جو تیسرے نمبر پر ہیں وہ دعوت اور تعلیم وتربیت کا بہت قابل قدر کام انجام دے رہے ہیں اور اب مولوی عبداللہ حسنی مرحوم کے وہ قائم مقام ہیں، اور وہ اس کے اہل ہیں۔

مولوی عبداللہ حسنی ندوی مرحوم کا امتیاز ان کی صرف دعوتی کوشش ہی کا نہیں ہے؛ بلکہ علمی وادبی لحاظ سے بھی وہ بڑا امتیاز رکھتے تھے، عربی تحریر اور مضمون نگاری میں ان کے دادا کے بھائی اور ان کے سرپرست حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو بین الاقوامی سطح پر جو امتیاز حاصل تھا، اور ان کے بھتیجے سید محمد الحسنیؒ نے اس کو اپنا لیا تھا اور بہت مؤثر مضمون اور تحریریں عربی واردو میں لکھنے لگے تھے، اس کا اثر بھی مولوی عبداللہ حسنی کے قلم میں آیا تھا، جو عربی پندرہ روزہ اخبار ''الرائد'' کے ان کے اداریوں میں محسوس کیا جاتا تھا، اس کے علاوہ دارالعلوم میں ان کو استاذ کا منصب حاصل ہوا، اور اس میں ۳۵ سالہ خدمات انجام دیں، حدیث کی متعدد کتابیں زیادہ تر ان کے زیر تدریس رہیں، اور اس میں سنن ترمذی اور صحیح بخاری کے بعض ابواب کی تدریس کا انہیں زیادہ موقع ملا، عالیت کے آخری سال میں تفسیر قرآن کریم کا درس بھی ان کے ذمہ ہوگیا تھا، اور ادھر دو تین سال سے حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اسرار شریعت پر معرکہ آرا تصنیف '' حجة الله البالغة'' کا درس دینے کا بھی موقع ملا، اور طلبہ کو ان سے بڑا نفع پہونچ رہا تھا، خود انہوں نے بھی بڑا نفع محسوس کیا، علوم شریعت سے اشتغال کا اثر اخلاق واعمال میں، احکام شریعت پر عمل ان میں سنت نبوی

کی پیروی، اور صلاح وتقوی کے طور پر آیا۔

اس کے علاوہ عوام کی اصلاح وتربیت اور ہدایت خلق کے لیے انہوں نے اپنے اوقات فارغ کیے تھے جس میں وہ تقریر وخطابت کے لیے پروگراموں میں جاتے، اور مجلس کے ذریعہ بھی دعوت کا کام کرتے، اس کے علاوہ ملاقاتوں کے ذریعہ بھی رابطہ قائم کر کے دین کی طرف دعوت دینے کی کوشش کرتے، اور اس کے لیے انہوں نے ملک کے مختلف حصوں کے دورے بھی کیے اور ان دوروں کے ذریعہ اسلام کے تعارف اور پیام انسانیت کے کام کو فروغ دیا اور اس میں وہ اتنا منہمک ہو جاتے تھے کہ صحت وغیرہ کا بھی خیال زیادہ نہ رکھ سکتے۔

ادھر چند مہینوں سے ان کو جو بیماری لاحق ہوئی تھی، شروع میں اس کی طرف بھی توجہ نہیں ہو پائی اور دین ودعوت کے کام ہی کی طرف زیادہ توجہ رہی، بیماری بڑھتی گئی، آخر کار وہ صاحب فراش ہو گئے، علاج ومعالجہ کی جو کوشش ہونی چاہیے، اس میں کوئی کمی نہیں کی گئی، لیکن موت وحیات کا جو وقت اللہ کے یہاں مقدر ہے، اس سے آگے پیچھے نہیں ہو سکتا، چاہے بیماری ہو یا نہ ہو، چنانچہ وہ ۵۶ سال کی عمر میں ۱۷/ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ مطابق ۳۰/جنوری ۲۰۱۳ء کو لکھنؤ میں ''سحر نرسنگ ہوم'' میں وفات پا گئے۔

وہ آخر وقت تک تکلیف کی شدت کے باوجود نماز باجماعت کا بڑا اہتمام کرتے رہے اور آخری نماز بھی جماعت سے ادا کی، اور ذکر اللہ کی طرف مسلسل راغب رہے، انہوں نے انتقال سے ایک مہینہ قبل یہ خوشی بھی دیکھی کہ ان کے فرزند نور چشم محمد میاں سلمہ نے حفظ قرآن کریم کی تکمیل کی اور اس مناسبت سے ایک مختصر سی تقریب بھی انہوں نے کر کے خوشی کا اظہار کیا اور اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

عزیز مرحوم کے انتقال پر جس کی خبر اسی وقت دور دور پہونچ گئی تھی، اہل تعلق کے مسلسل فون آنے شروع ہو گئے تھے، جنازہ میں شرکاء کی تعداد لکھنؤ ورائے بریلی دونوں جگہ اتنی دیکھی گئی جو کم موقعوں پر دیکھنے میں آتی ہے، اور بعد میں تعزیت میں آنے والوں کے

تعلق ومحبت اور تعزیتی پیغامات اور خطوط جو بڑے جذبات وعقیدت سے لکھے گئے ہیں ان سے ان کی محبوبیت ومقبولیت کا پتہ چلتا ہے اور اہل تعلق میں سے جو حرم اور جوار حرم میں تھے انہوں نے ان کی طرف سے طواف وعمرہ اور دوسرے ایصال ثواب کے ذرائع اختیار کر کے اپنے تعلق وعقیدت کا اظہار کیا۔

عزیز مرحوم نے ۵۶ سال کی عمر پائی اور اس میں ان کو اپنے پردادا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء سے مناسبت رہی کہ انہوں نے بھی تقریباً اسی عمر میں دنیا سے رحلت کی تھی، وہ اپنے محبین اور قدردانوں کو رنجیدہ چھوڑ گئے، مولوی عبداللہ حسنی نے تزکیہ ودعوت کو مشن کے طور پر اختیار کیا، اس لیے ان کی وفات کا اثر ملک اور بیرون ملک میں محسوس کیا گیا اور ملک وبیرون کے دعوتی ذہن رکھنے والوں نے خاص طور پر اپنے رنج وغم کا اظہار کیا، اس طرح وہ داعیانہ عمل کی سوغات لے کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوئے۔عزیزی مولوی عبداللہ حسنی ندوی کے ایک ہی صاحب زادہ ہیں، جو ابھی اپنی ابتدائی عمر میں ہیں، امید ہے کہ ان کو اپنے والد مرحوم کی نیکیوں کی برکت کا حصہ ملے گا اور ان کے دونوں چچا اور ان کے نانا (مولانا رابع صاحب خود ہیں) کی محبتوں سے ترقی اور خیر حاصل ہوگی جو اللہ تعالی کے فضل ورحمت کا حصہ ہوگا۔

مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۵۴ھ ۱۹۳۵ء تا ۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹ء

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحبؒ جو ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے والد ماجد تھے، اپنی سنجیدہ اور عملی زندگی کے طرز میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے اور انہوں نے اپنے والد اور دادا سے علمی و دینی مزاج ورثہ میں پایا تھا، ان کے والد مولانا حکیم سید فخر الدین حسنیؒ ایک بزرگ شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی کے موضوع پر اور اپنے ادبی ذوق کے لحاظ سے اپنے ہمسروں میں ممتاز تھے، ان کی نگرانی میں مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی، اور وسعت ذہنی کی بنیاد پر انہوں نے اپنے عہد کے کبار علماء سے فیض اٹھایا تھا، اور پیشہ کے لحاظ سے طب کو اختیار کیا تھا، اس طرح ان کی زندگی میں ان کے تین پہلو نمایاں ہوئے تھے، ایک تو تاریخ نویسی اور ادبی ذوق کا محتاط مزاج، دوسرے دینی خصوصیات میں بزرگانہ صفات اور تیسرے طب میں تشخیص و علاج میں امتیاز، ان تینوں پہلوؤں کو انہوں نے جمع کیا تھا، اور مزاج میں سنجیدگی، ہمدردی اور نرم خوئی تھی، اس کے سبب ان کو اپنے ہمسر علماء میں اعتماد حاصل ہوا، اور امت کے عملی وانتظامی معاملات میں بھی ان کو اہمیت دی گئی، اور انہوں نے اس اہمیت کا حق بھی ادا کیا۔

ندوۃ العلماء کی تحریک ان کے شباب کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی، اور ملک کے اس وقت کے مقتدر علماء اور ملت کے خیر خواہان نے ندوۃ العلماء کی تعلیمی تحریک کو پسند کیا اور تائید کی، اس کو عمل میں لانے کے سلسلہ میں کوشش شروع ہوئی، اس میں مولانا سید عبدالحی

صاحب کو بھی نمایاں حصہ ملا، اور وہ اس ادارہ کے مددگار ناظم اور پھر ناظم منتخب ہوئے۔

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ نے اپنے متوازن اور معتدل مزاج اور طریقۂ کار کے مطابق اپنے خاندانی تعلق والوں کی اصلاح وتربیت کے معاملہ میں بھی جو بہتر رویہ ہوسکتا ہے، وہ اختیار کیا، اور اولاد کے سلسلہ میں دین ودنیا کی جامعیت کا خصوصی رجحان پیدا کیا، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے اخلاف میں ایک طرف تو ادب کا ستھرا ذوق قائم ہوا اور دوسری طرف تاریخی مطالعہ اور شریعت کی پابندی کا پختہ مزاج بنا، ان کو ادب، تاریخ اور حدیث کے موضوعات سے بڑا اشتغال تھا، چنانچہ ان کی تصنیفات میں ان تینوں دائروں کے لحاظ سے ان کی خصوصیت ظاہر ہوئی، توازن اور دینی پختگی کا مزاج عملی شکل میں ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کے یہاں پوری طرح ظاہر ہوا، انہوں نے علوم دینیہ کے حصول میں ان کے عہد میں جو بہتر سے بہتر نظام تھا، اس سے فائدہ اٹھایا، اور ان کو دینی علوم میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے شرف تلمذ بھی حاصل ہوا تھا، اور اس سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا، پھر طب وحکمت کی لائن میں جس کو اختیار کرنا اس زمانہ کے علماء کا عام طریقہ تھا، اپنے کو انہوں نے بڑھایا اور طب جدید (ایلو پیتھک) کو بھی اختیار کیا، اور اس کی اعلیٰ ڈگری یونیورسٹی سے حاصل کی۔

ان کی خصوصیت یہ رہی کہ میڈیکل لائن میں یونیورسٹی کے زمانہ طالب علمی میں علماء ہی کے لباس اور وضع قطع میں اور نمازوں کی پوری پابندی کے ساتھ وقت گزارا، جو اس ماحول میں ایک بڑے تعجب کی بات سمجھی جاتی تھی، نصف ساق تک پائجامہ اور نری کا جوتا استعمال کیا، اور اس پر تاحیات قائم رہے، جدید صفت کا جوتا انہوں نے کبھی استعمال نہیں کیا، طبیعت میں متانت، کم گوئی اور دینی تعلیمات کی پابندی ان کی سیرت کا نمایاں پہلو تھا۔

مولانا عبدالباری ندویؒ جو حضرت تھانویؒ کے خلیفہ بھی تھے اور حضرت تھانویؒ کے طریقۂ تربیت اور اصول زندگی کے سخت داعی اور پابند تھے، اور ریٹائرڈ ہونے کے بعد حیدرآباد سے لکھنؤ واپس آکر لکھنؤ میں مقیم ہوگئے تھے، اور ایک ہی شہر میں ہونے کے تعلق

سے ڈاکٹر صاحبؒ سے ان کا ربط وضبط ہو گیا تھا، وہ ڈاکٹر صاحب کو انسانوں میں ''فرشتہ'' قرار دیتے تھے اوران کی خوبیوں کے بہت زیادہ قائل تھے۔

ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے چھوٹے بھائی کے سلسلہ میں تربیت کا اپنا وہی مخصوص طریقہ اختیار کیا، ان کے یہ بھائی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ تھے جوان سے ۲۱ سال چھوٹے تھے، اوراس فرق کی بنا پر والد کے انتقال کے بعدان کے لیے والد کی جگہ پر تھے، ڈاکٹر صاحب نے ان کی بڑی فکر رکھی، اور دوسری طرف مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ کی والدہ بڑی بزرگ اور دین کے معاملہ میں سخت رویہ رکھنے والی تھیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کوان دونوں کی تربیت ملی جس کے اثرات بعد میں مولانا علی میاںؒ کی زندگی میں ان کے حالات سے واقفیت رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں۔

مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کی اولاد میں شروع میں ایک بیٹا پیدا ہوا تھا، جس کا انتقال بچپنے میں ہی ہو گیا تھا، اس کے بعد پندرہ بیس سال تک ان کی اولاد میں صاحبزادیاں پیدا ہوئیں جن کو انہوں نے گھر کے دائرہ میں تعلیم دی اور پھر پندرہ سولہ سال کے بعدان کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کی برکت کے حصول کے لیے ''محمد'' رکھا۔ان کی تربیت اور تعلیم میں بھی انہوں نے اپنا ہی طریقہ اختیار کیا، اور رواجی رسمی طریقوں کو نہیں اپنایا، اس طریقہ سے وہ اپنے والد کے تربیتی قالب میں ڈھلے اور بڑھے، اوران میں بھی متانت، علم سے اشتغال، ادبی ذوق اور دینی فکر وخیال کی بہتر صفات پیدا ہوئیں۔

ڈاکٹر صاحبؒ نے ان کو کہیں امتحان نہیں دلوایا، اور نہ ہی کسی اسکول وکالج میں داخلہ دلا کر دنیاوی معیشت کی لائن ڈاکٹر یا انجینئر یا اسی طرح کے دوسرے کام کے لیے تیار کیا، بلکہ دین اور وقت کے تقاضے کے لحاظ سے جو علمی وادبی صلاحیت ضروری سمجھی صرف اسی پر اکتفا کیا، علوم دینیہ اور ادب عربی کی صلاحیت پیدا کرنے اوراس کو بہتر بنانے کے لیے جن تدابیر کی ضرورت تھی ان کو اختیار کیا، چنانچہ اس تربیت کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ وہ

ایمان کے تقاضوں کو سمجھنے والے اور امت کو درپیش مسائل اور معاملات کی سمجھ رکھنے والے، اور اپنی ادبی وتحریری صلاحیتوں سے امت کی تقویت اور اس کو خطرات سے بچانے کے لیے جوان کی صلاحیت میں تھا وہ کرتے رہے، وہ اپنے چچا مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خصوصیات وطریقۂ دعوت سے متاثر تھے، اوران ہی کی راہ کو اپنانے کی کوشش کی، اوران ہی کے طرز پر کام کیا، اوران کے کام میں شرکت کی۔

انہوں نے ندوۃ العلماء سے خصوصی فائدہ اٹھایا، اور پھر باصلاحیت بننے پر ندوۃ العلماء کو بھی اپنی صلاحیتوں سے فائدہ پہونچایا، لیکن مدت حیات جس کی بھی ہو، اللہ تعالیٰ کے یہاں سے پہلے ہی سے مقدر ہوتی ہے، جس کی مصلحتیں خالق کون ومکان ہی کو معلوم ہوتی ہیں، محمد میاں حسنیؒ کی عمر کم ہوئی، انہوں نے ۱۹۷۹ء کے وسط میں انتقال کیا جب کہ ان کی عمر کے صرف ۴۴ سال گذرے تھے، جس میں انہوں نے جو کام انجام دیئے وہ اس عمر سے زیادہ کے تھے، ان کے کام اور طریقۂ کار اور افادیت کو دیکھتے ہوئے ان کے انتقال کو بڑا خسارہ سمجھا گیا اور خاص طور پر ان کے چچا مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمتہ اللہ علیہ نے ان کو جانشیں ہونے کا خیال کیا تھا، اور وہ ان کے بڑے اچھے نائب بلکہ ہم مزاج تھے، بہت صدمہ محسوس کیا، وہ خاندان میں بھی بہت مقبول تھے، اس طرح سب نے ہی ان کی وفات کو بڑا نقصان محسوس کیا۔

مرحوم نے اپنے پیچھے تین صاحبزادے چھوڑے جنہوں نے اپنے والد ہی کے نقش قدم پر اپنے کو آگے بڑھایا اور اپنے کو علمی ودعوتی کام کے ساتھ وابستہ کیا، اور اس سلسلہ کی اپنی صلاحیتوں کو ترقی دی، اور اس طرح دین وامت کی نصرت کو مقصد عمل بنا کر کام کر رہے ہیں، جوان کے والد رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے آتے تو ان کو بڑی مسرت ہوتی اور امت کی تقویت کی جوان کی فکر تھی، اور اس کے لیے وہ جو کوشش کرتے تھے، اس کے عین مطابق محسوس کر کے بہت انشراح محسوس کرتے، ان کے یہ صاحب زادگان جن میں بڑے عزیزی مولوی سید عبداللہ محمد حسنی ندوی، پھر عزیزی مولوی حافظ عمار محمد عبدالعلی حسنی اور عزیزی مولوی

سید بلال عبدالحی حسنی ندوی ہیں، دینی ،فکری اور دعوتی مقاصد کی انجام دہی میں اچھے طریقہ پر خدمت انجام دے رہے ہیں۔

ان میں مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے دعوتی مقصد میں زیادہ مشغولیت اختیار کی ،اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حدیث کی تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے رہے،لیکن ان کی زندگی بھی مختصر رہی ،اور وہ ۵۴ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے ، ان کی جگہ اب مولوی سید بلال عبدالحی حسنی فکری اور علمی کاموں کو آگے بڑھانے میں اپنی صلاحیت صرف کررہے ہیں، اور ضیاء العلوم رائے بریلی میں حدیث شریف کی تدریس کا کام بھی کررہے ہیں، انہوں نے رائے بریلی کے قیام کے تعلق سے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے آخری دور میں ان سے بہت زیادہ وابستہ رہنے کا التزام کیا اور پھر ان کی وفات کے بعد ان ہی کے رجحانات کو تقویت پہونچانے اور ان کی اشاعت کی طرف خصوصی توجہ دے رہے ہیں، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر ایک تربیتی سینٹر بھی قائم کیا ہے جس سے مدارس کے فارغین کو فائدہ پہونچ رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کو قبول فرمائے اور کوششوں کو مفید سے مفید تر بنائے۔

درمیانی بھائی مولوی حافظ عمار محمد عبدالعلی بھی دینی و تعلیمی کام انجام دے رہے ہیں، لکھنو میں ندوۃ العلماء کی شاخ مدرسہ مظہر الاسلام بلوچ پورہ میں استاد اور ناظر و منتظم ہیں، بارك الله فيهم ووفقهم لمايحب ويرضى۔

مولانا سید محمد الحسنی علیہ الرحمۃ نے اپنی مختصر عمر میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، ان سے طالبان علم اور مدارس کے کارگزار حضرات اور دعوت و تعلیم کے کام سے وابستہ لوگ اچھا سبق حاصل کرسکتے ہیں، اس لیے ضرورت تھی کہ ان کی سوانح حیات ان کے کسی واقف کار کے قلم سے اشاعت پذیر ہوجاتی، خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کے پھوپھی زاد بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنی ان سے ۱۰ سال بڑے تھے ، اور اسی ماحول کے تربیت یافتہ تھے، اور اچھے صاحب علم، داعی و مصلح ہونے کے ساتھ اچھے سوانح نگار تھے، ان

کی وفات سے خاصے ملول ومتاثر ہوئے اوراسی تاثر کے نتیجہ میں خود سے ان کی سوانح نویسی کے کام کوانجام دینے لگے۔

مصنف سوانح صاحب سوانح سے ایک گھر میں سے ہونے کا تعلق رکھتے تھے، چنانچہ ان کے حالات سے جوزیادہ سے زیادہ واقفیت ہوسکتی ہے، ان کو حاصل تھی، اور ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کے ساتھ شفقت بھی رکھتے تھے، اوران سے مشورہ لیتے اوران کومشورہ دیتے بھی تھے، عمر میں دس سال کا فرق تھا، اور عجیب بات یہ ہے کہ ان کی عمر بھی زیادہ نہ ہوسکی، ان کے انتقال سے صرف ڈھائی سال بعدان کا بھی انتقال ہوگیا لیکن انہوں نے جو علمی وادبی کام کیا تھا، وہ ان کے قائم مقام کے طور پر استفادہ کے لیے موجود ہے۔

برادرعزیز سید مصباح النبی حسنیؒ

۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء تا ۱۴۳۳ھ ۲۰۱۲ء

برادرعزیز سید مصباح النبی حسنی، خانوادہ علم اللہی کے باصلاحیت اور خاندانی وصف کے حامل شخصیت تھے، وہ خاندانی رشتہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے قریبی بھانجے اور بھتیجے اوران کی اہلیہ مرحومہ کے تو حقیقی بھتیجے تھے، میری والدہ اور والد کے حقیقی ماموزاد بھائی کے بڑے صاحبزادے ہونے کی بناء پر میرے قریبی بھائی ہوتے تھے۔

موصوف نے ۷۶ سال کی عمر پائی، دینی تعلیم کے علاوہ عصری علوم میں بھی کمال رکھتے تھے، لکھنؤ یونیورسٹی سے وکالت کی ڈگری حاصل کی، کچھ دنوں سیلس ٹیکس ڈپارٹمنٹ میں وکالت بھی کی، لیکن اس پیشہ سے طبعی مناسبت نہ ہونے کی بنا پر اس کو ترک کردیا، اور انڈین ایمبیسی میں اپنی خدمات پیش کیں، اس سلسلہ میں تقریباً ۴۰ سال جدہ میں مقیم رہے، سابق نائب صدر جناب حامد انصاری صاحب ان دنوں جدہ میں انڈین کونسلیٹ میں فرسٹ سکریٹری تھے، موصوف نے ایک مدت تک ان کی معیت میں بھی کام کیا، اس دوران نائب صدر صاحب سے ان کے قریبی مراسم بھی رہے، حج کے دنوں میں موصوف اپنے آپ کو حاجیوں کی خدمت کے لیے وقف کردیتے تھے اور ہر طرح سے ان کی سہولیات کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

تقریباً چھ سال قبل ہندوستان واپس آگئے تھے اور اپنے آبائی وطن تکیہ کلاں میں ہی مقیم رہے۔ ۱۹۶۷ء میں جب حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری نے حج کا سفر کیا اور یہ سفر بحری راستہ سے تھا، جدہ پہنچنے سے پہلے ان کا جہاز پر انتقال ہوگیا تو اس وقت بھی عزیز موصوف نے اس خدمت میں حصہ لیا تھا کہ ان کی مکہ مکرمہ میں تدفین کو آسان بنایا

جاسکے، لیکن بروقت جہاز پر اطلاع نہ پہنچنے کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوسکا۔

موصوف عمر میں مجھ سے سات سال چھوٹے تھے لیکن قریبی تعلق کی بنا پر بچپنے سے ہی گھریلو میل جول رہا اور بے تکلفی رہی، انہوں نے اپنے عہد کے رجحان کے مطابق جو کہ آزادی سے قبل کا عہد تھا، جدید تعلیم حاصل کی لیکن خاندانی ماحول کے مطابق دینداری اور دینی رجحان کے حامل رہے، دینی تعلیم انہوں نے مدرسہ کی راہ سے حاصل نہیں کی لیکن اپنے معاصر رفقاء جو دینی تعلیم حاصل کررہے تھے اور خاندان کے دینی حضرات سے ربط وتعلق کی بنا پر ضروری معلومات کے حامل بنے اور بعد میں جدہ کے قیام میں معلومات میں خاصا اضافہ بھی ہوگیا تھا۔ وہ طبیعت کے لحاظ سے قناعت پسند اور محتاط طرز زندگی رکھتے تھے، تعلیم کی تکمیل کے بعد اسی تعلیم کے مطابق معاشی راہ اختیار کی، اس راہ میں اپنی ذمہ داریوں کے تئیں بہت ہی حساس اور وقت کے سختی سے پابند تھے۔

اہل خانہ نے بتلایا کہ موصوف نے تقریباً چالیس سال ملازمت کی لیکن اس دوران نہ کبھی ناغہ کیا اور نہ کبھی تاخیر ہوئی، دنیا کی محبت سے بے نیاز تھے، کمانے کے سلسلہ میں صرف ضرورت کی حد تک توجہ رکھتے رہے اور جو کچھ کماتے اس سے اپنے والدین اور اہل قرابت کے حقوق کو ادا کرتے اور پریشان حال وضرورت مندوں پر خرچ کرتے تھے۔ آپ کی شرافت نفسی، وفاشعاری اور امانت داری کو آپ کے رفقاء آج بھی یاد کرتے ہیں اور آپ کی مثال دیتے ہیں۔

مرحوم کے والد ماجد سید سراج النبی حسنی اور دادا سید احمد سعید حسنی دیندار اور محتاط زندگی رکھنے والی شخصیت تھے اور ان کے والد سید شاہ ضیاء النبی حسنی تو اپنے عہد کے بزرگوں میں تھے، ان کی خصوصیات ان کے وارثین اور ان کی اولاد میں آئی تھی، انگریزی حکومت کے اثرات کی بنا پر سید سراج النبی حسنی نے جدید تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور وہاں ملازمت بھی مل گئی تھی لیکن چند برس وہاں رہنے کے بعد وہاں کے غیر دینی ماحول سے گھبرا کر ہندوستان واپس آگئے اور وطن ہی میں تجارت اور بعض دوسرے معاشی ذرائع اختیار کیے اور دینی رنگ بھی زندگی میں بڑھتا چلا گیا، وہ تقویٰ ودینداری میں بڑھے ہوئے اور نماز وقرآن مجید کا بڑا اثر لینے والے تھے، خاندانی جائیداد کا

نظم دیکھتے تھے اور اس کی آمدنی کے استعمال میں مشترک مال سمجھتے ہوئے بڑے محتاط تھے، ان کی خصوصیات برادر مرحوم میں بھی منتقل ہوئی تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو انگریزی زبان میں خاصا ملکہ عطا فرمایا تھا، ہندوستان واپس آنے کے بعد ''دار عرفات'' سے وابستہ ہوگئے جس کے آپ بنیادی رکن بھی تھے، اس دران مرکز الامام أبی الحسن الندوی کے انگریزی ترجمان Arafat Voice کا انگریزی ترجمہ بھی کرتے رہے، دار عرفات کے رفقاء و باحثین کو انگریزی کی تعلیم بھی دیتے، متعدد کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا جن میں سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اہم کتاب ''اسلام کے تین بنیادی عقائد'' مولانا محمد الحسنیؒ کی ''قرآن آپ سے مخاطب ہے'' اور مولوی بلال عبدالحی حسنی ندوی کی ''حدیث کی روشنی'' خاص کر قابل ذکر ہیں۔

مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے دل درد مند سے نوازا تھا، مسلمانوں کے دینی و ملی مسائل سے جذباتی طور پر جڑے رہتے تھے۔ مسلمانوں کے حالات سن کر طبیعت بے چین ہوجاتی تھی، کسی مجلس میں جب اس موضوع پر گفتگو ہوتی تو طبیعت کا رنگ بدل جاتا اور ان کے دل کی کیفیات اور ملی مسائل پر ان کا فکر واضطراب نمایاں ہوجاتا، نہایت ملنسار، خوش مزاج اور پُر وقار شخصیت کے حامل تھے۔ ہندوستان واپس آجانے کے بعد یہیں رہنے لگے تھے، صحت خاصی کمزور ہوگئی تھی، تین روز قبل شہر کے اسپتال میں داخل کرائے گئے تھے، ڈاکٹروں کی توجہ اور رشتہ داروں کی تیمارداری کے باعث خاصی امیدیں تھیں، ساری رپورٹیں بھی مثبت تھیں لیکن خدا کی مرضی کے سامنے انسان کی ساری تدبیریں ناکام ہوجاتی ہیں، ۱۳/نومبر کی ابتدائی شب میں انہوں نے زندگی کی آخری سانسیں لیں اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، نماز جنازہ ظہر بعد تکیہ پر ہوئی، اور اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے، جہاں ان کے والد والدہ اور خاندان کے معروف صاحب دل وصاحب عرفان شخصیت حضرت شاہ ضیاء النبی حسنی مدفون ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے، اور جنت میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ آمین۔